بے افسانہ
مرزا اطہر بیگ

بے افسانہ

مرزا اطہر بیگ

سانجھ

نبیلہ کے نام

بے افسانہ۔۔۔افسانے۔۔۔مرزا اطہر بیگ

سانجھ پبلیکیشنز نے شرکت پرنٹنگ پریس لاہور' سے چھپوا کر'
46/2 مزنگ روڈ' لاہور' پاکستان' سے شائع کی۔

اشاعت دوم : 2013
سر ورق : مرزا باسم بیگ
قیمت : 400
تعداد : 500

Bay Afsana
(Urdu Short Stories by Mirza Athar Baig)

Printed by:
Shirkat Printing Press, Lahore.

Price:
In Pakistan: Rs. 400.00

Published by:
سانجھ
SANJH PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com

ISBN: 978-969-8957-44-5

فہرست

''کیا گھوڑے پر ظلم ہو رہا ہے؟''

بعض اوقات عجیب باتیں یاد آجاتی ہیں۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب محکمہ انسداد بے رحمی حیوانات کے نام سے ایک محکمہ ہوا کرتا تھا۔ یہ محکمہ غالباً آج کل بھی موجود ہے مگر اُن دنوں آپ کو کہیں چلتے چلتے کسی سڑک سے گزرتے اچانک اس کی موجودگی کا احساس ہو جایا کرتا تھا اور اس موجودگی کا احساس دلانے والے عموماً دو سائیکل سوار اہلکار ہوا کرتے تھے۔ ممکن ہے یہ اکیلے اکیلے بھی ڈیوٹی پر نکلتے ہوں مگر میں نے انہیں ہمیشہ ملیشیے کی شلوار قمیض اور خاکی ٹوپی پہنے دو دو کی شکل میں ہی دیکھا۔ سڑک کی انتہائی بائیں جانب آگے پیچھے یا کبھی ساتھ ساتھ سست رفتار سے سائیکل چلاتے ان کارندوں کو دیکھ کر جنہیں عام زبان میں 'بے رحمی والے' کہا جاتا تھا میرے دل میں یا شاید دماغ میں ایک ہی خیال پیدا ہوتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حیوانات پر ظلم برداشت نہیں کر سکتے۔

عجیب باتیں یاد آتی ہیں اور عجیب طرح سے یاد آتی ہیں۔ اب وہ دن جو مجھے یاد آ رہا ہے گرم تھا یا سرد؟ میرے لئے یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے مگر یقیناً وہ بہت زیادہ گرم یا بہت زیادہ سرد دن نہیں تھا۔ ورنہ اپنی ایسی ہی کسی حرارتی شدت کے حوالے سے مجھے یاد آتا۔ بہرحال وہ ایک درمیانہ سا دن تھا۔ مگر ایک اعتبار سے وہ ایک درمیانہ سا دن نہیں بھی تھا اور اسی اعتبار سے وہ دن مجھے خوب یاد آتا ہے۔ اور یہ یاد فوری طور پر میرے اندر سڑکوں پر گرد اڑاتے جھکڑ کی صورت ظاہر ہوتی ہے۔ فرض کریں کہ کسی صبح آپ بیدار ہونے کے بعد جونہی آسمان کے نیچے آئیں تو آپ کو احساس ہو کہ پوری دنیا مہین غلاظت کے تہہ در تہہ امکانات

سے بھری پڑی ہے اور اگر آپ کوئی سانس لیتی مخلوق ہیں تو اُس کمینی سی گھٹن سے آپ کے لئے کم از کم کوئی فوری نجات نہیں۔ اگر آپ یہ سب کچھ فرض کرنے میں کامیاب ہیں تو پھر آپ اُس دن کے احساس کے کافی قریب ہیں۔

تو وہ ایک ایسا ہی دن تھا۔ دیگر دنوں کے معمول کے مطابق میں کالج کے لئے روانہ ہوا تھا۔ مگر روانگی کے بعد کالج پہنچنے تک کا درمیانی وقفہ کسی بھی طرح معمول کے مطابق نہیں تھا۔ بیس پچیس منٹ کے اُس پیدل سفر میں جو چند بڑی اور چند چھوٹی سڑکوں اور کچھ گلیوں پر پھیلا ہوا تھا انوکھے حیرت ناک واقعات کبھی جنم نہیں لیتے تھے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ جس واقعہ کا ذکر میں کرنے جا رہا ہوں وہ بھی کسی کے لئے انوکھا اور حیرت ناک ہوگا۔ مگر مجھے یاد ہے کہ میرے لئے وہ بیس پچیس منٹ تحیر انگیز ضرور تھے۔ مگر کس لئے۔۔۔۔۔۔ ہاں یاد آیا۔۔۔۔۔۔ دراصل پہلی دفعہ۔ زندگی میں پہلی دفعہ۔ ایک سوال بڑے واضح لفظوں میں میرے ذہن میں آیا تھا اور وہ سوال تھا۔ ظلم کیا ہے؟ بالکل ایسے ہی جیسے طالب علموں سے پوچھا جاتا ہے، خطِ استوا کیا ہے؟ جمہوریت کیا ہے؟ کششِ ثقل کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں ایک بڑی سڑک پار کر کے چھوٹی سڑک پر آنے کو تھا کہ جھکڑ کا ایک فراٹا میرے بالوں میں خاک، چہرے کی جلد پر ریتلی سرسراہٹ اور ذہن میں ایک پہلی سی ''خود ذلتی'' کا احساس اتار گیا اور اسی لمحے میں نے ان دونوں بے رحمی والوں کو دیکھا جو چھوٹی سڑک پر کُھلتے ایک کافی کُھلے بازار میں گھس رہے تھے۔ وہ بازار میرے راستے میں بھی پڑتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں جب کچھ آگے بڑھا تو وہ دونوں اس ٹانگے والے کو روکے کھڑے تھے جس کا نام، جیسا کہ بعد میں پتہ چلا تھا، مولا بخش تھا۔ میرے قدم وہیں رک گئے۔ دراصل میں نے آج تک بے رحمی والوں کو واقعتاً اپنی ڈیوٹی ادا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ قدم روکنے کا محرک وہی سوال تھا جس کے بارے میں میں نے آج تک نہیں سوچا تھا۔

اردگرد کچھ دکانیں کھل رہی تھیں۔ مگر دکاندار صبح کی صفائی بھول کے سامنے تھڑوں پر آن موجود ہوئے تھے۔ کچھ راہ گیر بھی رک رہے تھے۔ مجھے یاد ہے اُس وقت میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ جہاں کبھی بھی کچھ نہ ہوتا ہو وہاں اگر ذرا سی بھی بھنک پڑے کہ اِدھر کچھ ہو رہا ہے تو لوگوں کے قدم وہیں رک جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ عجیب باتیں یاد آ جاتی ہیں اور عجیب طرح

سے یاد آتی ہیں۔

بے رحمی والوں نے اپنے سائیکل بڑی احتیاط سے دکانوں کے تھڑوں کے ساتھ اسٹینڈ پر کھڑے کیے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا تھا تو نیچے گندی نالیوں میں جھکڑ کے اڑائے ہوئے گندے اخباروں کے پُرزے اور طرح طرح کی دھجیاں سلیٹی رنگ کے پانی میں بہتی جا رہی تھیں۔ پھر میں نے سوچا کہ مجھے اصل معاملے پر توجہ دینی چاہیے۔ غلیظ پانی میں تیرتی چیزیں کوئی اہم مسئلہ نہیں ہیں چنانچہ میں نے مولا بخش کو غور سے دیکھا۔ وہ ایک بہت ہی نحیف ونزار بوڑھا تھا مگر جو حقیقت فوری طور پر واضح ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ اس کا گھوڑا اُس سے بھی کہیں زیادہ نحیف ونزار اور بوڑھا تھا۔ بے رحمی والوں میں سے ایک مولا بخش کو فردِ جرم سُنا رہا تھا۔ ''جانور پر بے رحمی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔۔ گھوڑے پر ظلم ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔'' جبکہ دوسرا آگے گھوڑے کے منہ میں پڑی ہوئی لگام کو دبوچے ہوئے تھا۔ گھوڑے کی باچھوں میں سے دونوں طرف سفید رنگ کا جھاگ باہر کو نکل رہا تھا جس میں ہلکے سبز رنگ کی آمیزش تھی۔ مولا بخش گھوڑے پر ظلم کے الزام کی صحت سے سراسر انکاری تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ گھوڑا اُس سے زیادہ تگڑا ہے۔ خود اسے کچھ کھانے کو ملے نہ ملے، گھوڑے کو لازماً کچھ نہ کچھ کھانے کو دیتا ہے۔ جھکڑ کا ایک فراٹا پھر آیا تو میں نے اس پر قطعاً کوئی توجہ نہ دی مگر پھر اچانک میں نے دیکھا کہ گھوڑے کی اخروٹ جتنی بڑی آنکھ زور سے پھڑک اٹھی اور اس نے لگام پکڑنے والے بے رحمی والے کے ہاتھ کو جھنجھوڑ ڈالا۔ غالباً گھوڑے کی اسی حرکت نے بے رحمی والے کی توجہ گھوڑے کی آنکھوں پر مرکوز کی اور اس نے شور مچا دیا۔

''اوئے تو نے، تو نے تو اِس کو کھوپے بھی نہیں پہنائے ہوئے۔ ننگی آنکھوں والا گھوڑا دوڑاتا پھرتا ہے''۔ مولا بخش کا چہرہ اتر گیا یعنی جتنا کہ مزید اتر سکتا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اِس کوتاہی پر اُسے کوئی معافی نہیں ملے گی۔ تاہم اس نے پھر بھی بتایا کہ کھوپے مرمت کیلئے دیئے ہیں وغیرہ۔

''گھوڑا کانجی ہاؤس جائے گا۔ تم لوگوں کو کوئی حیا کوئی شرم ہی نہیں۔ بے زبان جانور ہے۔ ذرا سوچو تمہیں اِدھر آگے جوتا ہو تو۔ بے شرم۔۔۔۔۔۔'' مولا بخش ہاتھ جوڑنے لگا۔ ''سرکار گھوڑا ٹھیک ٹھاک ہے۔ ویسے دیکھنے میں کمزور لگتا ہے۔ بعض نسلیں ہی ایسی ہوتی ہیں۔۔۔۔۔۔ ستے خیراں ہیں۔ جانور مجھ سے زیادہ تگڑا ہے۔۔۔ اتنا بتا دوں''۔ ''او تُو۔۔''

ایک بے رحمی والے نے گالیوں کا آغاز کیا اور دوسرے نے گھوڑے کو تانگے سے جدا کرنا شروع کیا۔ اس موقع پر کچھ دکانداروں اور ایک دو راہ گیروں نے معاملے کو رفع دفع کرنے کے اشارے دیے۔ ''کوئی چھوٹا موٹا جرمانہ کر دیں جی۔۔۔ بے چارے کی دیہاڑی کا معاملہ ہے''۔

''او یہ کوئی بات بھی تو کرے جی بڈھا۔ ایک ہی بک بک کیے جاتا ہے۔ گھوڑے پر کوئی ظلم نہیں ہو رہا ہے۔''

''کیا ثبوت ہے؟'' مولا بخش نے اچانک بُری طرح کھانستے ہوئے پوچھا تھا اور مجھے یاد ہے کہ اُس وقت کافی دور سے ایک پوڑیوں والا بھی کام چھوڑ کر اپنے چکنے ہاتھ لیے تماشہ دیکھنے آ گیا تھا اور اس وقت لگام پکڑنے والے بے رحمی والے نے دوسرے کو کہا تھا۔

''یاسین یہ پکڑ ادھر آ کر لگام ذرا میں اس کو دکھاؤں بے رحمی کے ثبوت۔ ثبوت مانگتا ہے۔'' لگام دوسرے کو پکڑا کر وہ جب گھوڑے کے جسم کے قریب ہوا تھا تو مجھے یاد ہے اُس کا چہرہ پیشہ ورانہ لیاقت سے تمتما رہا تھا اور مجھ پر عقیدت و احترام کا سناٹا چھا گیا تھا جیسا کہ مجھ پر ہر اہل علم وفن کو کام کرتے دیکھ کر چھا جاتا ہے مگر پھر اُس میں یعنی 'سناٹے' میں وہ میلی کچیلی ہوا کا جھونکا پھر آن گھسا تھا۔ عجیب باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ اُس نے گھوڑے کے جسم کو ٹٹولنا شروع کیا اور پھر اشارے سے مولا بخش کو پاس بلایا۔

''اِدھر آ۔۔۔۔۔ یہ دیکھ پسلیاں گن کے بتاؤں؟ یہ دیکھ۔ زین کے نیچے زخم۔۔۔ لہو رس رہا ہے''۔ پھر اُس نے گھوڑے کے لہو پر انگلی لگا کر انگلی مولا بخش کے کُرتے سے صاف کی۔ پھر وہ یک دم نیچے گھوڑے کی ٹانگوں میں بیٹھ گیا۔ ''آ۔۔یہ۔۔۔ اور یہ دیکھ گھٹے پر زخم۔ سُوج رہا ہے یہ۔۔۔ زہر باد بن رہا ہے''۔

''زہر باد نہیں جی۔ معمولی زخم ہے''۔ مولا بخش نے احتجاج کیا۔ اُس وقت مجھے یاد ہے کہ میں نے سوچا تھا کہ یہ معاملہ لگتا ہے ابھی کافی دیر چلے گا۔ ویسے بھی میں نے بے رحمی والوں کو اپنے فرائض منصبی ادا کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اُسی وقت ایک راہ گیر تماشائی نے بے رحمی والے کی اسٹینڈ پر کھڑی سائیکل کو گرا دیا تھا اور وہ ایک عمومی احتجاج پر اتر آیا تھا۔

''او۔۔۔ اِدھر کوئی تماشہ لگا ہوا ہے کیا؟ جاؤ۔ جاؤ اپنا کام کرو''۔ تماشائیوں میں

سے جن چند افراد نے بے رحمی والوں کا ''جاؤ اپنا کام کرو'' کا مشورہ قبول کیا تھا، اُن میں میں بھی شامل تھا۔ چنانچہ میں اپنے کام یعنی اعلیٰ تعلیم کی طرف چل پڑا مگر اپنے وہی چند سوال ساتھ لیے ہوئے۔ ''ظلم کیا ہے؟ کیا گھوڑے پر ظلم ہو رہا ہے؟ آخر یہ کس طرح ثابت ہو کہ گھوڑے پر ظلم ہو رہا ہے؟''

میں پہلے پیریڈ میں بیس منٹ لیٹ تھا مگر پروفیسر صاحب نے ناگواری کے تاثرات دکھانے کی سزا دے کر کلاس میں شامل ہونے کی اجازت دے دی۔ آخر میں سوالات کا وقفہ ہوا۔ انہوں نے کہا، ''کوئی سوال؟''

اب میں اُن ذہنی جسمانی، عضویاتی، جذباتی، نفسیاتی، کیمیاوی وغیرہ وغیرہ محرکات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جنہوں نے مل جل کر کچھ ایسا کام دکھایا کہ میں نے اچانک پوچھا یا اچانک میرے منہ سے نکلا ''سر۔ کیا گھوڑے پر ظلم ہو رہا ہے؟'' ظاہر ہے کہ لیکچر کے نفس مضمون کا اس سوال سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں دیگر دوستوں سے کوئی دس منٹ پہلے ہی کنٹین پہنچ گیا۔

اور جب وہ سب آئے۔ مشتاق پرندہ۔۔ ساجد۔۔۔ زرینہ۔۔ ثاقب۔۔ پروین بے چاری۔۔۔ اور سلیمان، تو بہت سنجیدہ آئے۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ مجھ جیسا محنتی طالب علم ایک پروفیسر سے اس طرح کا مذاق کرے گا۔ ان کے ذہنوں میں میرے بے چارے ذہن کے بارے میں سنگین خدشات تھے اور جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے کوئی مذاق وذاق نہیں کیا بلکہ یہ ایک انتہائی سنجیدہ سوال ہے تو اُن کے خدشات کی سنگینی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ تب مجھے انہیں سارا واقعہ سُنانا پڑا۔ فوری ردعمل پروین بے چاری کا سامنے آیا ''بے چارہ گھوڑا'' اُس نے آہ بھر کر کہا۔ بے چارہ۔ بے چاری وغیرہ کے کثرت استعمال کی وجہ سے ہی وہ پروین بے چاری کہلاتی تھی۔ مشتاق پرندہ جو طیور کی طرح کبھی کبھی دوران گفتگو اپنی دونوں کہنیوں کو اس طرح اوپر نیچے حرکت دیتا تھا کہ جیسے ابھی پرواز کر جائے گا اور ایک طالب علم عالم ہونے کی موجود شہرت رکھتا تھا کہنے لگا ''واقعی یار۔۔۔ یہ سوال تو عجیب ہے۔ مگر اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھو انسان تو بتا سکتا ہے کہ کب اُس پر ظلم ہو رہا ہے، لیکن جانور۔۔۔''۔

''یہاں تو انسان کے لئے بتانا مشکل ہے جانور تو۔۔۔'' زرینہ نے کہا جسے ہر بات ادھوری

چھوڑنے کی عادت تھی۔

سلیمان شاہ نے قہقہہ لگایا اور کہا "اس کا مطلب ہے کہ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے ہمیں جانوروں کی زبان سیکھنی پڑے گی" جب اُس نے دوسرا قہقہہ لگایا تو جھکڑ کا ایک جھونکا سیدھا اُس کے منہ میں گھس گیا۔ "یار کیا ذلالت ہے۔ یہ آج موسم کو کیا ہو گیا ہے جھکڑے چل رہے ہیں"۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ یہ لفظ "جھکڑے" سلیمان نے، گو کہ خاصا احمقانہ بولا ہے، مگر کیا کمال بولا ہے۔ غلاظت اُڑانے والے تیز ہوا کے جھونکے کو "جھکڑا" ہی کہنا چاہیے۔ پھر سب نے اتفاق رائے سے فیصلہ کیا کہ کنٹین کے اندر منتقل ہو جانا چاہیے۔

ساجد کسی گہری سوچ میں تھا اور اس کی اس کیفیت کو ہم یوں سمیٹتے تھے کہ "گھوہ میں کنکیشن لگائے بیٹھا ہے۔" بالآخر وہ گھوہ یعنی کنوئیں سے باہر آیا اور گھمبیر لہجے میں بولا۔ "اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے پہلے ظلم کی ایک عمومی تھیوری وضع کرنی پڑے گی، اور اس تھوری کو وضع کرنے کے لئے اس عظیم درس گاہ کے دانش ور اساتذہ سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ آخر یہ علم کی وہ عظیم بھٹی ہے جس میں سے لوگ کندن بن کر نکلتے ہیں"۔ اس پر ثاقب نے، جواب تک خاموش تھا، خدشہ ظاہر کیا کہ "کچھ سڑ کر سواہ بھی ہو جاتے ہیں اور کبھی نکل نہیں پاتے"۔ اور پھر مجھے یاد ہے کہ ہم سب پر یہی جاننے کا اجتماعی جنون طاری ہو گیا "کیا گھوڑے پر ظلم ہو رہا ہے؟"

مشتاق پرندے نے سب کو وارن کیا کہ اساتذہ کو اِس سوال میں Involve کرنے کے بہت سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اور اُس کی وارننگ جیسا کہ بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔ کالج میں جھکڑوں والا وہ دن "کیا گھوڑے پر ظلم ہو رہا ہے؟" کے سوال کا دن بن گیا۔ ہم ہر شعبہ علم کے سامنے سوالی ہوئے مگر مجھے یاد ہے (عجیب باتیں یاد آ باقی ہیں اور عجیب طرح یاد آتی ہیں) کہ علماء و فضلاء کی غالب اکثریت نے اِس سوال کو انتہائی نامعقول، بیہودہ، واہیات، بدتمیز، سرے سے کوئی سوال نہیں۔۔۔ سوال قرار دیا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم سوال کا پس منظر اور وہ واقعہ کبھی بیان نہیں کرتے تھے۔ طلبا سے بے تکلفی کی پالیسی رکھنے والے اساتذہ نے اکثر شرارت بھرے لہجے میں جواباً سوال کیے تھے "کیا چکر

ہے؟ کس کی ٹانگ کھینچ رہے ہو؟۔۔۔ سمجھ گیا۔ کس کو گھوڑا کہہ رہے ہو؟ تمہارے گروپ سے یہی توقع تھی۔۔۔۔۔" وغیرہ وغیرہ۔

حیوانیات کے ایک پروفیسر صاحب نے البتہ اس سوال کو بہت سنجیدگی سے لیا۔ غالباً اس لئے کہ سوال کا تعلق ایک حیوان سے تھا۔ انہوں نے کہا "ظلم حیوانی سطح پر اگر درد کا ہم معنی ہے تو یہ ایک Psycho Motor Event ہے جو کہ Avoidance Response پیدا کرتا ہے جو کہ Survival کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس جواب کو حاصل کر کے جب ہم اُس شعبہ علم سے باہر نکلے تھے تو مجھے یاد ہے کہ ساجد پھر کنوئیں میں کنکیشن لگا گیا تھا اور یہ کنکیشن اس دن قائم ہی رہا تھا۔ آخر میں ہم نے فلسفے سے رجوع کیا۔ وہاں سے ہمیں دو ردعمل ملے ایک تو یہ کہ ظلم، رحم، بے رحمی سب اضافی چیزیں ہیں موضوعی ردعمل ہیں اور معروضی طور پر بے حقیقت ہیں۔ دوسرا ردعمل جو بہت معروضی تھا وہ کالج کی انتظامیہ کی طرف سے ایک خفیہ پیغام تھا کہ کالج میں طلبہ کا ایک گروہ تخریبی کارروائیاں کرتا پھرتا ہے۔ ان کی بیخ کنی کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔ خاطر خواہ انتظام یقیناً ہو جاتا اگر ہم تتر بتر نہ ہو جاتے۔ تتر بتر ہونے سے پہلے البتہ ثاقب نے اپنے تفصیلی انداز بیان میں اتنا ضرور کہا تھا کہ گھوڑا اور مرد کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ اساتذہ کی غالب اکثریت مرد ہے۔۔۔۔۔ پھر اس نے گفتگو کو حیوانیات کی چند ایسی سمتوں کی طرف بڑھانا چاہا جو کم از کم خواتین کے لئے سخت ناقابل قبول تھیں۔ گروپ کے فوراً بر سرت بھاگ اٹھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

کالج سے واپسی پر میں نے وہی معمول کا راستہ اختیار کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں اُس بازار میں سے اُسی مقام پر سے گزر رہا تھا جہاں اُسی دن مولا بخش کے گھوڑے پر ظلم کے آثار ثابت کیے گئے تھے تو وہ سب کچھ کہ "۔۔۔ ادھر۔۔۔ کچھ ہو رہا ہے" ایک بار پھر میرے اندر پوری شدت سے جاگ اٹھا تھا۔ میں ایک لمحے کے لئے اُسی تھڑے کے قریب رکا تھا اور پھر وہ آواز میں نے سنی۔ وہ سامنے کا ایک دکاندار تھا۔ اور کبھی میں صبح گزرتے وقت کوئی پنسل کاغذ اُس سے لے لیتا تھا۔ "باؤ جی بات سنیں"۔ میں رک گیا۔ "معاف کرنا آپ کو روکا۔۔۔ لیکن۔ آپ بھی صبح اِدھر تھے ناں۔۔۔ جب وہ بے رحمی والوں نے پکڑا تھا اُس بیچارے مولا بخش کے گھوڑے کو۔۔۔ آپ کو دیکھا تھا میں نے"۔

"ہاں ہاں۔ میں تھا اِدھر۔۔۔ بالکل۔۔۔ کیا ہوا تھا پھر۔؟"

"اُنہوں نے چھوڑ دیا اُسے۔۔۔ اُس کے گھوڑے کو۔ مولا بخش کے گھوڑے کو"۔ دکاندار کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔۔۔ "سب کچھ ہی چھوڑ دیا جی۔۔۔ مولا بخش مر گیا"۔

مجھے یاد ہے کہ مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے کسی نے برف کا ایک بہت بڑا بلاک میرے پورے جسم پر کھینچ مارا ہو۔ حالانکہ مجھے یاد ہے وہ کوئی گرم دن نہ تھا سرد بھی نہ تھا۔۔۔ "بس جی مرنے میں کوئی دیر لگتی ہے۔ وہ اُس کے گھوڑے کو کھول ہی رہے تھے، مولا بخش گرا۔۔۔ اور دوسری سانس تک نہیں لی"۔

میں نے البتہ ایک طویل اور گہرا سانس لیا تھا۔ دکاندار کی طرف دیکھا تھا اور آگے چل پڑا تھا۔ "جھکڑے" اب بھی زوروں پر تھے اور مجھے یاد ہے کہ اس وقت ایک عجیب سی دیوانی خواہش نے مجھے ہڑپ کر لیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں پورا منہ کھول کر، پورے پھیپھڑے کھول کر، پورا جسم کھول کر گندی، آلودہ، نجس ہوا کا ہر ذرہ اپنے اندر بھر لوں۔۔۔۔ عجیب باتیں یاد آ جاتی ہیں۔

عجیب باتیں یاد آ جاتی ہیں۔۔۔ اور عجیب طرح سے یاد آتی ہیں۔ یہ سب کچھ بہت پرانی بات ہے میں اب ایک کافی بڑا افسر ہوں اور یہ سب کچھ مجھے آج عجیب طرح یاد آیا۔ میرے سامنے ایک فائل ہے۔ جس میں کہیں سے کچھ لوگوں نے بہت سی شکائتیں کی ہیں اور بار بار یہ فقرہ دہرایا ہے کہ اُن پر ظلم ہو رہا ہے۔ لفظ ظلم کی یہ تکرار آج بھی میرے لئے ناقابل فہم ہے اس لئے میں یہ فائل دوسرے سیکشن میں بھیج رہا ہوں اور عجیب بات ہے کہ آج کا دن بھی ویسا ہی ہے۔ آلودہ "جھکڑ" چلنے والا دن۔۔۔ گو کہ ائیر کنڈیشنگ، غلاظت کے تہہ در تہہ امکانات کو میری جلد تک پہنچنے سے روک رہی ہے۔ مگر پھر بھی میں کھڑکی کے شیشوں کی راہ سے یہ دیکھ تو سکتا ہوں۔۔۔۔ کہ یہ ویسا ہی دن ہے۔ عجیب باتیں یاد آ جاتی ہیں۔

نقطالی کے بیٹے رمُوت کا وصیت نامہ

عجائب گھر.......... گیلری.......... مخطوطہ نمبر.......... عہد..........

زبان.......... مقام.......... دریافت..........

نقطالی کا بیٹا رمُوت اپنے پانچویں اور سب سے چھوٹے بیٹے لاوی سے مخاطب ہے۔ اس سے کہ جو دن اور رات کے بیچ کی اُس گھڑی کی پیدائش ہے کہ جب تاریکی روشنی پر زور مارتی ہے اور شمال کی ہوا چکر کھا کر جنوب کو پلٹ جاتی ہے۔ سنو یہی گھڑی ہے کہ جس کا جنا اِس لائق ہے کہ شاہ کے لقمے کو شاہ سے پہلے جھوٹا کرے اور شاہ کے گھونٹ کو اِس سے پہلے کہ وہ شاہ کے دہن میں اتر جائے۔ اپنی جیبھ سے گندا کرے۔ کاہنوں نے کہا۔

تو سُن پانچوں بیٹوں میں سے سب سے آخر میں آنے والے سُن۔ تو ہی ایسا ہے کہ جس کا جنم اپنے باپ جیسا ہے اور جس کا جنم اُس کے باپ اور باپ کے باپ جیسا پچھلی تیرہ نسلوں تک۔ روشنی سے تاریکی کا جنم کہ جو سفید نیام سے نکلی سیاہ تلوار کی مثل ہے۔ جان لے کہ جیسا تُو خوب جانتا ہے کہ تُو اپنے باپ کے منصب کا امین ٹھہرے گا۔ یہ منصب کہ جو بہت کڑا اور ہلاکت کے خوف سے بھاری ہے تو اٹھائے گا۔ جیسا تیرے پچھلوں نے اٹھایا۔ قسم ہے مجھے سرخ رتی کے بیجوں میں چھپی اجل کی کہ جو شہ زوروں کے دلوں کو پتھرانے والی قاتل ہے اور قسم ہے مجھے سنکھیے کے شیطانی وار کی کہ جس کے آگے دلاوروں کی دلاوری شاہوں کی شاہی اور کاہنوں کے سب اسرار ہیچ ہیں تُو اُس خانوادے کا سچا وارث ہو گا جو تیرہ گزری نسلوں سے سرزمین بیسام کے شاہوں کے طلائی خوان کو، جو سات سرزمینوں کی سب نعمتوں سے سدا پر رہتا ہے اور ان کے مے کے پیالوں کی مے کو سب زہروں کی قاتل آلائشوں سے محفوظ کرنے کی

جاں نثاری کرتا آیا ہے۔ اور وہ سب زہر کہ جو طغیانی کے بعد سرزمین بیسام کی مٹی میں دفن وس کے بیجوں سے پھوٹتے ہیں۔ سب جڑیاں اور بیلیں اور چیتے کی کھال جیسی چتکبری کھمبیاں کہ جن سے جلسی چراگاہوں میں خشک سالی کی موت مرتے چرندے بھی پناہ مانگتے ہیں۔ اور دودھ رنگے پتھروں اور آسمان رنگے سنگریزوں سے جھڑتی ریت کہ جو گوشت کو ہڈی سے جدا کرتی ہے اور چیرتے درد والی موت کی قاصد ہے۔ اور اڑنے والوں اور رینگنے والوں اور پاؤں اٹھانے والوں کے ماس کی گانٹھوں سے ٹپکتی بوند جو تنومند مرد کا جگر ریزہ ریزہ کر ڈالتی ہے۔ سب نشانیاں ہیں دردناک ہلاکت کی کہ جو شاہوں کے طعام میں ظاہر ہوتی اُن کے لئے مرضِ مرگ کا پیام بر بنتی ہیں۔ اور بُرا وقت ہے وہ جب شاہ چُھپ کر وار کرنے والوں کی گھات سے مارا جائے۔

مگر نہیں وہ محفوظ رہے گا شاہِ بیسام ہمیشہ۔ کہ جب تک ششکو کے پانی اس سرزمین کی مٹی کو حاملہ کریں گے اور سورج ظاہر ہو کر چُھپے گا اور دن ہوگا اور پھر رات ہوگی۔ وہ رہے گا۔ وہ جس کی ہیبت بولنے والوں کی زبان گنگ کرتی ہے اور گنگ زبانوں سے لفظوں کو چیختا نکالتی ہے، وہ رہے گا۔ طلائی تخت پر متمکن۔ زربفت کی قبا میں ملبوس لعل و یاقوت سے مزین تاج اوڑھے وہ سدا خنداں و شاداں رہے گا اور ارغوانی مے اس کے لبوں کو تر کرے گی اور وہ اپنے خوان کی نعمتوں سے اپنے جی کو مسرور کرے گا بے خطر اور بے نیاز ان کے آزار سے کہ جو اس کے کھانوں کے طشت میں اور اس کی مے کی صراحیوں میں زہر گھولنے والے ہیں۔ اور فسادیوں کے فساد سے کہ جو شاہ کی موت کی آرزو کرتے ہیں مگر ٹھکانا پاتے ہیں اُن عقوبت خانوں میں کہ جن کے فرش آہنی سلاخوں کے ہیں۔ اور دیکھو نیچے دریا بہتا ہے اور عظیم دریا ششکو میں تیرتی مچھلیاں کہ جو بزدلوں کے بریدہ اعضاء سے اپنے شکم سیر کرتی ہیں۔ قسم ہے مجھے۔

قسم ہے مجھے اُس لمحے کی کہ جب نوالے میں چھپا سفید سفوف حلق میں پہلی بار اترتا ہے۔ بُرا وقت نہ آئے گا کہ جب تک چکھنے والوں میں سے ایک بھی ایسا جیتا ہے کہ جو جتنا ہو دن اور رات کے بیچ کی اُس گھڑی کا جب تاریکی روشنی پر زور مارتی ہے اور شمال کی ہوا چکر کھا کر جنوب کو پلٹ جاتی ہے۔ بُرا وقت نہ آن پائے گا کہ جب تک چکھنے والا جیتا ہے وہ شاہ کو بڑھتے زہر سے سنے لقمے کو اپنی جیبھ کی ڈھال پر روکے گا اور ایسا نہ ہو پائے گا کہ جیسا فسادیوں نے ٹھانا۔

میں نعطالی کا بیٹا رموت اپنے پانچویں اور سب سے چھوٹے بیٹے لاوی سے مخاطب ہوں۔ رموت کہ ہر کسی میں دربارِ شاہی کا قصیدہ گو شاعر مانا جاتا ہے۔ مگر دیکھو وہ تو بیسام کی قلمرو کے شاہوں کے ہر خوان میں اور ہر مشروب میں سم قاتل کہ چُھپا ہو کھوجنے والا ہے اور وہ کہ چکھنے والوں میں سے ہے شاہوں کی خور و نوش کو ان دیکھی موت کے وسوسوں سے پاک کرتا ہے۔ اور شاہ خوب جانتا ہے کہ وہ ایسا ہے کہ یہ رازِ شاہی ہے اور جانتے ہیں کاہن کہ جنہوں نے لازم کیا اِس راز کو۔ اور جانتا ہے تُو کہ جو اس راز کا امین ٹھہرے گا۔ پس اُس گھڑی کہ جب میری موت کا نرسنگا پھونک دیا جائے اور وہ میری لوتھ کو بیسام کی مٹی میں گہرا اتار کر واپس لوٹیں تو گینڈے کے سینگ کا مقدس پیالہ لئے شاہ کے روبرو سجدہ ریز ہوگا۔ اور اس کے قدموں کو بوسہ دے گا اور اُس کی خاکِ پا کو چاٹے گا اس وقت تک کہ جب وہ سونے کا عصا تین بار اٹھائے اور تخلیے کا حکم دے اور تجھ سے تیرا مدعا دریافت کرے۔

ہر چند کہ اُس پل تیرا جی مفارقت کے اندوہ کا نوحہ کرنے کو ترسے گا تو اپنے تئیں گریہ سے باز رکھے گا اور شاہ کے حضور اپنے نسب کا حال کہے گا اور اپنے جنم کا اصل اُس کی جناب میں منکشف کرے گا۔ تب وہ متبسم ہوگا اور جان لے گا کہ رموت کا بیٹا لاوی کہ جو سب میں، جنگلی گھوڑوں کو اصطبلِ شاہی کے لئے سُدھانے والا مانا جاتا ہے اصل میں چکھنے والوں کے خانوادے کا وارث ہے اور رازِ شاہی کی محافظت کرنے والا سچا منصب دار اور جاں نثار ہے۔ جیسا کہ اس کا باپ کہ دربارِ شاہی کا قصیدہ گو شاعر تھا اور اُس کا باپ کہ معمارِ شاہی تھا۔ اور اُس کے اجداد میں وہ جو تیغ گری میں لاثانی تھا۔ اور وہ جو حکمت و دانش میں یکتا مشیرِ شاہی تھا۔ اور وہ جو بیسام کی کنواریوں کو کہ جو عورتوں میں سب سے جمیلہ ہوں حرمِ شاہی کی زینت بناتا تھا اور ایسے ہی تیرہ گزری نسلوں تک شہنشاہِ بیسام زنطار کے غلام پالاس تک کہ جس کے جنم پر کاہنوں نے کہا کہ یہی ہوگا جو رازِ شاہی کا پاسبان ہوگا اور ایسا ہی اُس کے نطفے سے آگے ٹھہرتا رہے گا، اُس گھڑی تک کہ جب تاریکی روشنی پر زور مارے گی اور شمال کی ہوا چکر کھا کر جنوب کو چلے گی۔ اور یہ قصہ بہت پرانا ہے اور بہت طولانی ہے کہ کہن سال رموت کی گویائی کو عاجز کرتا ہے۔ پس دیکھ لو کہ چکھنے والوں کے بہت روپ ہیں اور بہت ڈھنگ ہیں پر اُن کے جنم کی اصل ایک ہے۔

سو تو اپنے جی کے جنجال کو اور اپنی امانت داری کے بوجھ کو شاہ کے روبرو ہلکا کرے گا

اور شاہ متبسم ہوگا کہ اب بھی اُس کے تناول کی گھڑیاں فسادیوں کے فساد سے پاک ہوں گی اور اس کی مے کا سرور ہلاکت کے دھڑکے سے آزاد رہے گا۔ تب وہ کاہن کو اپنے حضور بلائے گا اور دونوں متبسم ہوں گے اور کاہن عود و لوبان سُلگائے گا اور فسوں پڑھے گا اور جب دخان کا سحر تیرے نتھنوں تک پہنچے گا تُو سوگندھ اٹھائے گا راز شاہی کی پاسبانی کی کہ جیسے تیرے اجداد نے اٹھائی اور یہ راز کاہن اور بادشاہ اور تیرے بیچ رہے گا۔

اور ٹھہر رمُوت کے بیٹے ٹھہر اور سُن اور جان لے کہ ایسا تُو نہیں جانتا اور ایسا تُو نے میرے لبوں سے نہ سُنا۔ اور سُن کہ اب رموت کی گھڑیاں تمام ہونے کو ہیں اور ساعت مرگ بڑھنے کو ہے۔ پس جان لے کہ راز شاہی سے سوا ایک راز اور ہے۔ کاہن اور تیرے بیچ ایک بھید اور بھی ہے!

نقطالی کا بیٹا رمُوت اپنے پانچویں اور سب سے چھوٹے بیٹے لاوی سے مخاطب ہے۔ رمُوت کہ ہر کسی میں دربار شاہی کا قصیدہ گو شاعر مانا جاتا ہے۔ جو شاہ بیسام کے جلال کی مدح کرتا ہے اور جس کا کلام شاہوں کی ثنا میں کبھی ماندہ نہیں ہوتا۔ چکھنے والوں میں سے ایک ہے۔ اور جب وہ اپنے دونوں منصبوں کی خدمت گاری تمام کرتا ہے۔ اور جب سورج پھر ظاہر ہونے کو چھپتا ہے۔ اور جب تاریکی بیسام پر اپنا گھیرا ڈالتی ہے۔ اور جب شاہ استراحت کی خواہش میں حرم کو لوٹتا ہے۔ اور جب قصر سلطانی کے سب ادنیٰ اور اعلیٰ خدمتگار اور نمک خوار اور وہ سب کہ جو بندی خانوں میں اپنے پاپوں کا کرم بھوگتے ہیں اور وہ سب جو بیسام کی سب بستیوں میں اور قریوں میں دائم جیتے مرتے ہیں خواب سے اور نیند سے کہ بنات اجل ہیں ہم بستری کی آرزو کرتے ہوش و خرد سے عاری ہوتے ہیں، تب کہن سال رمُوت اپنے چوبی بچھونے پر دراز اپنے من کی درماندگی پر ہلکان ہوتا ہے اور اُس کابوس کی گرفت سے اپنے تئیں آزاد کرنے کے جتن کرتا ہے کہ جو چکھنے والوں میں سے فقط اُس جیسوں کا مقدر ہے۔ اور دیکھ عجب ہے کہ وہ بھید کہ جو کاہن اور اُس کے درمیان ٹھہرا ہے اور راز کہ جو راز شاہی سے سوا ہے۔ رمُوت کو نالہ و شیون سے باز نہیں رکھتا۔ عجب ہے۔ سو جب سارا بیسام بے خبر سوتا ہے تب رمُوت کہ اپنی معصیداری کے عذاب میں جلتا ہے اپنے جی کے خلجان سے اپنے کلام کو منتشر کرتا ہے اور پھر باندھتا ہے اور وہ کہن سال شاعر دھتورے کے

گیت گاتا ہے اور گچلے کے ترانے الاپتا ہے اور دیکھ کہ وہ کیسی واہی تباہی بکتا ہے۔

دھتورے کا راگ

اور شسکو میں طغیانی آئی
اور بیسام کی مٹی میں حمل ٹھہرا
ثمر باری کا
اور سب ثمر ہائے شیریں
اور میوے اور بالیاں اناجوں کی
بلکتی گرسنگیوں کا شکار ہوئیں
اور ننگی عشرتوں کی بھینٹ ہوئیں

تب
میرے پھول کہ شاہی رتھ کی گھنٹیوں
کی مثل ہیں۔
اور میرے پتوں کی سبزی کہ فیروزے کو ماند کرتی ہے۔
اور میرا ثمرِ پُر خار کہ جیسا ٹوٹتا تارہ۔
راج دھورت
خشک چٹانوں سے گذرتی ہوا میں
لہراتا اور مسکاتا ہے۔
چاہنے والے کے انتظار میں
اپنے متوالے کی چاہ میں۔
کہ جو اس کے سبز لہو کے عرق کو
اور اس کے ثمرِ پُر خار سے ٹپکی بوند کو
اتارنے آتا ہے۔

شاہوں کی نسوں میں۔
اور دیکھو ثمرِ پُر خار کا ستارہ شاہ کی آنکھ میں پھوٹتا ہے۔

اور ناچو۔
اُس کے ماس میں انگاروں کے رقص کے سنگ
اور سنو میرے پھولوں کی گھنٹیوں میں سنو
شاہ کی موت کا راگ سنو۔

حیف۔ صد حیف۔ اور لعنت ہو رمُوت پر۔ اور لعنت ہو اُس شاعر پر۔ اور لعنت ہو اُس کے نجس کلام پر، اور اُس کی بیہودہ گفتار پر۔ اور اُس کے من کے کرودھ پر کہ جو چکھنے والوں میں فقط اُس جیسوں کا مقدر ٹھہرا ہے۔ اور وہ کرودھ ایسا روگ ہے سلگانے والا کہ اُس کی آنچ کو وہ بھید بھی ٹھنڈا کرنے سے عاری ہے کہ جو چکھنے والوں اور کاہنوں کے بیچ ٹھہرا تھا۔ حیف کہ وہ جو بُرا وقت ٹالنے والا ہے بُرے وقت کی آرزو کرتا ہے جب سارا بیسام بے خبر سوتا ہے۔ پس اٹل ہے کہ اس ساعت سے قبل کہ وہ فسادیوں کی موت مارا جائے اور اُس کے خون کو کتے چاٹیں۔ یا وہ جگہ پائے اُن عقوبت خانوں میں کہ جن کے نیچے دریا بہتا ہے۔ اور دریا میں تیرتی مچھلیاں کہ جو بزدلوں کے بُریدہ اعضا سے اپنے شکم سیر کرتی ہیں۔ اٹل ہے کہ وہ اپنی ساعت مرگ کو خود گلے لگائے اور سبز لہو کے عرق کو اور ثمرِ پُر خار سے ٹپکی بوند کو اپنی رگوں میں اتار لے۔

بس سن رمُوت کے بیٹے لاوی سن اور جان لے کہ کاہنوں کا دوسرا راز کیا ہے۔ کہ اب جب کہ سورج چھپنے کو پھر ظاہر ہوگا اور بیسام سے تاریکی چوروں کی مانند بھاگے گی اور جب یہ نوشتہ تُو پائے گا اور لکھنے والا جیتا نہ ہوگا۔ اور جب وہ میری موت کا نرسنگا پھونک دیں گے اور جب شاہ تجھے مانے گا کہ چکھنے والوں میں سے ہے اور جب تُو اس کی غلامی میں آ جائے گا۔ تو یہی بھید ہوگا کہ تیری حفاظت کرے گا۔ اور وہ ثمرۂ اجل کہ جو شاہوں کی اُورتا کا جاتا ہے کبھی تیری ہلاکت کا سامان نہ بن پائے گا۔ اور تُو جو کہ شاہوں کو زہر کے آزار سے بچانے والا ہے اپنے تئیں اس آزار سے کہ بڑے کرب کی موت ہے سدا بچائے گا۔ اور دیکھ کہ تُو تعجب کرتا ہے کہ یہ کیسا کلام ہے اور یہ کیسا اچرج بول ہے کہ تیرے باپ رمُوت کے لبوں سے تو نے کبھی نہ سُنا تھا اور وہ کہ جو تجھے چکھنے والوں کے سب ڈھنگ سکھاتا اور وہ جو تجھے شاہوں کے کھاجے میں زہر کھوجنے

کی کاریگری میں تاک کرتا تھا کس دیوانی رمز کی بات کرتا ہے اور تو جی میں کہتا ہے حیف کہ نعطالی کا بیٹا دیوانوں کی موت مرا۔
تو سن کہ گھڑیاں گزرتی ہیں اور پل تمام ہونے کو سکڑتے ہیں۔ یہ کتھا سن کہ یہ بھی بہت پرانی ہے اتنی جتنا کہ رازِ شاہی۔
اور ایسا ہوا کہ تیرہ نسل پہلے جب شاہ زنطار نے غلام پالاس کو کاہنوں کی مشاورت سے اپنے طعام کو اور مشروب کو چکھنے والا مامور کیا دیکھنے کو کہ دشمن اس میں زہر نہ چھپائیں اور یوں اس کی جان لینے کے درپے نہ ہوں۔ تو پالاس اِس منصب پر ایک برس جیتا رہا۔ اور شاہ زنطار جیتا رہا۔ تب یوں ہوا کہ شسکو میں طغیانی نہ آئی اور کال نے بیسام کی بستیوں میں اور قریوں میں پھولے پیٹ اور سوکھی ٹانگوں والی موت کی منادی کی اور نرسنگا پھونکنے کے غوغے سے بدک کر مویشی جھلسی چراگاہوں میں جا مرنے لگے تو ایک روز پالاس کہ جو قصرِ شاہی میں شاہ کی مے کے پیالے سے گھونٹ جدا کر کے چکھتا تھا گرا اور اُس کے نتھنوں سے خون پھوٹا اور وہ مر گیا اور شاہ جان گیا فسادیوں کے فساد کو اور جیتا رہا۔ اور پھر کاہن اس کا پہلا بیٹا شاہ کی محافظت کو اس کے حضور لائے۔ اور دیکھو کہ وہ بھی اپنی منصب داری میں ایک روز جھکّوں کی موت مارا گیا اور وہ بڑے دکھ سے مرا۔ اور پھر وہ پالاس کے دوسرے بیٹے کو لائے کہ جو بڑا شاہ زور تھا۔ افسوس کہ اس کی شاہ زوری اس کے کام نہ آئی اور اس لقمے نے کہ جو شاہ کے طعام میں سے تھا اس کے ماس کو نیلا کیا اور ہڈی سے جدا کیا اور وہ مر گیا۔ اور ایسے ہی پالاس کے دس بیٹے کہ جو بڑے کڑیل جوان مرد تھے۔ ان قاتل بوندوں اور سفوفوں کی بھینٹ ہوئے کہ جو بیسام کی سرزمین میں چھپے دس کے بیجوں سے پھوٹتے اور پتھروں سے جھڑتے ہیں۔ اور شاہ زنطار جیتا رہا۔ تب غلام پالاس کے گیارہویں بیٹے نے کہ جو سب سے چھوٹا اور دانش مندی میں سب سے بڑھ کر تھا۔ اپنی خانہ بربادی کا ماتم کیا اور آہ زاری سے اپنے تئیں ویران کیا۔ اور پھر اس نے اپنا گریباں چاک کیا اور جامہ ریزہ ریزہ۔ ٹاٹ پہنا اور سر پر راکھ ڈال کر معبد کے بیچ چلا گیا اور پھر کاہنوں نے سُنا کہ جو اس نے کہا۔
”حیف ہے کہ شاہ جیتا رہے اور چکھنے والا مارا جائے۔ کیسی آفت ہے کہ شاہ مے سے مسرور ہو اور چکھنے والا کرب سے تڑپے اور جان دے۔ یہ کیسی ہلاکت ہے کہ شاہ کو چھوٹ دیتی ہے اور چکھنے والے کو شکار کرتی ہے۔

تُف ہے چکھنے والوں کے منصب پر اور تُف ہے اُن کی جاں نثاری پر"۔۔۔۔۔۔اور پھر پالاس کے اُس بیٹے نے بڑا نالہ بلند کیا اور معبد کی دیواریں لرزیں۔ اور کاہنوں نے اُس کے کلام پر کہ آہ بکا کی مثل تھا کان دھرے اور جب اس کی نالہ زاری تمام ہوئی اور وہ اُن کے روبرو گھٹنوں کے بل جھکا۔ تو انہوں نے چُپ سادھی کہ جس کے آگے معبد کا سکوت بھی ہیچ تھا۔ اور گھڑیاں گذریں اور پھر ان میں سے وہ کہ جو سب سے پیرانہ سال تھا اور وہ کہ جس پر وہ سب اسرار کہ جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں وا تھے۔ گویا ہوا، اور دیکھ کہ اس کی گویائی ایسی تھی جیسی رعد کی کڑک۔

"پالاس کے بیٹے سن اور جان لے۔ اٹل ہے کہ شاہ جیتا رہے۔ ہر بلا سے اور ہر آزار سے اور ہر دکھ سے ورا جیتا رہے۔ اور اٹل ہے کہ برا وقت نہ آئے اور اٹل ہے کہ برا وقت ٹالنے والا رہے۔

اور پھر کاہن نے کہا۔ اور پالاس کے بیٹے تیرا اندوہ بھی شدید ہے اور تیرا الم بھی سچا ہے۔ پر عجب ہے کہ تیرے کلام میں بڑی حکمت ہے۔ لازم ہے چکھنے والا جیے کہ اس کے جینے سے شاہ کا جینا ہے اور لازم ہے کہ وہ جو بُرا وقت ٹالتا ہے اُس پر بُرا وقت نہ آئے اور ایسا ہی ہوگا۔ پس لازم ہے کہ فسوں پڑھا جائے اور سجدہ ریزی ہو ان کے سامنے کہ جو نادیدہ ہیں کہ وہ سحر کاری کی گھڑی میں ہمیں راہ دکھلائیں۔ سو پلٹ جا اور چھپا رہ اس وقت تک کہ جب تجھے حکم ہو۔

اور ایسا ہوا کہ جب کاہنوں نے پھر اسے اپنے حضور بلایا تو پالاس کے بیٹے نے دیکھا کہ وہ سب خنداں وشاداں تھے تب وہ بھی متبسم ہوا اور اُس کے جی کا بوجھ ہلکا ہوا۔ تب کاہن نے کہا۔

پالاس کے بیٹے سُن اور جان لے یہ بھید کہ جواب تیرے اور کاہن کے بیچ ٹھہرے گا۔ اور یہ ایسا راز ہوگا کہ رازِ شاہی کا پاسبان ہوگا۔ یہ بھید ہوں گے کہ محافظت کریں گے ایک دوسرے کی اور ایک سے دوسرا ہوگا۔ لازم ہے کہ فسادی اپنے ہی فساد کی موت مارے جائیں اور فتنہ گروں پہ اپنے ہی فتنوں سے دردناک موت آئے۔ اور وہ جو شر چاہتے ہیں شاہ کے لئے بھسم ہوں اپنے ہی شر کی آگ میں اور وہ جو آرزو کرتے ہیں بُرا وقت لانے کی بُرا وقت آئے اُن پر۔

اور اٹل ہے کہ شاہ جیتا رہے اور چکھنے والا جیتا رہے۔ اور رہیں گے کاہن اور ان کے اسرار کہ جن سے دونوں کا جینا ہے۔

اور کاہن نے کہا۔۔۔ پس تو لوٹ جا اپنے منصب پر پالاس کے بیٹے۔ اور دیکھنا اب شاہ مطبخِ شاہی کے عقب میں کسی تعمیر کا حکم دے گا کہ جو مقدس ہوگی اور نہاں ہوگی سب سے سوائے چکھنے والے کے اور کاہن کے۔ اور تو جائے گا اپنی منصب داری کے مقام پر کہ سب سے پوشیدہ ہوگا اور دیکھے گا ان کو کہ جن کا ٹھکانہ تھا ان عقوبت خانوں میں کہ جن کے نیچے دریا بہتا ہے۔

پس جب شاہ تناول کی خواہش کرے۔ اور اپنے خوان کی نعمتوں کی تمنا کرے۔ اور مے کی طلب کرے تب تو اس کے ہر طشت سے اور ہر پیالے سے ایک حصہ جدا وہاں لے جائے کہ جو تیری منصب داری کا مقام ہے اور دیکھنا کہ وہ زنجیروں میں بندھے ہوں گے اور اُن کے دہن کھل جائیں گے تجھے دیکھ کر۔ اور بیسام کی سب نعمتوں سے خوشبو پرواز کرے گی اور کتوں کی مثل اُن کی جیبھ دراز ہوگی۔ تب وہ سب کچھ کہ جو شاہ کے لئے تھا اور شاہ سے پیشتر تیرے لئے تھا اب تجھ سے پیشتر تُو ان سب کے حلقوم کے اندر ڈالے گا کہ کھلے ہوں گے اور یہی اُن کا کھا جا ہوگا۔ اور دیکھنا اُن میں اُس کو کہ جو طعامِ شاہی کا چٹخارا لے گا اور جیبھ کے سواد کو اندر کھینچے گا۔ اور مارا جائے گا زنجیروں میں۔ اُس ان دیکھی موت سے کہ سرزمینِ بیسام کے شاہوں کا مقدر نہ بنے گی اور کمی نہ ہوگی کھلے دہنوں سے نکلتی جیبھوں کی کہ جن پر تو اس اجل کو پرکھے گا اور سدا محفوظ رہے گا خود اُس مقدر سے کہ جو پالاس اور اس کے دس بیٹوں کا تھا کہ یہ کاہن کے سحر کا اقرار ہے اور بھید ہے جو تیرے اور اس کے بیچ رہے گا۔

نقطالی کا بیٹا رمُوت اپنے بیٹے لاوی سے مخاطب ہے کہ وہ بھی اس کے بیٹوں میں سب سے چھوٹا ہے اور دانش مندی میں سب سے بڑھ کر ہے اور وہی امین ہوگا ان دونوں بھیدوں کا کہ ایک دوسرے کی پاسبانی کرنے والا ہے۔ پس جب تو چکھنے والوں کی سوگندھ اٹھا چکے گا کاہن تجھے اس تعمیر میں لائے گا کہ جہاں دوسرا بھید کھلتا ہے جو تیری منصبداری کا مقام ہو گا۔ اور دیکھے گا تو ان کو کہ جن کا ٹھکانہ تھا ان عقوبت خانوں میں کہ جن کے نیچے دریا بہتا ہے۔

پس لازم تھا کہ یہ کلام تو سنتا اور جانتا وہ سب کہ جو تو نے اس نوشتے سے جانا۔ کہ تو

اب لکھنے والے کو جیتا نہ پائے گا کہ کہن سال رعونت کی گھڑیاں اب تمام ہوں گی اس گھڑی پر کہ
جب سبز لہو کا عرق اور ثمر پرخار سے ٹپکی بوند اُس کی نسوں میں اتر جائے گی اور نجات دلائے گی
اس کو دہرے بھیدوں کے کابوس سے کہ جو جکڑنے آتا ہے۔ اور بڑا روگ ہے سلگانے والا۔ اور
وہ جو کہ چکھنے والوں میں فقط اس جیسوں کا مقدر ہے اور جب سارا بیسام بے خبر سوتا ہے، وہ سنتا
ہے کھنک آہنی زنجیروں کی کہ جوان کے ماس کو گودتی اُس کا خون سرد کرتی ہیں اور دیکھتا ہے ان
کے دہن کہ جو کھل جاتے ہیں اُس کی آہٹ پر لقمے کی خواہش میں کہ جیسے طیور بچے کہ جب نکل
ہوں۔ اور گاؤ دستورے کا گیت گاؤ اور سنو کھلے کا ترانہ سنو۔

اور دیکھو۔
ثمرِ پُرخار کا
ستارہ شاہ کی آنکھ میں پھوٹتا ہے
اور ناچو
اس کے ماس میں انگاروں کے رقص کے سنگ
اور سنو
میرے پھولوں کی گھنٹیوں میں سنو
شاہ کی موت کا راگ سنو

نامکمل۔ (پُتلا)۔ کہانی

(1)

پُتلا بنانے کی ذمہ داری سراج دین کو سونپی گئی جو پارٹی کے اُس دفتر کا پرانا چوکیدار
تھا۔

اور یہ ذمہ داری کچھ ایسے ناگہانی انداز میں اُسے سونپی گئی کہ کچھ دیر کے لیے تو وہ
سُن سا ہو گیا اور یہ سمجھنے سے قاصر کہ پارٹی کے دو بڑے منتظم اسے کیا کہہ رہے ہیں۔ رات اس
وقت آدھی جا چکی تھی۔ اور اگلے دن کے احتجاجی مظاہرے کی تمام تیاریاں ہاشم صاحب اور رحمان
صاحب اپنی طرف سے مکمل کر چکے تھے مقررین، مظاہرین، میگا فون، پھولوں کے ہار، اخباری
نمائندے، جلانے والے ٹائر اور پُتلا ۔۔۔۔۔

''اور پُتلا'' جس لمحے یہ خیال ہاشم صاحب کے ذہن میں گونجا تھا اُسی وقت باہر بادل
زور سے گرجا تھا۔ شہر میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بارشوں کے دن تھے۔

''اور پُتلا ۔۔۔۔۔'' رحمان صاحب نے غیر حاضر دماغی سے کہا اس کی توجہ باہر کی
بارش کی طرف تھی۔

''یار یہ بارش کہیں گڑبڑ نہ کردے۔ کل اگر سڑکوں پر پانی اکٹھا ہو گیا تو جلوس کیا خاک
نکلے گا۔

''اس بارش کو فی الحال تم بارانِ رحمت تصور کر لو۔ تم نے دیکھا نہیں جب کبھی خاص
خاص موقعوں پر بارش ہو جاتی ہے تو خاص خاص موقعوں کے کرتا دھرتا اسے تائیدِ ایزدی قرار

دیتے ہیں۔"

لیکن یار۔۔۔۔۔تم ابھی آگ کی بات کرو۔۔۔۔۔میرا مطلب ہے پُتلا۔۔۔۔
جسے جلانا ہے۔۔۔۔۔وہ کون بنائے گا۔۔۔۔۔سوچا ہی نہیں۔۔۔۔۔"

"ہاں پُتلا جلائے بغیر بات نہیں بنتی"۔ رحمان صاحب نے یک دم اپنے کان میں خارش محسوس کی اور پھر یک دم انگلی کا پور کان میں ڈال کر کھٹ کھٹ کرنے کے انداز میں کان کے اندرونی حصے کو تہہ و بالا کر دیا۔ خارش ختم ہو گئی۔ پھر اُس نے سوچا کہ اُس کے کان کی پرانی تکلیف شاید پھر عود آئی ہے۔ کل وہ یہ بہانہ تو کر سکتا ہے کہ کان کی تکلیف کی وجہ سے وہ تقریر نہیں کر سکتا مگر ایسے موقعوں پر تو گلے کا بہانہ کام آتا ہے۔ بہر حال کل مظاہرے کے بعد شام کو اگر وہ گرفتار ہو گیا تو۔ بہر حال فارغ ہونے پر وہ ENT اسپیشلسٹ کے ہاں جائے گا۔ پھر بآواز بلند اُس نے کہا "ہاں یار کچھ کرو۔ پُتلا تو لازمی بنانا پڑے گا۔"

سب کچھ سراج دین چوکیدار کے سامنے ہو رہا تھا۔ صبح سے ہو رہا تھا اور پچھلے کئی دنوں سے ہو رہا تھا۔ وہ رہنماؤں کی باتوں کو سینے سے لگاتا تھا لیکن اکثر نہیں بھی لگاتا تھا۔ اب پچھلے کئی گھنٹوں سے جب سے میٹنگ ہو رہی تھی وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا کبھی تو وہ اس قدر ولولہ محسوس کرتا تھا کہ اُس کا جی چاہتا تھا کہ اچھل کر رہنماؤں اور کارکنوں کے بیچ جا گرے پھر کبھی جب بھوک کے کڑل اُسے پریشان کرتے تھے تو جی کرتا تھا کہ جلدی یہ سارا کام ختم ہو اور وہ اپنے کوارٹر جا کر روٹی کھائے۔ ایک ایک کر کے سب لوگ اپنی اپنی ڈیوٹیاں لے کر چلے گئے تھے۔ مگر اب یہ جاتے جاتے پُتلے کی بات نکل آئی اور ہاشم صاحب اور رحمان صاحب جاتے جاتے پھر رک گئے اور اوپر سے بارش ہو گئی ہے۔ خیر بارش کا تو کوئی نہیں گاڑی میں چلے جائیں گے۔ مگر یہ پُتلے کا کیا چکر ہے۔

"پُتلا جلے گا رحمان صاحب۔۔۔ اور ضرور جلے گا۔ اور اُس۔۔۔ کا۔۔۔۔۔
پُتلا۔۔۔۔۔جلے گا۔ تو۔۔۔۔۔جائے گی۔ یہ۔۔۔۔۔جذبات کا۔۔۔۔۔معاملہ ہے۔۔۔۔۔
عوام کے جذبات کا معاملہ ہے۔۔۔۔۔" ہاشم صاحب اب ہر فقرے کے بعد پھر ایک گالی والی ڈکشن پر اُتر آیا تھا جس کے انتہائی موثر ہونے میں کوئی کلام نہیں تھا۔ پھر بجلی کی چمک کمرے میں دکھائی دی اور اس نے کڑک سنائی دینے کا انتظار کیا اور کونے میں سٹول پر بیٹھے سراج دین کو اپنی

نظروں پر رکھ لیا۔

"سراج دین پُتلا تم بناؤ گے" اور کڑک بھی سنائی دے گئی۔ سراج دین کو کڑک اور ہاشم صاحب کی آواز اکٹھی سنائی دیں۔ کچھ دیر وہ سُن سا ہو کر بیٹھا رہا پھر بولا۔

"ہیں جی، سر جی۔۔۔۔۔جی سر جی۔۔۔۔۔پپ۔۔۔پُتلا۔۔۔۔۔"

"پُتلا" رحمان صاحب ہنس پڑا۔ مگر ہاشم صاحب صرف سراج دین کی طرف خشمگین نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "پُتلا۔۔۔ سراج دین۔ پُتلا۔۔۔ اُس۔۔۔۔۔کا پُتلا۔۔۔ جسے کل آگ لگائی جائے گی۔ ساڑ کر سوا کر دینا ہے۔۔۔ سمجھ میں نہیں آیا تمہارے۔۔۔۔۔"

"مم۔ مٹی کا پُتلا۔۔۔ سر جی" سراج دین نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

رحمان صاحب پھر ہنس پڑا۔ "مٹی کا پُتلا تو۔۔۔ سراج دین صرف جہنم میں جلے گا"۔۔۔ اُس نے کہا اور ایک بار پھر ہاشم صاحب کی طرف دیکھا مگر داد دینے کی بجائے الٹا اُس نے کہا۔

"یہ فقرے بازیوں کا وقت نہیں ہے رحمان صاحب۔ یہ ایک مشکل سچویشن ہے۔ اس بے وقوف کو سمجھاؤ کہ پُتلا بہر حال اِسے بنانا پڑے گا۔ اِس وقت رات کے ایک بجے ہیں جبکہ شہر پر بارش برس پڑی ہے۔ کارکن ہمارے جا چکے ہیں۔ اور ہمارے پاس اور کوئی ہے نہیں جو پُتلا بنا سکے۔ اِسے سمجھاؤ۔ اِسے یہ کام کرنا ہو گا۔"

رحمان صاحب آگے بڑھا اور اپنائیت سے سراج دین کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا "دیکھو سراج دین، میں اور تم جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اکٹھے ہی پارٹی میں آئے تھے جوانی ہم دونوں ادھر ہی گال چکے ہیں اور اب بڑھاپے بھی ادھر ہی خراب کر رہے ہیں"۔ "سر جی یہ کیا کہہ رہے ہو"۔ سراج دین کو یک دم محسوس ہوا کہ وہ سٹول سے اٹھ کر آدھے آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچا ہے۔

"صبح۔۔۔ جی۔ جی سر جی۔۔۔ میں۔۔۔۔۔عالی جی میں۔۔۔۔۔میری جان بھی حاضر ہے۔۔۔۔۔"

"جان ہمیں فی الحال درکار نہیں" ہاشم صاحب بولا۔۔۔ رحمان صاحب مسکرا کر کہنے لگا۔ "جان کو ابھی سنبھال کر رکھو سراج۔ جو ہاشم صاحب کہتے ہیں وہ کرو"۔

"بالکل کروں گا سر جی، سراج نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ہزاروں، کروڑوں پُتلے بناؤں گا"۔

"احمق آدمی ہے" ہاشم صاحب نے عاجز آ کر کہا۔ "سمجھتا نہیں، ہزاروں کروڑوں پُتلے نہیں بیوقوف۔ ایک پُتلا بنا۔۔۔ ایک۔۔۔ اُس۔۔۔ کا۔ اُس۔۔۔۔۔ کا۔۔۔۔۔ اس۔۔۔۔۔ کا۔۔۔۔۔" ہاشم نے فقرے میں اِس قدر بھیانک گالیاں بھر دیں کہ سراج اور رحمان دونوں کے دل دہل گئے۔

"سر جی بالکل بناؤں گا۔ بس آپ۔۔۔ آپ ذرا طریقہ بتا دیں کہ کیسے بنانا ہے اُس کا پُتلا۔۔۔۔۔؟

"ہاں۔۔۔۔۔ وہ میں تمہیں بتاتا ہوں۔" ہاشم نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ بارش اب دھیمی پڑ چکی تھی۔ اور چمک دکھائی دینے کے باوجود کڑک سنائی نہیں دیتی تھی۔

"یہاں تو سارے پارٹی کے ریکارڈ پڑے ہوئے ہیں" اُس نے مایوسی سے کہا۔

"ایسا کرو" ہاشم نے سراج دین کی طرف دیکھ کر کہا جس کی آنکھیں اور منہ اس قدر کُھلے ہوئے تھے جیسے وہ پُتلا بنانے کی ہدایات اپنے اندر اتار لینا چاہتا ہو۔

"ایسا کرو۔۔۔ دیکھو۔۔۔ اپنے کوارٹر میں۔۔۔ باقی کہیں کمروں میں؟ چار بانس کی لکڑیاں۔۔۔ دو ٹانگیں۔ دو بازو۔۔۔ ایک سر۔ کس کے باندھ کر۔۔ پھر۔۔۔۔۔ کچھ دیکھو۔۔۔ کوئی پرانے تکیے پرانے کپڑے۔ جوتیوں کا ایک ہار بھی بنانا ہے۔ سر کے اوپر ایک پرانے۔ چھوٹے سے تکیے کو لگا کر اوپر غلاف چڑھا دینا۔ پھر توے کی کالک سے آنکھوں کے ناک کے سوراخ اور منہ کے سوراخ کے نشان بنا دینا۔۔۔۔۔ سمجھ گئے۔۔۔

سراج دین ہنس پڑا۔ اب اُسے آنے والے تخلیقی لمحات کے تصور سے مزہ آنے لگا تھا۔ وہ زیادہ اعتماد سے بولا۔ "سمجھ گیا سر جی۔۔۔ بالکل سمجھ گیا۔۔۔ پر سر جی۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ یہ کیسے پتہ چلے گا کہ یہ اُسی۔۔۔۔۔ کا پُتلا ہے" سراج دین نے گالی دینے کی خواہش پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ یہاں شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں سراج دین" رحمان صاحب

نے کہا "اُس کا پُتلا بنانے کے لیے ضروری ہے کہ۔۔۔۔۔ کہ پُتلا بناتے وقت تم اپنی زندگی کے اُن سب لوگوں کا تصور دل میں لانا۔ جن سے تم نے اتنی نفرت کی ہے۔ یا کر رہے ہو اتنی اتنی کہ اگر وہ کبھی تمہارے قابو آ جاتے تو تم انہیں۔۔۔۔۔ بھسم کر دیتے۔ بس یہ جذبے دل میں اکسانا"۔

"انشاء اللہ" سراج دین نے خوفناک یقین سے کہا۔

"شاباش" ہاشم صاحب نے کہا۔ "اور سنو۔۔۔۔۔ اس پر پھر تمہارا جو سامان وغیرہ لگے گا۔ بانس کی سوٹیاں۔ سرہانے، کپڑے وغیرہ اُس کا تمہیں خرچہ ملے گا۔ فکر نہ کرنا اور کل ہم اُسے جلانے سے پہلے بتائیں گے کہ یہ ہمارے دفتر کے پرانے چوکیدار سراج دین نے بنایا ہے۔ اب دفتر کی عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔" سراج دین نے وہیں کھڑے کھڑے اثبات میں سر کو جنبش دی اور ہاشم صاحب اور رحمان صاحب اُسے تھپکی دیتے چلے گئے۔

رہنماؤں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی بارش اور کڑک پھر شروع ہوگئی۔ پھر اس نے خواب جیسی کیفیت میں دفتر بند کیا اور برآمدے میں آیا تو وہ ہوا آ چکی تھی جو بادلوں کو آگے لے کر جاتی ہے۔ برآمدے کے سبز بلب کی روشنی میں اُس نے دیکھا کہ کیاریوں میں ایک جگہ سورج مکھی کے پھولوں کی پتیاں تتر بتر ہو چکی تھیں کائناتی سطح پر فائز ہونے کے باوجود اُس نے سوچا کہ کل وہ مالی کو کہہ کر وہ پودے نکلوا دے گا۔ کیونکہ وہ پھول اب بے موسے ہو چکے تھے۔

پُتلا بنانے کا ساز و سامان تلاش کرنے میں اُسے کسی خاص مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ میلے کچیلے گلے سڑے تکیوں کی کمی نہ تھی۔ ایک دفعہ پارٹی کے بینر لگانے کے بعد بانس کی کچھ سوٹیاں اُس کے قابو آ گئی تھیں جو اُس کے کوارٹر میں رکھی تھیں۔ پرانے کپڑوں میں سے اُس نے سب سے زیادہ پرانے کپڑوں کا انتخاب کیا۔ اُس نے ایک موٹی سوئی اور دھاگا بھی لے لیا۔ پھر اُس نے چولہے سے توا اتار کر بھی پاس رکھ لیا کہ آنکھوں اور منہ کے نشان بھی تو لگنے ہی تھے۔ ہاشم صاحب کی پُتلا سازی کی ہدایات پر تو وہ ہر طرح سے عمل کر چکا تھا۔

سراج دین نے بانس کی ایک چھڑی اٹھائی جو شاید ٹانگ بن سکتی تھی یا دھڑ کی بنیاد بن سکتی تھی یا دونوں بازوؤں کی علامت بھی بن سکتی تھی۔ اُس نے گھبرا کر چھڑی واپس رکھ دی۔ اُس کا ماتھا پسینے سے بھیگ رہا تھا اُس نے پسینہ پونچھا تو اُسے خیال آیا کہ پُتلے کا ماتھا بھی تو بنا

ہے۔ ہاتھ بھی تو بنتا ہے۔ گردن بھی بنی ہے۔ یہ سب مجھ سے نہیں ہوگا۔ اس نے سوچا اور اسی وقت اچانک اسے یاد آیا کہ رحمان صاحب نے بھی تو کچھ کہا تھا۔ اُس کا پُتلا بنانے کے لیے ضروری ہے کہ پُتلا بناتے وقت تم اپنی زندگی کے اُن سب لوگوں کا تصور دل میں لانا جن کے متعلق تم نے چاہا تھا کہ انہیں تو بس کھڑے کھڑے ساڑ کر سواہ کر دینا چاہیے۔۔۔۔۔

سراج دین مسکرایا جیسے ذہن پر سے ایک بوجھ اتر گیا ہو۔ یہ تو بڑا آسان ہے۔ بس انہیں دل میں لانا ہے۔۔۔۔۔ جن سے تم اتنی نفرت کرتے ہو۔ اتنی نفرت کرتے ہو۔ کہ اگر تمہارے قابو آ جائیں تو بھسم کر دو۔۔۔ بس اتنی بات ہے۔ بچپن سے شروع کرنا چاہیے۔ شروع سے شروع کرنا چاہیے۔ ایسے سب لوگ۔۔۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شیطانی خیال اس کے ذہن میں آیا۔ کیا وہ اپنے باپ کو بھی پُتلے کے ساتھ آگ کے حوالے کر دے؟ پھر اس نے توبہ توبہ کی کانوں کو ہاتھ لگائے اور دوسرے قابل نفرت بھسم کیے جانے کے قابل لوگوں کی نفرت کو جی میں جگانے لگا۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ آ رہے تھے مگر اجزا میں کسی کا گدھے جیسا کان، کسی کی موٹی سی ٹھُتے کی ناک، ناک کے سوراخ، آنکھیں، مونچھیں۔ میرے خدا مونچھیں ہی مونچھیں اور آنکھیں ہی آنکھیں۔

اچانک سراج دین کو احساس ہوا کہ وہ تو نفرت کے اجزا جگاتے جگاتے ہف گیا ہے ادھ موا سا ہو گیا ہے۔ اس کام پر اب اُس کا زور لگنے لگا ہے۔ تب اُس کے پیٹ نے اُسے بتایا کہ وہ تو کب کا بھوکا ہے۔ ساڑ کر سواہ کیے جانے کے قابل لوگوں کو یاد کرنے سے پہلے روٹی ہی تو کھا لینی چاہیے۔

پُتلے کا کچھ جوڑ جنتر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ سراج دین نے محبت سے اسے دیکھا جو فرش پر آہستہ آہستہ شکل حاصل کر رہا تھا۔ وہ اٹھ کر ایک کونے میں گیا جہاں قیمے والے دو نان رکھے تھے۔ جو دوپہر کو کارکنوں میں تقسیم کیے گئے تھے۔ نان کھانے اور دو گلاس ٹھنڈا پانی پینے کے بعد وہ پھر سے کام پر آ گیا۔ مگر۔۔۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ اس نے پورا زور لگا کے اس آدمی کو تصور میں لانے کی کوشش کی اُس واقعے کو۔ جب اسے۔ جب وہ ایک جگہ ملازم تھا اور اُسے جھوٹی چوری کے الزام میں پکڑوا دیا۔ اُسے تھانے لے جایا گیا اور ساری رات مارا گیا۔ وہ فریاد کرتا رہا واسطے دیتا رہا کہ وہ بے گناہ ہے۔ وہ مونچھیں، وہ آنکھیں، وہ پاؤں، وہ جوتے۔۔۔۔۔ وہ

مگر کچھ بھی نہ ہوا۔۔۔۔۔ ایک چپکیلا سا غبار تھا جو کسی بھی انسانی عضو کے ذہن میں آتے ہی اس کے اوپر چڑھ جاتا تھا۔۔۔۔۔ شاید نان کھانے سے پہلے ہی بھوکے پیٹ عظیم قابل نفرت انسانی اعضا ذہن میں لا لا کر اس نے اپنا دماغ ناکارہ کر لیا تھا۔

یہ پارٹی کے دفتر کی عزت کا سوال ہے سراج دین ہڑبڑا کر اٹھا اور اُس نے اپنے جسم کو سر کو دو تین بار زور زور سے جھٹکے دیئے اس نے پُتلے کو اُس مقام پر رسی سے گرہ لگانے کی کوشش کی جہاں وہ اس کی پیٹھ ٹھہرانا چاہتا تھا مگر رسی ہاتھ سے پھسل پڑی۔ یہ دفتر کی عزت کا معاملہ ہے۔ وہ بتائیں گے کہ پُتلا جو جلایا جا رہا ہے۔ ہمارے دفتر کے پرانے چوکیدار سراج دین نے بنایا ہے۔ سراج دین تیزی سے اٹھا اور کوارٹر کی کھڑکی کھول کر اس نے اُس باہر برستی بارش کو دیکھنا چاہا۔ مگر اُسے دھکا سا لگا۔ وہاں کوئی بارش، بادل، گرج، چمک نہیں تھی۔ پچھلی رات کے آسمان میں چاند تھا۔ جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ سراج دین نے آگے۔۔۔۔۔

(2)

خط بنام عظیم ادیب صاحب

السلام علیکم:۔

جان ہی گئے ہوگے کہ اس خطاب سے تمہیں کون مخاطب کرتا ہے۔ کیا حال ہے۔ کافی عرصے سے نہ تم سے ملاقات ہوئی نہ کوئی اور رابطہ ہوا۔ خط لکھ رہا ہوں۔ کیا حال ہے۔ خط اس لیے لکھ رہا ہوں کہ۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے اس لیے بھی لکھ رہا ہوں کہ ایک ادھوری تحریر۔ بلکہ ادھوری کہانی تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ خط لکھتے وقت میری زبان عجیب بے قابو سی ہو جاتی ہے۔ خیر لعنت بھیجو۔ لعنت! لعنت! لعنت!!!

تو جانی بات یہ ہے کہ تم تو Established ادیب ہو۔ پوری پلاننگ سے لکھتے ہو۔ چھپتے ہو۔ اور پھر رونمائیاں کراتے ہو۔ مگر میں صرف اسی وقت لکھتا ہوں جب میرے اندر کوئی ادبی قسم کا مروڑ اٹھتا ہے۔ مگر بعض اوقات وہ مروڑ راہ میں ہی رہ جاتا ہے اور میں صحت یاب ہو

جاتا ہوں جیسا اس کہانی کے سلسلے میں ہوا۔ میرا خیال ہے خط آگے پڑھنے سے پہلے یہ ضروری
ہے کہ تم پہلے وہ تحریر پڑھ لو وہ خط کے ہمراہ لف ہے۔ پھر اسی جگہ پر آنا۔

اچھا تو تم نے پڑھ لی۔۔۔ جو بھی یہ چیز ہے۔ میں نے اس کا عنوان سوچا تھا پتلا
کہانی۔ مگر اب یہ نامکمل پتلا کہانی ہے۔ ویسے اس میں بھی عجیب مزے کی بات ہے۔ کیا یہ نا
مکمل۔ پتلا کہانی ہے یا نامکمل پتلا۔ کہانی کہانی ہے۔ الگ الگ بات ہے یعنی کیا یہ ایک نامکمل
پتلے کی کہانی ہے یا ایک پتلے کی نامکمل کہانی ہے۔ سوچو، میں کہاں ہوں اور تم کہاں ہو۔

تو جانی یہ بات یہ ہے کہ میں نے سوچا تو یہ تھا کہ اس کہانی کو مکمل کروں گا۔ سراج دین
پتلا بنائے گا۔ اگلے دن صبح رحمان صاحب اور ہاشم صاحب آئیں گے۔ ہاشم سراج پر برس پڑے
گا۔ ہر لفظ کے بعد گندی ترین گالیاں دیتے ہوئے کہے گا یہ تم نے کیا بنایا ہے۔ اپنی ماں
کا۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو کہیں سے انسان کا پتلا بھی نہیں لگتا۔ رحمان صاحب ہنس کر کہے گا۔
کہ سراج دین پکاسو کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ آخر میں فیصلہ یہ کیا جاتا ہے کہ چونکہ وقت محدود
ہے اور پتلا جلانا بھی ضروری ہے۔ اس لیے اسی کو کچھ نہ کچھ انسانی شبیہ دے کر۔ وقت مخصوص پر
نذر آتش کر دیا جائے۔ مگر وقت مخصوص آنے پر پھر مسلسل بارش شروع ہو جاتی ہے۔ احتجاج درہم
برہم ہو جاتا ہے۔ مگر سراج دین ہے کہ اڑا ہوا ہے ڈٹا ہوا ہے کہ پتلا ضرور جلایا جائے گا۔ وہ کہیں
سے پٹرول لاتا ہے اور جب مظاہرین ادھر اُدھر دوکانوں کے چھجوں تلے کھڑے ہیں وہ تیز برستی
بارش میں پتلے پر پٹرول ڈال کر آگ لگا دیتا ہے۔ مگر دور کھڑے رہنما حیران ہوتے ہیں کہ باران
رحمت میں دھڑ دھڑ جلتا پتلا دلدوز چیخیں کیوں مار رہا ہے۔ اور پھر یہ ایک پتلا ہے یا دو پتلے ہیں
وغیرہ وغیرہ۔ تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

مگر پھر جانی میں نے سوچا کہ یہ انجام تو سیاسی ہو جائے گا اور سیاسی افسانوں سے تم
جانتے ہو مجھے نفرت ہے۔ موجودہ صورتحال کی عکاسی کرنے والے افسانوں سے اُس سے بھی
زیادہ نفرت ہے۔ بلکہ مجھے تو عکاسی سے بھی نفرت ہے۔ تو تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ ویسے اِس
افسانے کے یا جو کچھ بھی یہ ہے اور بھی کئی انجام میرے ذہن میں آتے ہیں۔ مگر تم بتاؤ تم کیا
تجویز کرو گے۔

باقی ادھر خیریت ہی ہے بس ایک لعنتی سے خلا میں سانس لیتا رہتا ہوں۔ ویسے حکم یہ

ہے کہ بندہ جہاں رہے خوش رہے۔

تو جانی اس تحریر کو دیکھ لینا۔۔۔۔۔ ویسے آپس کی بات ہے اس میں کچھ کمی بیشی کر
کے تم کہیں اپنے نام پر بھی چلانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بلکہ خوشی ہوگی۔

باقی یار کچھ مالی حالات بڑے سنگین جا رہے ہیں۔ پہلے بھی ٹھیک نہیں تھے۔ مگر اب
تمہاری بھابی کا پتے کا آپریشن ہونا ہے۔ دوست ہی مدد کر رہے ہیں۔ صدقہ جاریہ ہے۔ متوقع
ہوں۔۔۔۔۔

اور سناؤ پھر۔۔۔ تمہاری حالیہ کتاب پہلی سے بہتر ہے۔ اجازت دو۔۔۔۔۔

تمہارا اپنا
مکمل نامکمل پتلا

(3)

دنیا میں کتنی ہی جگہوں پر جلے ہوئے کاغذ ملتے ہیں۔ کس نے لکھے۔ کب لکھے۔
کیوں لکھے اور کیوں جلائے۔ کوئی نہیں جانتا۔

پتھر کی بریل

یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں اندھیرے کی دنیا کا خوگر ہو کر تاریکیوں سے اتنا مانوس ہو چکا تھا کہ روشنیوں اور سایوں کے ماضی سے اجالے کی کوئی مدھم سی کرن یا رنگ کی کوئی دھندلی سی لہر بھی کبھی میرے تاریک شعور کی بوجھل شانتی کو غارت نہیں کر پاتی تھی۔

میں اندھیروں کی تہوں میں سرکتا پھرتا ایک اندھیرا تھا مگر مختلف! اس لیے کہ میں اپنی تاریکی کو دوسری تاریکی سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میری اپنی تاریکی کی دیواریں تحلیل نہ ہو جائیں اور میں کہیں دوسری تاریکی میں ہمیشہ کے لیے گم نہ ہو جاؤں۔

میں اُس نابینا فن میں تاک ہو چکا تھا جو تاریکی کو تاریکی سے جدا کرتا ہے اندھیرے کو اندھیرے سے کھینچ نکالتا ہے مگر روشنی کا محتاج نہیں ہوتا، اجالے کی بھیک نہیں مانگتا۔ یہ مشکل ہے آہ۔ میرے لیے سمجھانا اور اُن لوگوں کے لیے سمجھنا جو میرے ارد گرد کہیں ہیں اور نہیں جانتے کہ میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہیں۔ وہ سب اندھیرے اپنے اندھیرے میں ہیں۔

ایسے ہی لمحات میں جب کبھی کمرے کی خاموشی میں بریل کے سرسراتے ذروں جیسے لفظوں سے انوکھے تصوروں کے نقشے بناتے بناتے اچانک میرے وجود کے سرے میرے ہی ہاتھ آنے سے گریزاں ہونے لگتے اور شعور کی لکیروں کے گنجلک خاکے سنبھل کر نمایاں ہونے کی بجائے الجھتے ہی چلے جاتے اور جب میرے لیے یہ تعین کرنا مشکل ہو جاتا کہ میں کہاں تک ہوں اور کہاں تک نہیں ہوں۔ کہاں سے شروع ہوتا ہوں اور کدھر ختم ہوتا ہوں تو ایک وحشت مجھے آن گھیرتی، میرا نابینا فن برباد ہونے لگتا اور میں اپنی سفید چھڑی ہاتھ میں تھام کر کمرے سے باہر چاروں طرف پھیلی آوازوں کی دنیا کی سمت چل کھڑا ہوتا۔

میں سڑکوں۔ گلیوں۔ بازاروں اور چوراہوں میں۔ فٹ پاتھوں پر۔ بند دروازں اور ادھ کھلی کھڑکیوں کے سامنے اور ہر اُس جگہ جہاں دونوں پاؤں جمائے اور پھر ایک ایک کر کے اُٹھائے جا سکتے ہیں اپنے آپ کو موجود کیا کرتا تھا۔ میں تاریکی کے سمندر میں تیرتی ایک کشتی کی مانند تھا جس کے گرد آواز کی لہریں اور شور کے گرداب چکراتے تھے اور یوں میں ہردم اپنے جسم کی حدود سے آگاہ رہا کرتا تھا۔

یہ اُسی وقت کی بات ہے جب بریل میں میری دلچسپی کم ہونے لگی تھی اور آوازوں کا شغف جنون کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔ بریل کے ذروں میں سرسراتی کتابیں مجھے بیزار کرنے لگیں۔ آوازیں مجھے اپنے بہت قریب اور لمس بہت دور محسوس ہوتے تھے۔ شور و غوغا کے گھنے جنگلوں میں، میں اپنے دونوں کان تانے مدہم سرگوشیوں کا شکار کیا کرتا تھا۔

آہٹیں۔ سرسراہٹیں۔ آوازیں۔ انسانی۔ حیوانی۔ میکانگی۔ برقیاتی آوازیں اور باتیں۔ ہنستی۔ روتی۔ کراہتی۔ چیختی۔ جم غفیر سے اُبھرتی اور ڈوبتی باتیں۔ محبتوں اور نفرتوں۔ لذتوں اور اذیتوں۔ 'علموں' اور جہالتوں کی باتیں میرے تاریک جسم کے تاریک خاکے کو اپنی حفاظتی لہروں کے غلاف میں لپیٹ لیتیں اور مجھے دوسری تاریکی میں گم ہو جانے سے بچا لیتیں۔ مجھے ایک کیے رکھتیں اور میری چھڑی کی نوک زمین کے سینے پر تالی بجا کر مجھے آگاہ رکھتی کہ میں اپنے دوسرے اندھیروں میں وہیں ہوں جہاں مجھے ہونا چاہیے۔ اندھیرا دن شور شرابے ہاہاکار سے لدا پھندا اندھیری شام کے غل غپاڑے میں ڈھلتا آخر اندھیری رات کے سناٹے کو راہ دیتا تو میں ادھ کھلی کھڑکیوں۔ روزنوں۔ اور شگافوں سے مفرور آہٹوں کو فی الفور اُچک لینے کے لیے بیتاب ہو جاتا اور میرے کان سرگوشیوں کی بھوک سے دیوانے ہونے لگتے۔ سرگوشیاں۔۔۔۔۔

''آج کے بعد کل۔ کل کے بعد ایک اور کل۔ اور پھر وہ کل جس کے بعد کوئی کل نہیں۔''

''کل کل۔۔۔کل کل۔۔۔''

''ہنس رہے ہو۔''

'ہاں تم ہمیشہ ایسی باتیں شروع کر دیتی ہو۔ عجیب باتیں۔'

'عجیب باتی ہے واقعی!'

'یہ صابن مجھے زہر لگتا ہے جسے تم اُسی روز استعمال کرتی ہو جب ہمیں ملنا ہوتا ہے۔'
'کیوں تمہیں کیا ہوتا ہے۔'
'اس کی خوشبو ہمارے درمیان غلاف بنا لیتی ہے۔ ہماری۔۔ قربت کے درمیان۔۔۔'
'یہ دو سانپوں کی قربت ہے۔ ایک دوسرے سے لپٹے دو سانپ ایک دوسرے کا زہر کاٹ رہے ہیں۔'
'سانپوں کا ذکر نہ کرو۔ مجھے سانپوں سے خوف آتا ہے۔'
'تم کانپ رہے ہو۔ تمہیں سردی لگ رہی ہے؟'
'نہیں کمرہ تو کافی گرم ہے۔ تم کیا ٹٹول رہی ہو۔ بستر پر کیا ڈھونڈ رہی ہو۔'
'کوئی تنکا ہے یا کوئی ذرہ کسی سخت سی چیز کا۔ مجھے چبھ رہا ہے بار بار۔ ڈھونڈ رہی ہوں۔'
'روشنی کر دوں؟'
'نہیں۔ اندھیرا بہت ضروری ہے۔ اندھیرے میں صرف خوشبوئیں باقی رہ جاتی ہیں اور ہمارے جسم اور پھر وہ بھی نہیں رہتے۔۔۔ ایک بات بتاؤ۔'
'کیا۔۔آ۔آ۔۔؟'
'اگر سانپ ایک دوسرے کو ڈس لیں تو کیا دونوں مر جائیں گے؟'
'میں آج تک تمہاری ایسی فضول باتیں نہیں سمجھ سکا۔۔آ۔آ۔۔'
'اپنا آپ سنبھالو۔ میں آج پیچھے رہ جانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'
'اچھا۔آ۔آ۔۔تم ہنس کیوں رہی ہو۔'
'مجھے اپنے ماں باپ یاد آ گئے۔ میرا ذہن یہ بات مانتا نہیں۔ کبھی وہ اندھیرے میں لپٹتے سانپ بنے ایک دوسرے کا زہر کاٹتے ہوں گے۔۔ کیا ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔'
'سو فیصد۔ تم خود کئی بار اس بات کا اقرار کر چکی ہو۔'
'اٹھانوے فیصد۔'
'تم پھر ہنس رہی ہو۔۔ ایسا نہ کہیں میں۔۔۔'

'کوئی بات نہیں۔ محبت کی خاطر میں پیچھے بھی رہ سکتی ہوں۔ کیا ہم محبت کرتے ہیں۔'
'کیا تمہیں یقین نہیں؟'
'ہاں۔۔ ہاں جب ذہن پگھل کر قطرہ قطرہ دل پر ٹپکتا ہے تو میرا جسم تمہارے جسم کی طرف بہنے لگتا ہے۔ کیا جسموں کے خلا پاٹنا محبت ہے؟'
'ہوں؟ ذرا الگ ہٹو چادر بالکل اکٹھی ہو رہی ہے۔'
'ایسے ہی کبھی میرے ماں باپ نے مجھے بنایا تھا اور تمہارے ماں باپ نے تمہیں تا کہ ہم ایک اور 'میں' بنا سکیں۔ لیکن ہم ماں باپ تو نہیں۔۔۔ ہم سے آگے موت ہے۔ موت میری نسوں میں دوڑتی ہے۔ سانپ ایک دوسرے کو ڈس لیتے ہیں تو دونوں مر جاتے ہیں۔'
'یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ ہمیشہ تم ایسی بکواس باتیں شروع کر دیتی ہو۔ تم خاموش نہیں رہ سکتیں؟'
'میں خاموش ہوں۔'
'آئی۔ ایم۔ ساری۔'
'میں خاموش ہوں۔'
'تم اپنے ڈاکٹر سے ملی تھیں۔'
'ہاں اُس نے مجھے ٹرنکولائزر کھانے اور نماز پڑھنے کا مشورہ دیا تھا۔'
'تو پھر؟'
'میں نے ٹرنکولائزر کھائے مگر نماز نہیں پڑھی۔'
'اُسے بتایا۔'
'نہیں۔ اُسے بتاؤں گی تو وہ مجھے سنگسار کر دے گا۔'
'کیسی بات کرتی ہو تم۔ کیسی بات کرتی ہو۔ او۔ او۔۔'
'سنو۔ کیا واقعی کبھی کسی کو ایسے سنگسار کیا گیا ہوگا۔'
'مم۔ مجھے۔ پتہ نہیں۔ ہو سکتا ہے۔'
'پتھر کی ایک ایک چوٹ میں انہوں نے ایک دوسرے کی موت کا ذائقہ چکھا ہوگا۔'

'بس کرو۔۔ بند کرو۔۔ یہ بکواس بند کرو۔'

'ہاں۔ تمہارا وقت قریب آ رہا ہے۔ میرا وقت قریب آ رہا ہے۔ یہ ساعتِ مرگ ہے۔ پتھر کی آخری چوٹ کے بعد وہ کل کبھی نہیں آئے گا جس کے بعد کوئی کل نہیں۔'

'بس کرو۔۔۔ بند کرو۔۔ یہ بکواس بند کرو۔'

'ہاں۔ تمہارا وقت قریب آ رہا ہے۔ میرا وقت قریب آ رہا ہے۔ یہ ساعت مرگ ہے۔ پتھر کی آخری چوٹ کے بعد وہ کل کبھی نہیں آئے گا جس کے بعد کوئی کل نہیں۔'

'خاموش رہو۔ پاگل عورت خاموش رہو۔'

'تمہارا جسم کانپ رہا ہے۔ تمہیں سردی لگ رہی ہے۔'

'اندھیرا ختم کرو۔۔ روشنی۔ روشنی کرو۔۔۔۔۔۔ بند کرو۔

'کیا ہوا تم چیخ کیوں رہے ہو۔ تمہارا بدن اینٹھ کیوں رہا ہے۔

'کیا تم۔۔۔۔۔'

'نہیں۔ نہیں۔ مت پھینکو۔ کون۔۔۔۔'

'کون۔ کیا ہوا۔ تمہیں کیا ہوا۔ تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ میرے خدا تمہاری تو کھال پھٹ رہی ہے۔ جگہ جگہ۔ او خدایا تمہیں کیا ہو رہا ہے۔'

'تم پتھر پھینک رہی ہو۔ آ۔۔ اُف۔۔ پتھر۔ پتھر۔ کون پھینک رہا ہے پتھر۔ میرا سر پتھر۔ میرا بازو پتھر۔ ظالمو۔ درندو۔ وحشیو۔ پتھر نہ پھینکو۔ میں مر جاؤں گا۔ رُک جاؤ۔ او۔۔۔ آ۔ آ۔۔ آ۔۔ آ۔۔ آ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور میرے کان سرگوشیوں کی بھوک سے دیوانے ہونے لگتے ہیں۔ سرگوشیاں کراہوں میں بدلتیں اور کراہیں چیخوں میں۔ اور پھر وہ آخری چیخ جو اندھیرے میں شگاف ڈال کر اُسے ریزہ ریزہ کر دیتی۔ تاریکی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔

آہ نہ ہی میں انہیں سمجھا سکتا ہوں نہ ہی وہ سمجھ سکتے ہیں وہ جو اندھیرے کو اُجالے سے پہچانتے ہیں۔ تاریکی کو روشنی سے جانتے ہیں۔ جب ظلمت پاش پاش ہوتی ہے اور سیاہی کی بوچھاڑ سنگریزوں کی طرح تاریکی کی تہوں میں لچکیلی تہوں میں، پھیلتی سکڑتی تہوں میں پھسلتے دھنستے وجود پر برس جاتی ہے۔

سیاہ دھوپ میں سیاہ بادل آتے ہیں اور کالی بارش اندھیر برستی ہے۔ اور لچکیلی نرم سیاہ تاریک سرنگوں میں پھسلتے وجود تاریک سیال اُگل دیتے ہیں۔ تاریکی میں تاریکی پھیل جاتی ہے۔ اور پھر جڑ جاتی ہے۔ اور ایک اور تاریکی آگے بڑھ آتی ہے۔۔۔۔ آہ نہ ہی میں انہیں سمجھا سکتا ہوں نہ ہی وہ سمجھ سکتے ہیں۔

اور یہ بات ہے اُس وقت کی کہ جب آواز بھی مجھ سے چھن گئی۔ میرے شور مردہ ہو گئے۔ باتیں خاموش ہو گئیں، سرگوشیاں دم توڑ گئیں۔

اُس لمحے اور یہی وہ لمحہ تھا۔ اتھاہ تاریک لمحہ۔ اندھیری ساعت۔ کالی گھڑی۔ وقت۔ سیاہ وقت۔ تاریک خلا میں بہتا وقت۔

اُس لمحے میں ایک نامعلوم شاہراہ کے کنارے کھڑا ہاتھ پھیلائے کسی رہنما ہاتھ کا منتظر تھا کہ وہ مجھے کسی دوسری نامعلوم شاہراہ تک لے جائے۔ میرے لیے مشفق ہاتھوں کی کبھی کوئی کمی نہ رہی تھی۔ ان گنت ہاتھوں کی نرم۔ سرد۔ گرم۔ کھردری۔ مضبوط۔ کمزور۔ کپکپاتی۔ بھیگی۔ خشک گرفتیں مجھے راہ دکھانے کے لیے ہر موڑ پر منتظر رہا کرتی تھیں۔

اور پھر وہ لمحہ اور وہ ہاتھ۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اُس سے کوئی بات کی تھی، میں ہمیشہ اپنے مہربانوں سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کیا کرتا تھا۔ تو میں نے اُس سے کوئی بات کی اور وہ حیرتناک واقعہ رونما ہوا۔ میں نے اُس کا ہاتھ تھاما تھا یا اُس نے میرا ہاتھ تھاما تھا میں نہیں جانتا لیکن وہ ایک منجمد یخ بستہ ہاتھ تھا، اچانک مجھے محسوس ہوا کہ اُس کی استخوانی انگلیوں نے کچھ تھام رکھا ہے جسے میرا ہاتھ تھامتے ہی اُس نے مجھے تھما دیا۔ کچھ سخت۔ بھاری اور اُس کے ہاتھ جیسا ہی منجمد۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے احساس ہی نہ ہوا کہ وہ اُس کے ہاتھ کا ہی حصہ ہے یا کچھ اور ہے۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اُس کی استخوانی اُنگلیاں میرے ہاتھ کی گرفت میں ایسے معدوم ہوئیں کہ جیسے کبھی وہاں تھیں ہی نہیں۔ انگلیوں کی ہڈیوں پر مڑھی کھال ہوا میں تحلیل ہو چکی تھی اور منجمد یخ بستہ تاریکی کا وہ پتھر ٹکڑا میری ہتھیلی پر بھاری رکھا تھا۔ میں نے ایک وحشت کے عالم میں تیزی سے اپنے دوسرے بازو کو حرکت دی تا کہ اُس سرد ہاتھ والے کو چھو سکوں۔ کوئی نہیں تھا۔ میں چاروں طرف دیوانہ وار گھوم گیا وہاں کوئی نہیں تھا۔ سناٹا تھا۔

میں نے ہتھیلی پر بوجھل رکھے تاریکی کے ٹکڑے پر انگلیوں کی گرفت واپس لانے کی کوشش کی تو میرے پوروں کی مشتاق لمسی آنکھیں اُس گاڑھے چپچپاتے سیال پر کُھل گئیں جو منجمد تاریکی کے اُس ٹکڑے کو تر کر رہا تھا اور ایک ہی لمحے میں انہوں نے دیکھ لیا (آہ۔ ''دیکھنا'') کہ وہ تازہ انسانی خون تھا۔

لیکن افسوس میں بتا نہیں سکتا۔ نہ میں سمجھا سکتا ہوں نہ وہ سمجھ سکتے ہیں نہ وہ جان سکتے ہیں کہ اندھیرے کو اندھیرے سے جاننے والے کی دہشت کیا ہوتی ہے۔ وہ کیسا رونگٹے کھڑے کر دینے والا خوف ہے جو تاریکی میں سرکتے پھرتے تاریک وجود کو گھیر لیتا ہے۔ جب اُس کی تاریکی کی حدود لامحدود دوسری تاریکی سے ایک ہونے لگتی ہیں۔ میں بتا نہیں سکتا۔

میں زور سے چیخا اور مجھے محسوس ہوا کہ میری اپنی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی۔ پھر ایک جنون کی کیفیت میں، میں اپنے جبڑوں اور زبان کو حرکت دیتا چلا گیا مگر عضلات کی لرزش کے سوا کچھ محسوس نہ کر سکا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سناٹا تھا اور ہاتھ میں دبوچا ہوا انسانی خون سے تر تاریکی کا پتھر ٹکڑا تھا۔ بوجھل۔ وزنی۔ ناقابل برداشت۔

اور پھر وہ آئے۔ پہلا۔ دوسرا۔ تیسرا۔ آگے سے۔ پیچھے سے۔ اوپر سے۔ نیچے سے۔ اور پھر میں نے اُن کی آواز سُنی۔ میں نے، جس کے کان اُس کی اپنی چیخ سننے سے عاری تھے، مکمل سناٹے میں اُن کی ٹھُش۔ ٹھُش کی آوازیں سُننے لگے اور وہ آئے۔ نوکیلے۔ کھردرے۔ سخت۔ ہلکے۔ بھاری۔ بہت بھاری۔ چٹانی۔ اینٹ کے ٹکڑے۔ اور کبھی محض ڈھیلے۔ اور پھر اتنے تیز دھار اور وزنی کہ ایک ہی ضرب میں ـــــــ آہ میں بتا نہیں سکتا سوائے اس کے کہ اُسی لمحے میرے جسم کے ہر مسام میں میرے پوروں کی آنکھیں کھلنے لگیں اور میں پتھر کی بریل میں لکھی صدیوں کی کتاب پڑھتا چلا گیا ـــــــــــــــ

نابینا لسانیات کی کلاس کے آخر میں ڈاکٹر فنگوش نے کہا ''کوئی سوال؟''

بسیرہ نے ہاتھ اُٹھایا 'سر میرا ایک سوال ہے۔'

'پوچھیں۔'

'سر کیا اندھے خواب دیکھتے ہیں؟'

'آ ـــ ہیں۔ ایس آں۔ دراصل۔ فعل دیکھنا کسی سطح پر بھی اندھوں کے بیانیے سے متعلق نہیں ہو سکتا۔'

'تو سر پھر اندھے خواب نہیں دیکھتے۔'

'نہیں۔ وہ صرف خواجتے ہیں۔ نابینا لسانیات ایک نیا ڈسپلن ہے شروع شروع میں ایسے مسائل پیدا ہوں گے ـــ جیسے خوابنا ایک مسئلہ ہے۔'

'تو آخر میں سر کیا سب مسائل حل ہو جائیں گے؟' چپلاس نے پوچھا۔

'یقیناً' ڈاکٹر فنگوش نے کہا اور کلاس کو ڈس مس ہونے کا اشارہ کیا۔

کلاس سے نکلتے وقت بسیرہ نے چپلاس کو دیکھا کہ وہ اُس سے کچھ گریزاں سا نظر آ رہا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔

'چپلاس میں چاہتی تھی ہم کہیں بیٹھیں۔ مگر تم شاید بھاگنا چاہتے ہو۔ کیا بات ہے چپلاس۔ کلاس میں بھی تم آج میرے قریب نہیں بیٹھے۔ جیسے میں کوئی سانپ ہوں۔'

'سچی' چپلاس ہنسا 'میرا خیال ہے میں ہمت کر کے تمہیں بتا ہی دوں۔ یہ کوئی خوشبو ہے جو تم استعمال کرتی ہو۔'

'میں کوئی خوشبو استعمال نہیں کرتی۔ مگر ـــ مگر شاید یہ اُس صابن کی خوشبو ہے جو میں کبھی کبھی استعمال کرتی ہوں۔'

'بس یہی خوشبو تمہارے اوپر ایک غلاف بنا لیتی ہے اور مجھے تمہارے قریب نہیں بیٹھنے دیتی۔'

'بس اتنی بات' بسیرہ قہقہے لگاتی ہے اور پھر یک دم خاموش ہو جاتی ہے 'چپلاس ایک بات بتاؤ۔'

'ہوں۔'

'اگر سانپ سانپ کو کاٹ لے یا چلو دونوں ایک دوسرے کو کاٹ لیں تو کیا دونوں مر جائیں گے؟'

چپلاس نے عجیب سی نظروں سے بسیرہ کی طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر ایک طرف چل پڑا۔ 'پتہ نہیں کیا بکواس کرتی رہتی ہے۔' وہ بڑبڑایا۔

بسیرہ عمارت سے باہر آ گئی۔ صبح سے ہونے والی بارش رُک چکی تھی۔ بادل چھٹ چکے تھے اور سہ پہر کی ترچھی دھوپ آدھے آسمان کو عظیم دائرے میں کاٹتی قوسِ قزح بنا رہی تھی بسیرہ مسکرائی اور رنگوں کو پہچاننے لگی سرخ۔ نارنجی۔ پیلا۔ سبز۔ نیلا۔ ارغوانی۔ بنفشی۔۔۔ سرخ۔ پیلا۔ نیلا۔ سبز۔ بنفشی۔ ارغوانی۔ نارنجی۔ سبز۔ نیلا۔۔۔۔۔۔۔۔

مُورا

گرم ہوا کا ایک منہ زور جھونکا زناٹے سے آیا اور گاؤں کی سنسان گلیوں کو چھیدتا گزر گیا۔ کنوئیں کی منڈیر کے سائے تلے بیٹھے ہانپتے ہوئے کتے کی زبان کچھ اور باہر نکل آئی اور اس نے کاہلی سے اپنے جسم کو نم آلود مٹی کی ٹھنڈک پر لمبا لمبا پھیلا دیا۔ پھر دردناک سی آواز میں کراہا۔ جیسے گرمی کی شدت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی اپنی سی حیوانی کوشش کر رہا ہو۔

منظور علی نے اپنا سفری بیگ ایک ہاتھ سے اُچکا کر دوسرے میں منتقل کرتے ہوئے کتے کی جانب دیکھا اور پھر گاؤں کی سُونی گلیوں میں نگاہ دوڑائی۔ "گرمیوں کی دوپہریں اور سردیوں کی راتیں ان گلیوں میں ایک جیسی ویرانی پھیلا دیتی ہیں"۔ اُس نے سوچا۔ "فرق صرف اتنا ہے کہ سردیوں میں کتے زیادہ مستعد ہو جاتے ہیں۔ شاید ٹھنڈ کی وجہ سے" ٹھنڈ سے اسے ٹھنڈے ملکوں کا خیال آیا اور پھر ٹھنڈے ملکوں کے کتوں کا۔ "اُن بے چاروں کو تو شاید کبھی ہانپنا نصیب نہیں ہوتا ہوگا۔ پھڑ پھڑاتی زبان باہر نکال کر پانی کے قطرے گرانے کی عیاشی اُن کی قسمت میں بھلا کہاں! یہ تو صرف ہمارے گرم کتے۔ گرم کتے مگر وہ تو کھائے جاتے ہیں HOT DOGS..." منظور علی چونکا اور ایک گھبراہٹ سی اُس پر طاری ہو گئی۔

"یہ میں کیا بکواس باتیں سوچ رہا ہوں۔ شاید سڑک سے گاؤں تک کی ڈیڑھ میل کی دھوپ اندر ہی اندر اپنا کام دکھا گئی ہے۔ اور مجھے لُو لگنے والی ہے۔ کوئی اسٹروک وغیرہ"۔ وہ گاؤں کی ایک گلی کا موڑ اتنی سرعت اور چھوٹے زاویے سے مڑا کہ اُس کا بیگ کچی دیوار سے زور سے ٹکرا گیا۔ چکنی مٹی اور بھوسے کے پلستر کا ایک بڑا سا ٹکڑا زمین پر آ رہا۔ اُس نے بیگ پھر اُچکا کر

دوسرے ہاتھ میں تھام لیا۔ اب اُسے دور سے اپنے گھر کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ دروازے سے عمودی باہر نکلے لکڑی کے ڈنڈے کی گولائی کو جیسے اس نے ابھی سے اپنے ہاتھ میں محسوس کرنا شروع کر دیا کہ کچھ دیر بعد اس نے اسے گھما کر دروازہ کھولنا تھا اور گھر میں داخل ہو جانا تھا۔

"ماں اپنی دوپہر تک کی مشقت کے بعد اب سو رہی ہوگی۔ باپ گھر پر نہیں ہوگا۔ کھیتوں پر ہوگا۔ گندم کے دانے سمیٹنے کے چکر میں لگا ہوگا۔ ماں میری آہٹ سُن کر جاگے گی اور وہ سب کچھ کرتی پھرے گی۔ جو دنیا بھر کی مائیں اپنے بیٹوں کی گھر آمد کے موقع پر کیا کرتی ہیں اُس کی خوشی پر مجھے دُکھ ہوگا۔ مجھے دُکھ ہو رہا ہے۔ میں اُسے کیسے بتاؤں گا کہ بڑا بننے اور معاشرے میں ایک باعزت مقام حاصل کرنے کا میرا تازہ منصوبہ بھی ناکام ہو چکا ہے۔ محکمہ کسٹم میں مجھے وہ پوسٹ نہیں مل سکی جو راتوں رات بندے کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ مجھے ایسا ہی رہنا ہے جیسا ہوں۔ جیسا تھا۔ ویسا۔ ایسا۔ جیسا۔ تیسا۔۔۔ ماں سو رہی ہوگی"۔ لیکتی لو کے ایک تھپیڑے نے منظور علی کے کانوں میں انگلیاں سی سلگا دیں۔

منظور علی کی ماں علاقے کی Living legend قسم کی ہستی تھی۔ پرانے وقتوں کی مڈل جے وی اُستانی جو مدتوں پہلے گاؤں کے سکول میں آئی تھی۔ علاقے کے بچوں کو علم کی بھٹی میں تپا کر ان پر جماعتوں کی مہریں لگاتے لگاتے وہ اُکتا گئی تو اُس نے گاؤں کے درمیانے درجے کے ایک زمیندار کے بڑے بیٹے سے شادی کر لی۔ پھر جیسے سب کچھ اس کا اپنا ہو گیا۔ وہ گاؤں۔ بچے۔ دھرتی۔ پھر اُسے اپنے کام میں کبھی اُکتاہٹ محسوس نہ ہوئی۔ تیس سال تک وہ علاقہ دولت پور کے نوخیز ذہنوں میں علم کی کاشت کرتی رہی۔ اُس کے لگائے ہوئے کئی بوٹے اب دولت۔ عزت شہرت اور اعلیٰ مرتبے کے میٹھے رس دار پھلوں سے لد چکے تھے۔ اور اُس کا اپنا بوٹا اُس کا منظور علی۔ اس کی اُٹھان دیکھ کر سب نے کہا "سیانی ماں کا بیٹا ہے۔ دیکھ لینا بہت اونچی شان والا ہوگا۔ ڈھیروں دولت لائے گا"۔ یہی وہ وقت تھا جب اُس بوٹے کی شاخیں گھنی تھیں پتے سبز اور شگوفے قوتِ نمو کی تاب نہ لا کر پھوٹتے چلے جاتے تھے۔ مگر پھر جانے کون سے موذی دھموں کی آکاس بیل اُسے چمٹی کہ اُس ہونہار بروا کے پات سوکھنے اور پیلے پڑنے لگے۔ اُس کے خیال کی جڑیں کلراٹھی زمینوں کے شور تک پہنچیں تو پھل کچے گرانے لگا۔

"چند قدم اور۔ پھر میں گھر کے اندر" گھر کا دروازہ اب منظور علی کے بالکل سامنے

تھا۔ اس نے پیشانی سے آنکھوں کی طرف بہتے پسینے کو میلی چکٹ ہتھیلی سے پونچھا اور قدم آگے بڑھایا۔ "کھٹ۔ کھڑ۔ دھم۔ دھڑاک" پڑوس کا ایک دروازہ دھماکے سے کھلا اور چلچلاتی دھوپ میں اُٹھتے منظور علی کے پاؤں وہیں رُک گئے۔

کھلے دروازے کی چوکھٹ میں علے ماچھی کی لڑکی رضیہ کھڑی کسی کتے کی طرح ہی ہانپ رہی تھی۔ مگر اس کی زبان نہیں بلکہ آنکھیں باہر کو نکل رہی تھیں۔ آنکھیں جن میں بے بسی، خوف اور کسی ناگہانی آفت کی پرچھائیاں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ شکر دوپہر کی آنچ میں تپتا منظور علی کا جسم کسی منحوس خبر کو سننے کے انتظار میں تن گیا۔ اس نے حیرت اور اضطراب سے چوکھٹ کے فریم میں سِٹل لڑکی کو دیکھا۔

"وہ مر گیا"۔ لڑکی کے منہ سے لفظ پھٹ کر نکلے اور پسینے سے شرابور قمیض میں اُس کا پنڈا ہاڑ کے سینک میں لرزنے لگا۔

"تم۔ رضیہ! تم ہوش میں تو ہو؟ کیا ہوا؟ کیا بات ہے"؟ خیر تو ہے؟ کون مر گیا۔"

منظور علی نے بیگ ایک طرف رکھتے ہوئے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

لڑکی نے جیسے پہلی بار اُسے دیکھا۔ "تم۔ تم باؤ منظور کب آئے شہر سے۔ وہ مر گیا۔ میں نے اُسے مار ڈالا۔ ہائے لالہ تو میری ہڈیاں توڑ دے گا۔ وہ ڈنگر ڈاکٹر کے پاس گیا ہے"۔

"میں ابھی آ ہی رہا ہوں شہر سے۔ تم پتہ نہیں کیا کہہ رہی ہو۔ کیا ہوا ہے؟ کچھ بتاؤ۔ صاف صاف بتاؤ"۔

"اندر۔ اُدھر" لڑکی نے صحن کی طرف اشارہ کیا اور جھٹکے سے اندر کو مُڑ گئی۔

گوبر اور بھینس کے پیشاب کے آمیزے کی مانوس بُو۔ پھونس کا چھپر۔ کُھرلی کے پاس بوجھل کھڑی بھینس، بکھرا ہوا چارہ، دیواریں۔ منظور علی نے سوالیہ نظروں سے رضیہ کی طرف دیکھا جو پھٹی پھٹی نظروں سے ایک طرف گھورے جا رہی تھی۔

اور پھر اُس نے اُسے دیکھ لیا اور دیکھتے ہی جان لیا کہ وہ مر چکا ہے۔ دیوار کے پاس ایک بچھڑے کا مردہ جسم چمکتی دھوپ میں آڑا ترچھا پڑا تھا۔ اُس کے ادھ کھلے منہ سے جھانکتے دانتوں اور گدلے پردوں سے ڈھکی بے نور آنکھوں پر مکھیاں بھن بھنا رہی تھیں۔ نرم بھورے بالوں سے ڈھکا اُس کا کچا جسم یہ ظاہر کر رہا تھا کہ زندگی اور موت کے درمیان اُس نے چند دن

سے زیادہ کا فاصلہ طے نہیں کیا۔

منظور علی نے قدرے اطمینان کا سانس لیا۔ ''میں تو کچھ اور ہی سمجھا تھا۔ ویسے یہ مر گئی کیسے''؟

''میری وجہ سے۔ میں کر ماں ماری 'بسیلا' چننے چلی گئی۔ نور شاہ کی گندم کل کٹی تھی۔ میں نے سوچا بہت سے سٹے گرے ہوں گے پیچھے۔ چُن آؤں۔ لالچ کیا۔ اِدھر یہ بندھا رہا دھوپ میں۔ ساری دوپہر۔ واپس آئی ہوں تو یہ۔ لالہ بھینس کے لئے دوا لینے گیا تو کہنے لگا ''کہیں جانا ہو تو اسے چھپر کے نیچے باندھ کر جانا''۔ ہائے وہ تو میری ہڈیاں توڑ دے گا''۔

منظور علی نے سوچا کہ یہ بس اب رو دی کہ رو دی۔ اُس نے اپنے آپ کو بے انتہا احمق محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ آخر ہو اکیا۔ اچھا چلو میری ماں کو بتاؤ''۔

سفر کی تکان اور گرمی کی شدت نے منظور علی کو ادھ موا سا کر رکھا تھا۔ کھانا کھانے کے دوران وہ بیزاری سے ماں اور رضیہ کے جذباتی مکالمے سنتا رہا۔ پھر اُٹھا اور عجلت سے کمرے کے کونے میں رکھی چارپائی پر بچھ گیا۔ ماں نے اُس کی طرف پیار سے دیکھا اور وہ اُمید بھرا سوال کیا جس کا وہ پہلے سے منتظر تھا۔

''کیا بنا پُتّر''

''کچھ بھی نہیں'' اُس نے زہر آلود لہجے میں کہا اور کروٹ بدل کر منہ دیوار کی طرف کر لیا اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی ماں کی آواز کچھ ڈھ سی گئی۔ پھر باہر کی آوازیں جیسے اُس سے دور ہوتی چلی گئیں وہ سکڑنے اور اپنے اندر گھسنے لگا۔ مگر وہاں تو ماضی کی دھول میں ہزاروں عنوانوں کی تصویروں اور آوازوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔

بچپن۔ ماں۔ گاؤں کا سکول۔ ماں کا سکول۔ شہر۔ کالج۔ کلاسیں۔ ڈگریاں۔ دوست۔ انٹلیکچول بحثیں۔ ناکامی۔ پہلی۔ دوسری۔ تیسری۔ کتابیں۔ اور کتابیں۔ اور کتابیں۔ بیزاری۔ مایوسی۔ لاتعلقی۔ مزید کتابیں۔ اپر ڈویژن کلرک۔ ماں کی امیدیں۔ باپ کا غصہ۔ آرزوئیں۔ زنجیریں۔ کچھ نہیں۔ "I don't care a damn"

''تمہارے اندر Talant تو بہت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم اُسے کسی مقصد پر Focus نہیں کر سکتے''۔ جمیل نے کہا۔ ''پتہ نہیں Talent ہے یا نہیں۔ درحقیقت کوئی بھی

مقصد کوئی بھی منصوبہ لمبے عرصے تک میرے اوپر اپنی گرفت قائم نہیں رکھتا۔ یہ کیریئر وریئر بنانے کا ہر نیا منصوبہ میرے اندر صرف ایک وقتی جوش پیدا کرتا ہے اور پھر آپ ہی آپ مرنے لگتا ہے۔ جیسے بیج اُگنے سے پہلے ہی سڑنے لگے''۔

''قصور بیج کا ہے یا مٹی کا''؟

''پتہ نہیں''۔

''ایسا کرو کمپیٹیشن کا امتحان دے ڈالو''۔

''ہونہہ کیا فائدہ۔ مجھے اپنے سٹیٹس کو چھت پر چڑھانے سے کوئی دلچسپی نہیں''۔

''تمہارا دماغ خراب ہے''۔

علے ماچھی کی بھینس کا دھوپ میں مرا پڑا بچھڑا۔ رضیہ کی ٹوٹتی ہڈیاں۔ میری ہڈیوں میں گھستی چارپائی کی رسیاں گرمی۔ بہت شدید ہے۔

منظور علی بے چینی سے چارپائی پر کسمسایا اور پھر تھکے جسم کو نیند نے آ لیا۔ اُس کے شعور کا شوروغوغا مدھم پڑتا گیا۔ وہ سو گیا اور شام تک سوتا رہا۔

اُسی شام علے ماچھی کے گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ گلی سے گزرتے وقت منظور علی نے نسوانی چیخیں۔ مردانہ گالیاں اور بھینس کی ڈکاریں بیک وقت سنیں تو سمجھا کہ بچھڑے کی موت کے المیے کا ڈراپ سین رضیہ کی ہڈیاں ٹوٹنے کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہوگا۔ وہ لپک کر علے کے گھر میں داخل ہوا۔

گاؤں کے چند لوگ صحن میں کھڑے تھے اور مردہ بچھڑا ابھی تک وہیں پڑا تھا۔ صرف دھوپ اب غائب ہو چکی تھی۔ کھال کی اکڑن اور آنکھوں کی دھندلاہٹ میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ سمیت پہلے سے بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ ایک کونے میں رضیہ منہ بسورے کھڑی تھی اور علا ہاتھ میں لوہے کی ایک زنگ آلودسی بالٹی تھامے بھینس کی پچھلی ٹانگوں کے قریب اکڑوں بیٹھا کسی مکڑے کی طرح اُچھل اُچھل کر کوئی ایسا زاویہ دریافت کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو بالٹی کو اُس کی رانوں میں اور ہاتھ کو بھینس کے تھنوں تک پہنچا سکے۔ اُس نے ایک بار اور کوشش کی۔۔۔ تھنوں پر انسانی ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہی بھینس غضب ناک ہو کر ڈکرائی۔ اپنے بھاری بھرکم وجود کو جھٹکتی ہوئی ایک طرف کو ہٹی تو گردن میں پڑا سنگل زور سے کڑکڑایا اور ساتھ ہی علے کی

گھٹی سی چیخ بلند ہوئی۔ بھینس کا پاؤں اُس کے انگوٹھے کو کچلتا گزر گیا تھا۔ ایک دیوانگی سی علے پر طاری ہوگئی اُس نے بالٹی ایک طرف کو پھینکتے ہوئے ایک سوٹا اُٹھایا اور بے تحاشہ بھینس پر برسانے لگا۔

"بس کراوئے علمیا۔ پاغل دیا پُترا۔ اُس کا اندر تو پہلے ہی ہلا ہوا ہے اور اوپر سے لگا ہے تو سوٹے مارنے۔ کیا اِسے بھی ہاتھ سے گنوانے کا ارادہ ہے۔ ہٹ پیچھے"۔ حنیفا گوجر علے کے ہاتھ سے سوٹا چھینتے ہوئے دھاڑا۔ بھینسوں کی امراض زنانہ اور اطلاقی نفسیات کا ماہر ہونے کی حیثیت سے وہ کافی دیر سے وہاں کھڑا تمام صورتحال کا ناقدانہ جائزہ لے رہا تھا۔

"بھینسوں۔ بھینسوں میں فرق ہوتا ہے۔ یہ تو بڑی کوڑی بھینس ہے۔ پسمانہ تو ایک طرف یہ تو تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگانے دے گی تھنوں کو"۔

"اُس کی ماں۔۔۔ علے نے گالیوں کا رُخ پہلے بھینس اور پھر رضیہ کی طرف موڑنے کے بعد کربناک آواز میں کہا "سال بعد کٹے نے کچھ نہیں تو دو ہزار میں بکنا تھا۔ پر اُس رجو کی۔۔۔ کٹا بھی گیا ہاتھ سے اور اب یہ بھینس اڑی کر رہی ہے۔ اُس کی۔۔۔۔۔"

چل بس کراوئے۔ گند نہ بک زیادہ۔ کرتے ہیں کچھ ابھی۔ کٹا مر گیا تو کیا ہوا۔ اُسے تو مرنا ہی تھا۔ گرمی تھوڑی ہے۔ حشر کی گرمی ہے۔ یہ گرمی تو بندے مار دیتی ہے۔ کیوں باؤ منظور! تو علمیا فکر نہ کر۔ بھینس کو کرلیں گے سوتر۔ سب اڑی نکال دیں گے اُس کی۔ مُورا بنالیں گے"۔ حنیفے نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "چل پُتر رضیہ بھاگ کر جا۔ فضلے مثلی کو بلا لا۔ کہنا کٹا مر گیا ہے۔ بھینس اڑی کرتی ہے۔ مُورا بنانا ہے۔ جلدی آئے"۔

"یہ مُورا کیا ہوتا ہے چاچا"۔ رضیہ کے جاتے ہی منظور علی نے حنیفے گوجر سے پوچھا۔

"واہ باؤ منظور واہ!۔ پنڈ کا جم پل ہوتے ہوئے بھی تمہیں نہیں معلوم۔ دیکھو پُتر جی! بھینس جب کوئی جاء شاء جنتی ہے ناں تو دودھ دوہنے کے لئے پہلے اُسے چھوڑتے ہیں تھنوں پر کہ دھاریں لے اور بھینس کو پسما بھی دے۔ بعد میں اُسے ہٹا کر دودھ لو دودھ جتنا مرضی۔ پر اگر قضا الٰہی سے جاء جائے مر تو پھر بھینس دودھ تو نہیں دوہنے دیتی۔ ناں۔ ناں۔ ناں۔ بہت اڑی کرتی ہے۔ پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتی"۔ حنیفے نے ایک لمبا سانس لیا اور اپنی ڈرامائی تقریر جاری رکھی۔ "سیانے اب یہ کرتے ہیں کہ کٹا کٹی جو بھی ہو اُس کی کھلوی اُتار کر اُس میں بھس بھر کے

ایک جھوٹ موٹ کا بچھڑا بنا دیتے ہیں اور دودھ دوہنے سے پہلے اُسے بھینس کے قریب کھڑا کر دیتے ہیں۔ اُس کے منہ کے قریب کرتے ہیں۔ تھنوں کے پاس کرتے ہیں۔ بھینس رام ہو جاتی ہے۔ سمجھتی ہے اصلی ہے اب دودھ لو دودھ جتنا مرضی اللہ اللہ خیر صلاً سمجھ گئے!"

"سمجھ گیا"۔ منظور علی نے رُک رُک کر کہا۔ "پر چاچا بھینس کو اصلی نقلی کا پتہ نہیں چلتا"؟

حنیفے نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ "تم باؤ لوگ بھی مزے کی باتیں کرتے ہو۔ وہ تو ڈنگر ہے پُتر۔ حیوان مال اُس میں اتنی عقل کہاں۔ عقل تو اللہ تبارک تعالےٰ نے ہم انسانوں کو دی ہے"۔

منظور علی گھر سے نکلا تو اس ارادے سے تھا کہ پرانے دوستوں سے گپ لگائے گا ذرا گھومے پھرے گا۔ مگر اُس شام علے ماچھی کے گھر رونما ہونے والے واقعات نے اُسے سحر زدہ سا کر دیا وہ مبہوت ہو کر بچھڑے کی کھال اُترنے سے لے کر اُس کی بھس بھری حیات نَو تک کے تمام مراحل دیکھتا رہا اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ افریقہ کے کسی گھنے ڈراؤنے جنگل میں ہونے والی وحشی اقوام کی کسی خونی جادوئی رسم کا نظارہ کر رہا ہو۔ اُس نے کراہت اور نفرت آمیز خوف سے اوجھڑی۔ انتڑیوں اور بدبو دار گوشت کے غلیظ ڈھیر اور بھس اور کھال سے بنی اُس بدہیت شے کو دیکھا جو کسی طرح بھی بھینس کا زندہ یا مردہ بچھڑا معلوم نہیں ہو رہی تھی۔

"بس ٹھیک ہے۔ لے چلو اب"۔ وچ ڈاکٹر نے نعرہ لگایا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں حنیفا گوجر اور فضلا مثلی مُورا پکڑے ماہرانہ آہستگی سے بھینس کی طرف بڑھے جس کی دودھ کی تھیلی جیسے اب پھٹ پڑنے کو تھی اور جس کی رگیں اپنی ہی تخلیق کے دردناک بوجھ سے اینٹھ رہی تھیں ان دونوں نے مشاکانہ پھرتی سے مُورا بھینس کے منہ کے قریب رکھا اور پیچھے ہٹ آئے۔ بھینس نے خشمگین نظروں سے اُن کی طرف دیکھا اور اپنے بڑے سے سر کو زور سے جھٹکا۔

اب کیا ہوگا۔ اب کیا ہوگا۔ منظور علی کے ذہن میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔

بھینس کی تھوتھنی مُورے کے قریب آئی تو اُس کے ناس سے اُٹھتی کسی باس کے اثر سے اُس کے نتھنے زور سے پھڑ پھڑانے اور اُس کا سر وہیں ساکت ہوگیا۔۔۔ ایک لمحہ۔ دوسرا، تیسرا۔ کئی لمحے گزر گئے اور پھر منظور علی نے بھینس کے پورے جسم کو ایک حیرتناک تبدیلی سے

گزرتے دیکھا۔ اُس کا تنا ہو جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔ دم نیچے کو گر گئی ڈکاروں کی بجائے اُس کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی اُس نے اپنی لمبی زبان آہستگی سے باہر نکالی اور تجلیجی کھال اور بُھس کے اُس بدصورت مجسمے پر پھیرنے لگی۔

''بالٹی لے آ اب''۔ حنیفے نے علمے ماچھی کو حکم دیا۔

علما جیسے پہلے ہی بالٹی سے لیس تیار بیٹھا تھا۔ انگوٹھے کے درد سے لنگڑاتا وہ کسی زخمی چور کی طرح ٹیڑھا میڑھا ہوتا نہایت احتیاط سے بھینس کی طرف بڑھا اور ڈرتے ڈرتے ہاتھ تھنوں کی طرف پھیلا دیا۔

مگر وہاں اب کوئی احتجاج نہ تھا۔ کوئی بغاوت، کوئی اضطراب، کوئی وحشت۔ کوئی غم و غصہ، کچھ بھی نہیں۔

رات گئے منظور علی گھر لوٹا تو ماں اُس کا انتظار کر رہی تھی اور باپ بھی چارپائی پر نیم دراز اُس کا منتظر تھا۔

''اتنی دیر کہاں لگا دی پُتر'' ماں نے پوچھا۔

''میں اُدھر علمے کی طرف تھا۔ وہ بنا رہے تھے۔ کیا کہتے ہیں اُسے مُورا''۔

''اور تم وہاں شوق سے انہیں گند بکھیرتے دیکھتے رہے۔ دودھ دوھ لیا انہوں نے''۔ باپ نے پوچھا۔

''ہاں''۔

''میں تمہارے لئے روٹی لاؤں''۔ ماں نے پوچھا۔

''جی''۔

''کیا سوچ رہے ہو۔ چُپ چُپ کیوں ہو''۔

''کچھ نہیں ماں''۔

''سنا ہے تمہارا کام نہیں بنا۔ اِس بار بھی''۔ باپ نے بجھتی چلم کا لمبا سوٹا لگاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بنا تو کون سی آفت آ گئی''۔ منظور بُڑبڑایا۔

''لو روٹی کھالو''۔

''اچھا''۔

''اِدھر آ کر بیٹھو میرے پاس''۔ باپ نے چارپائی پر اُس کے لئے جگہ بناتے ہوئے کہا۔

''اچھا''۔

''پُتر! یہ مجسٹریٹ کیسے بنتے ہیں۔ وہ ملکوں کا منڈا ہے نا ارشد۔ تمہاری ماں نے پانچ کرائی تھیں اُسے۔ سُنا ہے مجسٹریٹ لگ گیا ہے''۔

''وہ ایک امتحان ہوتا ہے۔ پاس کرتے ہیں اُسے''۔ منظور علی نے پھنستے ہوئے نوالے کو معدے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

''سولہ جماعتوں کے بعد بھی امتحان''؟

''علم کوئی سولہ جماعتوں میں تھوڑا ختم ہو جاتا ہے''۔ ماں نے اپنے نیم خواندہ خاوند کو سچائی واضح کرنے والے انداز میں کہا۔-----

''کمپیٹیشن کا امتحان دے ڈالو''۔ جمیل نے کہا۔

''کیا فائدہ۔ مجھے اپنا سٹیٹس چھت پر چڑھانے سے کوئی دلچسپی''۔

''تمہارا دماغ خراب ہے''۔

''اتنا پڑھ کر بھی تم نے نبیڑا کچھ نہیں پتر۔ آٹھ دس ہزار روپے مہینہ تو مجیدا کریانے والا بھی بنا لیتا ہے۔ میری طرح کا کورا اَن پڑھ''۔ باپ نے بجھے حقے کی نال کو مایوسی سے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''بس اب زیادہ پریشان نہ کرو اُسے۔ ایسی باتوں سے۔ واپس کب جا رہے ہو بیٹا''؟

''کل ماں۔ دو بجے والی بس سے''۔

گاؤں کی گلیاں آج بھی سنسان تھیں۔ فراٹے بھرتی آگ لگی ہوا میں لرزتے بوڑھے پیپل کے پتوں کو دیکھ کر منظور علی کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے بچپن کی سب چڑیلیں پھر سے زندہ ہو کر اِٹھلاتی پھر رہی ہوں۔ بیگ ہاتھ میں لٹکائے وہ بوجھل قدموں سے گاؤں سے سڑک

کی طرف جاتے ڈھول سے اٹے رستے پر گھسٹتا رہا۔

"بس وقت پر مل جائے تو چار بجے تک شہر پہنچ جاؤں گا۔ اور کل پھر وہی سب کچھ جو کہ تھا اور ہوتا رہے گا۔ گدھ کے سر والے سپرنٹینڈنٹ کی غلیظ آنکھیں میز پر INاور OUT کے پھندے۔ چھٹی۔ شام۔ دوست۔ کتابیں۔ منظور علی نارمل ہو رہا تھا۔ صلاحیتوں۔ اعتماد۔ علم۔ دریافت کے خشک ہوتے ہوئے چشمے پھر سے پھوٹے تو ذہن کے مرگھٹ میں بھسم گزشتہ ناکامی کی راکھ کو بہالے گئے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی اُس خاکستر میں سے "کچھ کر گذرنے" کے بوٹے نے جنم لیا۔

"کیوں نہ میں یہ امتحان دے ہی ڈالوں"۔ اُس نے سوچا اور پھر چند ہی فرلانگ کی مسافت میں اُس کے ذہن کا بوٹا میٹھے رس دار پھلوں سے لد گیا۔ وہ گھنے ٹھنڈے سایوں میں چلتا رہا۔ آسودگی سے۔ راحت سے۔ اردگرد سے بے نیاز۔ تب اُس نے ہاتھ بڑھایا اور پھل توڑنا چاہا۔ مگر جیسے اُس نے ناگ پھنی کے زہریلے کانٹوں میں ہاتھ ڈال دیا تھا اور پھر جھلس جانے کے ایک اذیت ناک احساس نے اُسے اندر کی ٹھنڈی چھاؤں سے اُٹھا کر باہر کی تپتی دھوپ میں لا پٹخا۔

"کیسی جہنمی گرمی ہے"۔ وہ جیسے آہنی خود اوڑھے تانبے کی جوتیاں پہنے پگھلے ہوئے لاوے پر چل رہا تھا۔ "آج ضرور کچھ ہو کر رہے گا۔ تم آسمان پر پہنچنا چاہتے تھے۔ شاباش! نہیں ہرگز نہیں! مجھے کسی شے سے کوئی دلچسپی نہیں۔۔۔ کوئی منصوبہ اپنی گرفت زیادہ دیر میرے اوپر قائم نہیں رکھ پاتا۔ جیسے بیج اُگنے سے پہلے ہی سڑنے لگے۔ قصور بیج کا ہے یا مٹی کا۔ تمہارا دماغ خراب ہے"۔

اُس کے جسم کا رُواں رُواں آگ آگ ہو رہا تھا۔ اُس نے گھبراہٹ اور سراسیمگی سے ہتھیلی اپنے چہرہ پر پھیری۔ کھال لجلجی اور ڈھیلی ہو رہی تھی۔ جیسے گوشت کھال سے جُدا ہو کر پلپلا ہو رہا ہو۔ اُس کے ذہن پر غبار سا چھانے لگا اور ریڑھ کی ہڈی میں اینٹھن کا احساس جاگ اُٹھا۔

"اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟ کیسی گرم ہے یہ لُو۔ ایسی گرمی تو پہلے کبھی نہ تھی۔ کہیں مجھے سن اسٹروک تو نہیں۔ اسی گرمی نے تو علے ماچھی کے بچھڑے کو۔۔۔ بچھڑے کو۔۔۔ یہ گرمی تو بندے مار دیتی ہے باؤ منظور"!

اور پھر اُس لمحے جب آگ برساتے آسمانوں اور دہکتے انگاروں کا بستر بنی زمینوں کے بیچ سب کچھ چاٹ جانے والے شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ اُس کے سُلگتے شعور کے دھوئیں میں سینکڑوں ہزاروں ورچ ڈاکٹر نمودار ہوئے اور ایک ہی وحشت ناک لفظ کی ڈراؤنی تال پر رقص کرنے لگے۔ مُورا۔ مُورا۔ مُورا۔!!

اُلجھن

دریا کا پاٹ اُس جگہ وسیع تھا اور کنارے ٹوٹ پھوٹ کر سرمئی ریت کے لاتعداد ٹاپوؤں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ دریا اپنے لمبے بازوؤں میں رواں تند دھاروں اور مدھم خرام لہروں کو گیلی رات کے ان تکونے جزیروں کے گرد پھیلائے آگے اور آگے کو بہے جاتا تھا۔

آبی زندگی کی مہک سے زندہ ہوا، سرکنڈے، ناڑ، کاہی اور پچھی کے پودوں میں سے سرسراتی گزری تو سفید بگلوں کی ایک قطار گھنی نرسلوں میں سے اوپر کو اُٹھتی چلی گئی اور پھر آسمان پر تیرتی کالی بدلی کے سامنے سیپوں کے ہار کی طرح کھُل گئی۔ بدلی بھٹک کر سہہ پہر کے سورج کے سامنے آئی تو کالے موڑ سے لے کر بنسی پور کے پتن تک پھیلے مٹیالے پانیوں پر گہرا سایہ اُتر آیا اور دور درختوں کے جھنڈ روشن سبز ہوگئے۔ ریت پر بچھی گیلی مٹی کی مہین تہہ پر پاؤں اُٹھاتے کچھوے نے اپنی لمبوتری گردن باہر نکال کر خوفزدہ آنکھیں چاروں طرف گھمائیں اور شڑاپ سے پانی میں رینگ گیا۔ اُتھلے پانی میں زقندیں بھرتے پُونگ کے جھرمٹ میں ہل چل سی مچی تو مدتوں سے فضا میں ایک ہی جگہ معلق ہو کر گھات لگاتا جامنی پروں اور سُرخ چونچ والا ٹوبہ پتھر کی طرح پانی میں گرا اور تڑپتی مچھلی چونچ میں دبائے پنکھ پھیلاتا نیلے آسمان میں اُٹھ گیا۔

''شاوا بھئی جواناں۔ شاوا تیرے''۔ تاجے ماہی گیر کے چھوٹے بیٹے جاموں نے دل ہی دل میں ٹوبے کو داد دی۔

''تُو بڑے فائدے میں ہے۔ نہ تجھے جال پھینکنے کا فکر۔ نہ لاں باندھے کی مصیبت۔ نہ کنڈی نہ ڈوری۔ بس آیا۔ نشانہ باندھا اور یوں۔۔۔۔۔'' جاموں نے دو انگلیوں کی چونچ بناتے ہوئے منہ سے زور سے ٹرچ کی آواز نکالی۔

تاجے نے غصے سے جاموں کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ تو منہ سے آوازیں کیا نکال رہا ہے''۔

''کچھ نہیں ابا۔'' جاموں نے کھسیانا سا ہو کر کہا اور پھر جلدی سے ایک اور کلبلاتا کینچوا مٹی کی کُجی سے نکال کر کانٹے پر منڈھنے لگا۔

''کام کر دھیان سے کام۔'' تاجے نے لاں ریت پر پھیلاتے ہوئے پھر جاموں کو مخاطب کیا۔ ''یہ اب عمر نہیں ہے تیری مسخریاں کرنے کی۔ پورے پندرہ ورے کا ہو جائے گا تو اگلے جیٹھ میں۔ پُورا مرد!۔ اور حالت دیکھ اپنی۔ آدھی کنڈیاں ابھی خالی پڑی ہیں اور ایسے لگاتے ہیں کینچوا۔ تجھے کتنی بار کہا ہے آدھا کینچوا باہر لٹکتا نہ چھوڑا کر۔''

جاموں نے تڑپتے کینچوے کے باقی ماندہ جسم کو اپنی لیس دار انگلیوں میں دباتے ہوئے کانٹے کی نوک آگے کو دھکیلی اور منہ پھیر کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ کینچوا اب ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ''بس بس تُو تو مرا ہی ہے پر ساتھ ایک آدھ مچھلی کو بھی تو لے مرے گا۔''

جاموں نے اگلے کانٹے کو پکڑنے کے لئے ڈوری اپنی طرف کھینچی اور آہستگی سے اپنا سر گھٹنوں میں سے اوپر کو اُٹھاتے ہوئے دور کالے موڑ کی طرف سے آنے والے پانی کی طرف دیکھا جہاں آدھے دریا پر ابھی تک بادل کا سایہ لرز رہا تھا۔

''آدھے دریا کو سردی لگتی ہے اور آدھے کو گرمی۔'' جاموں نے دوسرا ہاتھ کینچوؤں کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ تب اچانک اُسے بڈھے فیروز کا وہ فقرہ یاد آ گیا جسے وہ ہر شام اپنی جھونپڑی میں آن دھمکنے والے لڑکوں بالوں کے پُراشتیاق متجسس کانوں میں گزرے وقتوں کے سورما شہزادوں اور چاند ایسے مکھڑوں والی پھول شہزادیوں، ظالم جادوگرنیوں، خونخوار اژدھوں اور جنگل بیلے کے شرشرار کی حیرت ناک کہانیاں پھونکتے پھونکتے اُس وقت خاص طور پر دُہرایا کرتا تھا جب اُس کی داستاں کا کوئی کردار، اپنی ہی ہونی کے چکر میں گرفتار۔ مارا مارا پھرتا کسی دریا کی اُور جا نکلتا۔

''شہزادے نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تین کوس نکل گیا۔ سوچتا تھا اب تو ویری پیچھے رہ گئے۔ ایک پہر کا سفر اور۔ اور پھر منزل پر جا پہنچوں گا۔ گھوڑا دوڑاتا آگے کو بڑھا تو کیا دیکھتا ہے کہ بیابان میں ایک دریا بہتا ہے۔ پر نہ کوئی پتن ہے۔ نہ ملاح۔ نہ کشتی اور چوڑا اتنا کہ دوسرا کناہ

بھی مشکل سے نظر آتا ہے۔ بڑا حیران پریشان ہوا۔ یاالٰہی یہ کیا مصیبت کھڑی ہوگئی۔ پرتم جانو۔۔۔۔۔"

بڈھا فیروز داستان کے اُس موڑ پر پہنچ کر چلم کا سوٹا لگا کر یک لخت خاموش ہو جاتا۔ اور سب لڑکے سہم کر جان جاتے کہ اب اگلا فقرہ کیا ہوگا۔

"پرتم جانو کہ دریا میں بڑے بڑے بھید ہیں۔ بڑے بڑے اسرار اور بڑی بڑی مخلوقات۔"

جاموں کی اُنگلیاں ایک میکانکی تسلسل سے کینچوے، کانٹے اور ڈوری کے گُھنجل سے اُلجھنے میں مصروف تھیں مگر آنکھیں بدستور آتے جاتے پانی کے ساتھ ہلکورے لے رہی تھیں۔

ایک بریتے سے دوسرا بریتہ۔ ریتے سے ٹکراتی لہریں۔ ریت پر پھسلتی ست ست لہریں۔ لہروں پر جُھکے سرکنڈے۔ لہروں سے منجدھار۔ آگے کو آگے کو۔ بھاگو پانی۔ بھاگو۔ بھاگتے رہو۔ چتن۔ چتن سے پھر کالا موڑ۔ یہ کینچوا بھی مر گیا۔

"اب آگے بھی چل مر۔ گھنٹے سے بیٹھا ایک ہی کنڈی سے کھیل رہا ہے۔ اُدھر دریا میں تمہاری کوئی لگتی بیٹھی ہے۔ جب دیکھو بوتھا اُٹھا کر اُدھر دیکھتا رہتا ہے۔ جب دیکھو....."

باپ کی آواز سنتے ہی جاموں نے یوں گبھرا کر اپنا سر گھٹنوں میں چُھپا لیا جیسے کسی نے اُسے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو۔ اُس نے ریتلی مٹی میں آدھے دھنسے اپنے بھورے پاؤں کو غور سے دیکھا اور پھر انگوٹھے اور انگلی کے درمیان پھنسی خشک مٹی کی چھوٹی سی ڈلی کو آہستگی سے باہر نکال کر ریزہ ریزہ کرنے لگا۔

"بادشاہزادہ دل میں کہنے لگا۔ یا مولا۔ اب تو تُو ہی ہے کہ غیب سے کوئی امداد کرے اور جان بچے۔ ورنہ بچتی نظر نہیں آتی۔ پیچھے موڑوں تو دشمن۔ آگے جاؤں تو دریا کہ جسے پار کرنے کی کوئی سبیل نہیں۔ جاؤں تو جاؤں کہاں۔ تو شہزادہ بس ایسے ہی کھڑا تھا اور جی اپنا ڈانواں ڈول کرتا تھا کہ اتنے میں آواز آتی ہے۔ "شہزادے او شہزادے تجھ پر کیا افتاد پڑی ہے کہ یوں حیران پریشان کھڑا ہے۔" شہزادے نے گھوم کر جو دیکھا تو اُس کا تو بھئی پتہ پانی ہو گیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ دریا سے ایک عورت سر نکالے ٹکر ٹکر دیکھ رہی ہے۔ پر عورت بھی کیسی کہ سر عورت کا ہے اور دھڑ مچھلی کا ہے۔!

"سر عورت کا دھڑ مچھلی کا۔" لڑکوں نے خوفزدہ حیرانی سے سرگوشی کی۔

"مورکھو۔ وہ عورت نہ تھی اور نہ ہی مچھلی۔ وہ تو بلھن تھی بلھن۔ دریائی عورت۔ اوپر کا جسم عورت کا نچلا مچھلی کا۔ صدقے جاؤں اُس پاک پروردگار کے کیسی کیسی مخلوقات پیدا کی ہیں۔"

اِس کے بعد کا قصہ بہت طولانی تھا۔ بلھن ہزار جان سے شہزادے پر عاشق ہو کر اور پھر ملنے کا وعدہ لے کر اُسے دریا پار کراتی ہے اور یوں جب شہزادہ دشمنوں سے جان بچا کر آگے بڑھتا اور پھر انوکھے دیسوں کی طلسماتی مہمات سر کرتا ہی چلا جاتا تو رات آدھی بیت جاتی اور چھوٹے لڑکے اونگھنے لگتے۔

جاموں اپنی دھوتی سمیٹتا اُٹھ کھڑا ہوا اور گُجی کو ٹھوکر مار کر ایک طرف لڑھکا دیا۔ جواب خالی تھی۔ سب کینچوے کانٹوں میں پروئے جا چکے تھے۔ اور لاں اب بالکل تیار تھی۔

"چل پُتر میرا۔" تاجے نے شفقت سے جاموں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "باقی کام بھی نبیڑ لیں فٹافٹ۔ اندھیرا ہونے والا ہے۔"

تاجے نے لاں کا ایک سرا اور لکڑی کا کھونٹا ہاتھ میں تھاما اور تیزی سے قدم اُٹھاتا دریا کے ان ٹاپوں کی طرف بڑھنے لگا۔ جن کے بیچوں بیچ بہتے دریا کے گدلے اندھیروں میں سانس لیتی گہرے پانی کی مچھلیوں کی راہ میں آج بھی اُس نے رات بھر کے لئے مردہ کینچوؤں میں چھپے پھندوں کا وہ جال حائل کرنا تھا۔ ڈوری آگے کو گھسٹنے لگی اور کانٹے سرکنڈوں کے تیز دھار پتوں سے اُلجھتے پھنستے آگے کو اُچکنے لگے۔ جاموں لاں کا دوسرا سرا ہاتھ میں تھامے منتظر کھڑا رہا۔ پھر ڈوری اچانک تن کر سرکنڈوں سے اوپر کو اُٹھی تو سرا اُس کے ہاتھ سے نکلتے نکلتے رہ گیا۔ اُس نے لپک کر قدم اُٹھایا اور گیلی ریت میں اوپر کو رستے پانی میں غائب ہوتے اپنے باپ کے قدموں کے نشان پر اپنا پاؤں اتار دیا۔ پھر دوسرے نشان کو چھو لینے کے لیے اُس نے پاؤں آگے کو بڑھایا تو اُسے اپنی ٹانگ لمبی لمبی کھینچ کر آگے کو لے جانی پڑی۔ ڈوری کے تناؤ کو برقرار رکھتے ہوئے وہ کسی دو ٹانگوں والے کیکڑے کی طرح لمبے ڈگ بھرتا آگے کو بڑھنے لگا۔

لاں کے دونوں سروں کو کھونٹوں سے باندھ کر آر پار کناروں کے قریب گہرا گاڑنے کے بعد وہ دونوں واپس لوٹے تو شام کا ملگجا غبار ہر شے پر اُترنے لگا۔ دریا کا ہر ایک وجود تاریکی کے سمندر میں تحلیل ہونے سے پہلے اپنی ہیئت تبدیل کر رہا تھا۔

"دریا میں کیا بڑے بھید ہیں اور کونسی ایسی بڑی مخلوقات ہیں۔" جاموں نے ناڑے ایک اونچے پودے کو کوئی دیوہیکل مخلوق جان کر ٹھٹھکتے ہوئے سوچا۔

دریا میں کچھ بھی نہیں۔ بس مچھلیاں ہیں۔ ملی۔ شنگاری۔ رھو۔ ترکنڈا۔ پری۔ سول۔ تھیلا۔ مہاشیر اور دوسری۔ کچھوے ہیں اور پلیتر۔ بلاؤں جیسے بڑے بڑے کچھوے جو کنڈی کو منہ مارنے کے بعد پوری کی پوری لاں ساتھ گھسیٹ لے جاتے ہیں۔ اور بلھن بلھن۔

اچانک کسی انوکھے خیال کی رونے جاموں کو سُن سا کر دیا۔ اُس نے بے اختیار ہو کر خوفزدہ لہجے میں باپ سے پوچھا۔

"ابا بلھن کینچوے تو نہیں کھاتی؟"

وہ اب بنسی پور کے ارد گرد پھیلے درختوں اور جھینگروں کی زن زن سے گونجتے کھیتوں میں سے گزر رہے تھے۔ جاموں کا عجیب و غریب سوال سُن کر تاجا پہلے تو ٹپٹایا۔ پھر ہنسا۔ پھر حسبِ معمول جھنجھلاہٹ اور غصہ اُس پر غالب آ گیا۔

"سودائیوں کی طرح اٹھے اٹھ نہ مارا کر جاموں۔ کبھی کوئی ڈھنگ کی بات بھی کیا کر۔ مجھے سب پتہ ہے کون تجھے یہ پُٹھی پٹیاں پڑھاتا ہے۔ پر بڈھے فروجے کو تو حرامدیاں کھانے اور نشہ کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ اُسے تو چاہیں تیرے جیسے پاگل۔ سُن رہا ہے؟"

"جی" جاموں نے مری مری سی آواز نکالی۔

"تجھے کوئی فکر بھی ہے کہ نہیں۔ تو کوئی بالکا نہیں اب۔ ان چار کنڈیوں سے کام نہیں چلتا اب۔ اس سال بھی جو پیسے پورے نہ ہوئے اور ٹھیکیدار سے بڑا جال ڈالنے کا سودا نہ ہوا تو سمجھ لو بیٹھ گیا بھٹھا۔ اکبرا اب گھر بار والا ہو گیا ہے۔ اُسے اور بھی بڑے فکر ہیں۔" مگر جاموں نے جی میں سوچا کہ اُس کا بڑا بھائی اکبر تو مزے کرتا ہے۔ اُس کا کام تو بس اتنا ہے کہ صبح سویرے مچھلیوں کی ٹوکری سائیکل پر لاد کر پاس کے قصبے میں جائے اور گلی گلی گھوم کر بیچ ڈالے۔ پتہ نہیں کتنے پیسے کماتا ہے اور کتنوں سے طرح طرح کی چیزیں کھاتا ہے۔

"..... میرا اب کیا ہے میں آج مرا تو کل دوسرا دن۔ کام تو اب تجھے سنبھالنا ہے"

گاؤں پہنچے پر بھی تاجے کی بڑبڑاہٹ جاری رہی۔

"پر تجھے کیا۔ تجھے کوئی ہوش بھی ہو۔ خبردار جو گیا اُس بڈھے کی طرف۔ ٹانگیں توڑ دوں گا تیری۔"

لیکن ہر رات کی طرح آج رات بھی جب اکبرے نے باپ سے مچھلیوں کی فروخت کے حساب کتاب پر تُو تکار کرنے کے بعد اپنی گھر والی کو اپنے ساتھ کوٹھری میں دھکیل کر اندر سے کنڈا بند کر لیا۔ جب تاجا چلم بھرنے کے لئے بجھتی آگ میں انگاریاں کریدنے لگا تو جاموں نے سوچا کہ گھر میں اب اُس کا کوئی کام کوئی مطلب نہیں۔ وہ خاموشی سے اُٹھا اور صحن کے کونے میں روتی بلیوں کو باہر نکالنے کے بہانے خود بھی گھر سے باہر نکل گیا۔

بڈھے فیروز نے سائیں کی قبر کے پاس اُگنے والی چار پتری تُخل بھنگ کے ابلے ہوئے پتوں کو دوری میں خوب گھوٹنے کے بعد اُسے تانبے کی مُٹھ لگائی اور لہک لہک کر گانے لگا

گھوٹ گھوٹ پیتیاں

اساں رب نال گلاں کیتیاں

جھونپڑی کے پاس آہٹ سُن کی اُس نے تان ادھوری چھوڑی اور دروازے میں کھڑے جاموں سے کہا۔

"آ گیا بچہ۔ آ جا اندر۔ بیٹھ جا ادھر۔"

جاموں خاموشی سے پھونس کی جھونپڑی میں بچھے پیال کے فرش پر بیٹھے لڑکوں کے پاس بیٹھ گیا۔ جو لالٹین کی مدھم روشنی میں دلچسپی سے سردائی بننے کا نظارہ کر رہے تھے۔

"ہاں تو کون لائے گا آج ولایتی کھانڈ کی چٹکی۔ تو جا رحمت۔ جا پُتر شاباش۔ بھاگ کر واپس آنا۔"

اور پھر جب بڈھے فیروز کا ذہن نشے کی ترنگ میں بہکتے بہکتے اور بھی بھک سے اُڑنے لگا تو پھونس کی غلیظ کٹیا کی جگہ عالی شان محلات، خوفناک غاروں اور ناقابلِ تسخیر قلعوں نے لے لی اور ان ہونی کے اک دم ہو جانے پر ہر طرف پھیلنے والی نشہ آور دھند میں پریوں کی سرگوشیاں سُنائی دینے لگیں۔

رات آگے کو بڑھی کتھا تمام ہوئی اور لڑکے ایک ایک کر کے گھروں کو رخصت ہوئے تو فیروز نے حیرانی سے جاموں کی طرف دیکھا جو ابھی تک چپ چاپ جھونپڑی میں بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے جاموں۔ جانا نہیں تم نے گھر۔"

"جاتا ہوں۔ میں نے ایک بات پوچھنی ہے۔" جاموں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"کیا بات۔" بڈھے فیروز نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

"بابا" جاموں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے راز دارانہ انداز میں سرگوشی کی "بابا۔ بکھسن نظر کیوں نہیں آتی۔ کہاں نظر آتی ہے۔"

بڈھے فیروز نے ایک بے ڈھنگا قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا۔ پھر آواز کو اک دم پُر اسرار بنا کر کہنے لگا۔

"کملیا۔ بکھسن تیرے میرے جیسوں کو نظر نہیں آتی۔ ہاں۔ جھلا نہیں تو۔ وہ تو بڑے نصیب والوں کو نظر آتی ہے۔ بڑے بھاگ والوں کو۔ چل اُٹھ جا۔ بھاگ جا گھر کو۔"

"اور جسے نظر آ جائے۔" جاموں نے پیال سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ۔ وہ..... اُس کے بس نصیب جاگ جاتے ہیں۔ بھاگوں والا ہوتا ہے وہ اور کیا۔" بڈھے فیروز نے منطق کے استاد کی طرح استدلال کرتے ہوئے کہا۔

دریا کی لہروں پر پھیلتا۔ کانٹوں اور ڈوریوں سے اُلجھتا گھنی نرسلوں میں سرسراتی ہوا میں سانس لیتا۔ بڈھے فیروز کی جھونپڑی میں دم سادھتا۔ بنسی پور کے جاموں کا دن کل کی رات میں ڈوب گیا۔ کل آج میں بدلا۔ اور آج کل میں اور پھر دنوں کے سلسلے لاں کی ڈور پر بندھے کانٹوں پر کینچوؤں کی طرح لپٹتے چلے گئے۔

اسوج سے کاتک آیا اور کاتک سے مگھر۔ اور پھر پوہ ماگھ کا کڑکڑاتا جاڑا دھرتی پر اُترا تو دریا اپنے ایک ہی دھارے میں سکڑ کر ٹھٹھرتا بہنے لگا۔ تھوڑے پانی میں مچھلیاں بہت ہو گئیں، لیکن تاجے ماہی گیر کا نصیبہ نہ جاگ سکا۔ جاموں کی ماں زہرباد کا شکار ہو کر دوسرے جہاں کو رخصت ہوئی۔ اور اکبرے کی گھر والی کے پھولے پیٹ میں کلبلاتی زندگی نے آسانی سے اس جہاں میں آنے سے انکار کر دیا تو دور بڑے شہر کے ڈاکٹر تاجے کا باقی جمع جتھا بھی چاٹ گئے۔ وہ راتوں کی تاریکی میں چوری چھپے دریا میں گھگھری جال پھینکتا تو دریا کی ہر جھاڑی ٹھیکیدار کا

بھوت بن کر اُسے ڈراتی۔ جاموں ویران گھر سے غائب ہو کر اور ہر شے سے لاتعلق ہو کر اپنی متلاشی نگاہیں اور مضطرب ٹانگیں لیے پہروں دریا کے ریتلے کناروں۔ گھنی جھاڑیوں اور اُتھلے پانی کی چھپڑیوں کی بھول بھلیوں میں کسی جل ککڑی کی طرح چکرایا کرتا۔ چیت بیساکھ کے مہینے آئے۔ جاڑا گیا اور گرمی آئی تو جاموں نے مُرغابیوں کی ڈاروں کو اُڑ اُڑ کر آسمانوں میں اوجھل ہوتے دیکھا۔

جیٹھ کی اُس شام کو دریا پھر جوبن پر تھا۔ دور دیس کے پہاڑوں سے آتے پانیوں نے اُس کے سوکھے بازوؤں میں قوت کی نئی لہریں دوڑا دی تھیں۔ اور اُس نے ریتلے ٹاپوں کو پھر سے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

لاں باندھنے کے بعد اور جاموں کو بریتے پر بیٹھا چھوڑ کر تاجے کو گاؤں لوٹے اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایک ہی جگہ دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد جب جاموں کی ٹانگوں میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور خالی خالی نظروں سے کالے موڑ کی طرف دیکھنے لگا۔

"پانی۔ پانی۔ صرف پانی اور کچھ بھی نہیں۔" اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

پھر اچانک جب شام کی ترچھی روشنیوں نے چند لمحوں کیلئے مٹیالی لہروں کو روشن کیا تو اُس کی تھکی بوجھل نگاہیں تیزی سے سکڑیں اور دور دریا میں تیرتی، ہچکولے کھاتی۔ آگے بڑھتی کسی شے پر مرکوز ہو گئیں۔ تب اُس کا دل زور سے دھڑکا اور سانس حلق میں اٹکنے لگی۔

"شہزادے او شہزادے۔ تو کیوں حیران پریشان کھڑا ہے۔ نہیں۔ نہیں" جاموں نے پھر بددلی سے سوچا۔ "کچھ نہیں۔ یہ بھی دریا میں بہتی ہزار لکڑیوں۔ سرکنڈے کے گٹھوں۔ گھاس پھونس اور گندبل میں سے کوئی شے ہوگی۔"

تب جاموں کو کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کب اور کیسے دریا کے درمیان والے بڑے بریتے کے اُس کنارے تک جا پہنچا جس کی سیدھ میں وہ بے آواز تیرتی آ رہی تھی۔

سب سے پہلے اُس نے اُس کے بال دیکھے۔ گھنے۔ لمبے۔ سیاہ بال۔ جو لہروں سے دُھلے اُس کے اُجلے چہرے کے گرد بل کھا کر پانی میں کاہی کی کالی جڑوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں یوں بند تھیں جیسے سو رہی ہو۔ لیکن ہونٹوں پر ایسا تبسم جیسے ابھی جاگ کر ہنس کر آنکھیں کھول کر حیران کر دے گی۔

اور پھر آگے کو بہتے پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ اپنا لمبا سفر جاری رکھنے کی بجائے وہ جیسے دم لینے کو رُک گئی۔ اُس کا سر ریتے کے ساتھ آن لگا۔ دریا کی لہریں اُس کے کسی ان دیکھے اشارے پر پیچھے کو ہٹیں تو گدلے پانی کے مہین پردے کے نیچے اُس کا پورا جسم ڈھلتی شام کی مدھم روشنی میں چمک اُٹھا۔

اُسی لمحے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے جاموں کا دھڑکتا جسم کانٹے میں تڑپے جانے والے کینچوے کی طرح بل کھانے لگا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے دریا اپنا بہاؤ چھوڑ کر اُلٹا بہنے لگا ہو اور جیسے خونخوار پلیتروں نے اُس کی ٹانگیں اپنے جبڑوں میں دبوچ لی ہوں۔

دریائی عورت کے خوبصورت چہرے کے نیچے اُس کی کٹی چھاتیوں سے رستا خون دریا کے مٹیالے پانی کو بھورا سُرخ کر رہا تھا۔ کسی مُردہ مہاشیر مچھلی کی طرح ریت پر پڑے اُس کے جسم پر بنے زخموں کے نشان ریت اور دریائی مٹی سے مندمل ہو رہے تھے۔

جیٹھ کی اُس شام جب دُور پچھمی کی جھاڑیوں کے پیچھے مرتا سورج مغربی افق پر خون کے چھینٹے بکھیر رہا تھا۔ بنسی پور کے گاؤں کی طرف بھاگتے جاموں کے قدموں کا فاصلہ اپنے باپ کے قدموں کے فاصلے سے بھی بڑھ گیا۔

دس لاکھ میں ایک

وہ صبح بھی ویسی ہی تھی جیسی کہ صبح جو کل تھی!

مملکت کے سب معمولی لوگوں کی طرح الیاس مبین کے دن کا آغاز بھی آدھی رات کی تقویم سے نہیں بلکہ سورج کی صبح سے ہوتا تھا۔ دھند آلود کٹیلی سردی، زرد گرم دھوپ اور ترچھی برستی بارش کی صبح جو مملکت کے سب لوگوں کو دہلا کر اُن کے سہمے ہوئے دھڑکتے دلوں میں، غسل خانوں، بھیگتے مساموں، کُند بلیڈوں، نیم پختہ ناشتوں اور بوٹ پالشوں کا ایک طوفان برپا کر دیتی تھی۔ پھر میلے کاغذوں کا ایک پلندہ صبح کے اُس طوفان میں نمودار ہوتا تھا اور دھڑکنوں میں ہر طرف تازہ اخبار کی پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ ساتھ۔ "شروع کرو۔" "تیار ہو جاؤ۔" کی صدائیں بلند ہونا شروع ہو جاتی تھیں۔

الیاس نے دیکھا کہ میز پر پھیلے اخبار کا ایک کونا تلے انڈے کی پلیٹ میں گھس کر انڈے کی زردی کے اوپر بیٹھ گیا ہے اور چکنائی چوس چوس کر رنگ بدل رہا ہے۔ اُس نے تیزی سے پلیٹ کو اپنی طرف کھینچا اور تلے انڈے کی اوپری جلد چٹکیوں سے نوچ نوچ کر نیچے پھینکنے لگا۔ سامنے بیٹھی بیوی اور بچے نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"کاغذ تو پاک ہوتا ہے ابو۔!" بچے نے کہا۔

"آدھا انڈا ضائع کر دیا۔ صاف ستھرا کاغذ ہی تو تھا۔" بیوی نے کہا۔ الیاس نے حلق میں لایعنی سی خرخراہٹ پیدا کی اور کہا "آدھا نہیں۔ صرف چھیواں حصہ بلکہ ایک بٹا سینتالیس۔" پھر ماتھے پر بل ڈال کر اتنے غور سے اخبار دیکھنے لگا جیسے کالموں میں کوئی نجاست یا پلیدگی ڈھونڈنا چاہتا ہو۔ کسی سور کی جلد۔ کسی کُتے کا بال۔ کسی شیطان کی تھوک یا شتونگڑوں کا پیشاب۔ ڈبل

روٹی کے ٹکڑے نگلنے کے ساتھ ساتھ اُس نے فلمی اشتہاروں کی نیم برہنہ عورتوں کو بیزاری سے دل ہی دل میں برہنہ کیا پھر چھوٹی سرخیوں کی طرف بڑھنے کے بعد انڈا منہ میں ڈال لیا۔

''انڈا تلنا! اس طرح کہ جلے بھی نہیں اور زردی سخت بھی نہ ہو۔ ایک چھوٹا سا راز ہے جس کو استعمال کر کے بیوی کو ہر صبح ایک گہرے فخر کا احساس نصیب ہوتا ہے۔ ایسا ہی احساس مجھے اُس وقت ہوتا ہے جب میں بے ربط اعداد کے مجموعے کو کامیابی سے یقین کے فارمولوں میں بدلتا ہوں۔''

''ضلعی خبریں۔ اداریہ۔ سب کچھ معمول کی اوسط کے عین مطابق ہے۔ اشتہارات بھی وہی ہیں اور تلاش گم شدہ کا یہ اشتہار بھی معمول کے مطابق ہے۔ لوگ گم ہوتے رہتے ہیں۔۔ کہیں کھو جاتے ہیں۔ غائب ہو جاتے ہیں یا پتہ نہیں کیا ہوتا ہے کہیں اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں۔ پھر اُن کے متعلق اشتہار آتے ہیں۔ گھر واپس آ جاؤ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ آخر کہا بھی کیا جا سکتا ہے۔ اطلاع دینے والے کو بھاری انعام کا لالچ۔ بھلا کتنا بھاری۔ علاوہ خرچہ آمدورفت۔ فلاں بن فلاں اتنے عرصے سے لاپتہ ہے۔ رنگ گندمی اُس پتے پر اطلاع دیں۔ تصویر میں کیسا بنا ٹھنا بیٹھا ہے۔ کب اتروائی ہوگی اُس نے یہ تصویر۔ شناختی کارڈ کے لئے۔ کسی کو بحیثیت خاوند اپنا آپ پسند کروانے کے لئے۔ یا شاید ویسے ہی۔ زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ ویسے ہی۔ دائیں جبڑے پر زخم کا نشان۔ اُس تصویر کے جبڑے پر تو زخم کا نشان نظر نہیں آ رہا۔ لوگوں کو چاہیے کہ اپنی ایک آدھ نمائندہ تصویر ایسی بھی بنوا لیا کریں جو ان کی گمشدگی کے بعد تلاش کے اشتہار میں دی جا سکے۔ یا پھر بندے کے منہ متھے کا خطِ اوسط سے انحراف ہی اتنا زیادہ ہو کہ ہر تصویر ہی شناختی تصویر بن سکے۔''

قانون امکان۔ اوسط۔ خط اوسط سے انحراف!

مملکت کے دو ایک نظام کی شماریات معلوم کرنے والے ادارے میں دس سال تک ملازمت کرنے کے بعد ہر شے اور ہر عمل کا خطِ اوسط سے انحراف معلوم کرنا۔ جونیئر اسٹیٹیسٹیکل آفیسر الیاس مبین (ایم ایس سی اسٹیٹس) کی عادت ثانیہ بن چکا تھا۔

یہ چہرہ تو ایسا نہیں کہ آسانی سے پہچانا جا سکے۔ کسی کو نظر آ بھی گیا تو پھر بھی۔ جبڑے پر زخم آخر کیسے آیا ہوگا۔ کھیل کود کے دوران۔ لڑائی بھڑائی۔ کوئی حادثہ۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ

کوئی حادثہ۔''

''آپ اخبار ہی چاٹتے رہیں گے یا دفتر بھی جائیں گے۔'' بیوی نے برتن سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

الیاس نے اطمینان سے گھڑی پر سات بج کر تیرہ منٹ دیکھا اور اُٹھ کھڑا ہوا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے اپنے سراپے کا تنقیدی جائزہ لیا۔ کلین شیوڈ چہرے کو پسندیدگی سے دیکھا۔ ان چند بالوں کی موجودگی پر پھر حیرت کی جو دو بار شیو کرنے کے باوجود غائب نہیں ہوتے تھے۔ پھر معمول کے مطابق آفٹر شیو لوشن کی شیشی کھول کر بائیں ہتھیلی پر چھ قطرے گرائے اور دائیں ہاتھ کی انگلیاں خوشبودار جراثیم کش سیال میں تر کر کے انہیں چہرے کی جلد پر احتیاط سے پھیرنے لگا۔ ''جس رفتار سے یہ لوشن میں استعمال کر رہا ہوں اُس حساب سے چھٹیاں نکال کر یہ ابھی مزید 47 دن چلے گا۔'' اپنے اِس یقین سے ایک تقویت انگیز لطف حاصل کرتے ہوئے اُس نے اپنے جبڑے کو مزے سے سہلایا۔ ''میرے جبڑے پر زخم کا کوئی نشان نہیں۔''

''اخبار سنبھال کر رکھنا میں واپس آ کر دیکھوں گا۔'' اُس نے بیوی سے کہا۔ پھر ہر صبح کی طرح اُس صبح بھی اُس نے بریف کیس سنبھالنے سے پہلے دن کا پہلا سگریٹ سلگایا۔

ٹھیک ساڑھے سات منٹ بعد جب یہ سگریٹ ختم ہوگا تو میں گلی سے نکل کر سڑک پر پہنچ چکا ہوں گا۔ پھر میں ایک ہی جھٹکے میں سگریٹ کے ٹوٹے کو نکڑ پر بنے گٹر کے تنگ منہ میں پھینکنے کی کوشش کروں گا۔ تیزی سے چلتے چلتے۔ بازو کی ایک قوسی حرکت سے سگریٹ کے ٹوٹے کو کسی گٹر کے تنگ منہ کے اندر ڈال دینے کا امکان اگرچہ ہزار میں ایک ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ آج میں کامیاب ہو جاؤں۔''

الیاس مبین اُس صبح بھی ٹوٹے کو گٹر کے منہ کے اندر پھینکنے میں کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ یہ بھی معمول کے مطابق تھا۔ اُسی طرح جیسے اُس کا بس سٹاپ پر کھڑے ہو کر ایک منٹ میں تین بار گردن کو ساٹھ کے زاویے پر بائیں گھمانا اور ہر آتی بس کے ماتھے پر 50 کا نمبر پہچاننے کی کوشش کرنا معمول کے مطابق تھا۔

7 بج کر 22 منٹ۔

"50 نمبر کی بس کے لئے مجھے اوسطاً 12:57 منٹ تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اور ابھی صرف سات منٹ گزرے ہیں۔ الیاس نے اطمینان سے گھڑی دیکھتے ہوئے سوچا۔ سامنے نظر دوڑا کر اُس نے سڑک کے پار مخالف سمت کے بس سٹاپ پر کھڑے کچھ لوگوں کو پہچانا۔ پھر اور بائیں طرف دیکھا۔ قصائی کی دکان پر اُلٹے ٹنگے تین سر کٹے بکرے۔ بالٹیوں میں پانی اور پانی میں تیرتی کلیجیاں۔ پھیپھڑے۔ دل۔ اوجھڑیاں جو الیاس مبین کو نظر تو نہ آتی تھیں مگر اُس کے خیال کے مطابق وہیں تھیں اپنے اپنے مقام پر۔ "وہی منظر ہے۔ معمول کا۔ منظر وہی رہتا ہے صرف بکرے بدل جاتے ہیں۔" مزید بائیں طرف پھلوں کی ریڑھی۔ حاجی اسٹیل ورکس۔ لوہے کے جنگلے۔ فریم، سائنٹیفک بیکری... بیکری کا مالک... کیک... پیسٹریاں.. بسکٹ... کچھ اور بائیں طرف... کنکریٹ کا تھڑا... تھڑے پر بیٹھا ایک آدمی... لاثانی جنرل مرچنٹس... یہ کیا... تھڑے پر بیٹھا آدمی... بیٹھا آدمی۔ وہ آدمی جو تھڑے پر بیٹھا سامنے دیکھ رہا ہے... وہ آدمی۔!"

زندگی میں پہلی بار جونیئر اسٹیٹکل آفیسر الیاس مبین (ایم۔ایس۔سی اسٹیٹ) نے اپنی سکس بائی سکس نظر اور بے خطا حافظے پر شک کیا۔ "کیا یہ محض نظر کا دھوکہ ہے۔ وہم ہے یا کچھ اور۔ یا پھر وہ شخص جو اِس وقت سائنٹیفک بیکری اور لاثانی جنرل مرچنٹس کے درمیان تھڑے پر بیٹھا ہے۔ وہی ہے جس کی تصویر آج صبح میں نے گمشدگی کے اشتہار میں دیکھی تھی۔ یہ ناممکن ہے! یا پھر انتہائی کم ممکن Highly Improbable ایسے کسی واقعے کا امکان تو 10 لاکھ میں ایک سے بھی کم ہوگا۔ مگر وہ شخص جو سائنٹیفک بیکری اور لاثانی جنرل مرچنٹس کے درمیانی تھڑے....."

سات بج کر تیئس منٹ اور سات بج کر چوبیس منٹ کے درمیان کا کوئی سیکنڈ یا مائیکرو سیکنڈ ایک پاگل لمحہ تھا۔

ایک ایسا لمحہ جو عظیم شہر کے شوریلے پس منظر کے مخالف اپنے وجود کو برقرار رکھتے، کسی شخص کے توازن کو برباد کر سکتا ہے۔ جس میں پس منظر اور پیش منظر ایک دوسرے کی مخالف سمت میں زقند لگاتے ہیں اور سب کچھ اُتھل پتھل ہونے لگتا ہے۔

تھڑے پر آدمی کو دیکھنے۔ گم شدہ کی پہچان کا پہلا خفیف احساس ہونے۔ احساس کے بڑھنے۔ تیزی سے سڑک پار کرنے۔ دائیں جبڑے پر زخم کا نشان ڈھونڈنے اور پھر انتہائی غیر امکانی کے امکانی میں بدلنے پر ایک پاگل لمحہ محیط تھا۔

الیاس مبین نے جانا کہ وہ صبح کی دھوپ میں کھڑا گِن گِن کر سانس لے رہا ہے۔ بریف کیس کے ہینڈل پر اُس کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ وزن غائب ہو چکا ہے۔ ٹریفک کا شور بے حد بلند ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ سب آوازیں صاف اور بالکل جدا جدا ہیں۔ پاؤں کے تلوے جرابوں کو گیلا کر رہے ہیں اور خشک حلق میں دل اُچھلتا ہے! ذرا سی حرکت نہیں ذرا سی جنبش نہیں۔ نہیں تو کچھ ہو جائے گا۔!

پھر آپ ہی آپ حلق کے عضلات اپنے آپ کو تر کرنے کے لئے متحرک ہوئے تو سب کچھ پیچھے کو پلٹ گیا۔ ہر احساس کا عکس لوٹ آیا اور آنکھوں میں وہ آدمی جو کنکریٹ کے تھڑے پر بیٹھا لاتعلقی سے صبح کے ہجوم کو تکے جا رہا تھا۔

"یقیناً یہ وہی شخص ہے۔ شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں۔ زخم کا نشان بھی واضح ہے۔ میرا حافظہ اتنا کمزور نہیں ہو سکتا۔" الیاس نے بریف کیس کے وزن کو پھر سے محسوس کرتے ہوئے سوچا۔

"یہ وہی ہے۔ مگر وہی ہے تو پھر کیا؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ مجھے تو دفتر پہنچنا ہے۔ 50 نمبر کی بس!"

جونیئر اسٹیٹسٹیکل آفیسر الیاس مبین نے اپنی نظریں تھڑے پر بیٹھے آدمی پر جمائے رکھیں اور تیزی سے اپنا رویوں کا کٹیلاگ کھنگالنے لگا مگر وہاں ایک بھی کارڈ ایسا نہ تھا، جس پر اس انوکھی صورتحال سے نپٹنے کی ترکیب درج ہوتی۔ "گم شدہ مشتہر کئے گئے افراد سے اتفاقیہ ملاقات ہونے پر اختیار کی جانے والی تدابیر" یہ عنوان کہیں بھی موجود نہ تھا۔

"ہو سکتا ہے یہ سرے سے وہ آدمی ہی نہ ہو کوئی اور ہو۔" الیاس پھر تذبذب کا شکار ہونے لگا۔ "ہو سکتا ہے وہی ہو۔ نہیں وہی تو ہے۔ اِس کے دائیں جبڑے پر زخم کا نشان ہے۔ دائیں پر ہے یا بائیں پر۔ یہ میرا دایاں ہے اُس کا دایاں کون سا ہوگا۔ جس زاویے پر وہ بیٹھا ہے اُس کا دایاں وہی ہے جہاں زخم... بایاں... دایاں میرے خدا کیا ہو رہا ہے۔ سب کنفیوز ہو رہا

ہے... کچھ اور نشانیاں بھی تو درج تھیں کیا تھیں؟... عمر... قد'' ''مجھے فوراً ایک اخبار خریدنا چاہیے۔ سیدھی سی بات ہے پہلے ذہن میں نہیں آئی۔''

''ایسے موقعوں پر سب سے پہلے وہ اخبار پھر حاصل کریں جس میں اشتہار چھاپا گیا ہے۔'' کی تدبیر نمبر 1 مرتب ہونے پر الیاس مبین کا یقین اور صورتحال پر قابو پانے کا احساس لوٹ آیا۔

''شناخت'' وہ بڑبڑایا۔ ''شناخت بنیادی چیز ہے۔ پہلے اس کا یقین ہو پھر کوئی اگلا قدم اٹھایا جائے۔'' اُس نے احتیاط سے اپنی نظر تھڑے پر بیٹھے شخص پر سے ہٹائی اور دس بارہ دکانیں دور ایک سائن بورڈ ''تازہ اخبار، رسائل، کتابیں'' کی طرف دیکھا ور ساتھ ہی الیاس مبین (ایم۔ایس۔سی) کے چہرے پر ''ابھی پکڑا جائے گا'' کی پُر اعتماد مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ اُس نے سائنٹیفک بیکری اور لاثانی جنرل مرچنٹس کے درمیانی تھڑے کی طرف اُس طرح دیکھا جس طرح اونچی چھلانگ لگانے والا کھلاڑی اُس نشان کو دیکھتا ہے جو اُس کے ٹارگٹ سے بہت نیچا رہا ہو۔

''ابھی سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ اشتہار پھر سے دیکھنا چاہیے۔'' الیاس نے سوچا اور اپنے قدم تیزی سے بک سٹال کی طرف بڑھانا چاہے۔ مگر وہ ایک قدم بھی نہ اُٹھا سکا۔

شاید وہ صبح الیاس کے لئے حیرت اور ناممکن کی صبح تھی اور وہ گھڑی اُس کے منطقی شعور کو مسمار کرنے والی تھی۔ گم شدہ سمجھے گئے شخص میں رونما ہونے والی تبدیلی اُس کے لئے اتنی ہی غیر متوقع اور اچانک تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ گم شدہ کی شناخت کو کبھی یقینی نہیں بنا سکے گا۔

تھڑے پر بیٹھا آدمی آگے کو سرکا اور شہر کی فٹ پاتھ پر اُتر آیا۔

''عمر پینتیس سال۔ رنگ گندمی۔ قد پانچ فٹ چھ انچ۔ یقیناً یہی لکھا تھا اشتہار میں۔ میری یادداشت اتنی غلط بھی نہیں ہو سکتی۔ کاش مجھے وہ اشتہار دوبارہ دیکھنے کی مہلت مل جاتی۔ مگر یہ کہیں رُکے بھی تو۔ پتہ نہیں کس شیطان کی روح اس میں حلول کر گئی ہے مسلسل چلا جا رہا ہے۔ بھاگے جا رہا ہے۔ رنگ گندمی... قد پانچ فٹ چھ انچ۔ یا شاید سات انچ۔ جبڑے کا نشان۔

نشان کی تو تصدیق ہوگئی تھی۔ پچھلے چوک میں، میں اُس کے اتنے نزدیک ہوگیا تھا کہ چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر اُسے چھو بھی سکتا تھا۔ مگر میں نے اُسے چھوا نہ تھا زخم کا نشان دیکھا تھا۔ اور نشان واقعی تھا۔ دائیں جبڑے پر۔ نہیں بائیں جبڑے پر۔ دائیں۔ میرے خدا میں کس جنجال میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے چاہیے تھا کہ فوراً اُسے روک لیتا۔ روک لیتا تو پھر کیا ہوتا؟'' الیاس مبین کا ذہن اُس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ ''ایسا شخص پہچانا جائے تو فوراً روکنے کی کوشش کریں...'' کی ممکنہ تدبیر نمبر 2 مرتب نہ ہو پانے پر اُس نے مضطرب ہو کر اپنی کلین شیوڈ ٹھوڑی اس مضبوطی سے تھامی جیسے اُسے جبڑے سے اُکھیڑ دینا چاہتا ہو۔ آفٹر شیو لوشن کی کمزور سی لپٹ انگلیوں سے اُڑ کر نتھنوں تک پہنچی تو اُس نے خوشبو کی مانوسیت کو اپنے بھوکے پھیپھڑوں میں کھینچ لیا۔ ''پیلے رنگ کا یہ لوشن چھٹیاں نکال کر ابھی چالیس دن اور چلے گا۔ پینتالیس دن؟ تیس دن؟۔ جونیئر اسٹیٹسٹیکل آفیسر کا شماریاتی ذہن ڈولنے لگا۔ جانی پہچانی خوشبو کی ڈور نے جسم میں اُتر کر بکھرتے ریشوں کو پھر سے باندھا اور آنکھیں تیزی سے آگے بڑھتے اُس شخص کی پشت پر جمی رہیں جو اب عظیم شہر کے ایک اور چوک کو عبور کر کے کسی اور سمت مڑ جانے پر آمادہ نظر آتا تھا۔

عظیم شہر ویسا ہی تھا جیسا کہ عظیم شہر جو کل تھا۔

وہ جو ابھی نہیں ہیں اور مردوزن کی گہری بافتوں میں آدھے خلیوں کے امکان کی صورت متحرک ہیں۔ لذتِ محض کے چشموں میں پھوٹتے، ربڑ کی تھیلیوں اور خون آلود دھجیوں کی صورت گندی نالیوں میں بہہ جاتے ہیں۔ وہ جو کالے۔ گورے۔ بھورے۔ فربہ۔ توانا۔ نحیف۔ سوکھے جسموں کے سرخ خون میں جڑیں گاڑے زندگی کا امرت چوستے ہیں پھر متوازن غذا کی بوتلوں پر ہمک کر۔ چرمرائے پستانوں کو بھنبوڑ کر اُس عظیم شہر پر آنکھ کھول دیتے ہیں۔

بس سٹاپوں کے ہجوم میں لمس کی آرزو پر فزکس کیمسٹری ٹپکاتے طالب علم درس گاہوں میں کوانٹم میکنکس سے لے کر محمود غزنوی کی فتوحات تک کی ہر قابل فروخت اطلاع کا بھاؤ لگاتے معلم۔ پھانسی کی کامیابی اور مزید ضربیں سہنے کی قبولیت کا سرٹیفکیٹ جاری کرنے والے ڈاکٹر۔ طاقت کے ہر نمرود کی آتشک چاٹتے خصی دانشور، لوطی فلسفی، مجلوق نظریہ گر۔ کوڑھی اخبار ساز... اور وہ جو عظیم شہر کا دوسرا آدھا ہونے کے دعوے دار ہیں۔ علم، سچائی، محبت، حسن آزادی

جیسے لفظوں کی دھونی رَما کر اپنی ذات کا جن برآمد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور خود بونے بن جاتے ہیں۔

پارکوں میں کھلتے پھول سلفیورک ایسڈ سے آلودہ شبنم چوستے ہیں۔ پری وش لوگ فلموں میں اتنی لافانی محبتیں دکھاتے ہیں کہ دیکھنے والے صرف ریہرسل پر قتل ہو جاتے ہیں کتابوں میں سچائیاں اتنی محفوظ ہیں کہ کسی کو کانوں کان اُن کی خبر تک نہیں ہوتی اور ''سب اپنا ہے۔'' آزادی سے شاہراہوں پر ٹہلتا ہے۔

عظیم شہر ویسا ہی تھا۔ کروڑوں دیواروں کا مجموعہ جو باہم گھر گھیر کر روشنی اور ہوا دبوچتی ہیں اور کونوں کھدروں کا ایسا حصار تعمیر کرتی ہیں جس میں ہر صبح خلق کا بم پھٹتا ہے اور قطار اندر قطار انسانی لہریں سڑکوں کے Shock Absorbers میں جذب ہونے لگتی ہیں۔

''یہ سڑک جانے کب ختم ہوگی اور یہ جنونی آدمی کب رُکے گا۔'' الیاس نے تقریباً روتے ہوئے سوچا۔ ''وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں اپنا سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس کے پیچھے چل پڑا تھا۔ اُس وقت سات بج کر کچھ منٹ تھے۔ کتنے منٹ تھے۔'' کلائی سامنے کی اور اُس نے گھڑی دیکھی اور چونک پڑا ''گھڑی تو بند ہے۔ 7:23 پر۔ لعنت ہے اس پر۔ اب تو سورج سر پر ہے۔ دوپہر ہوگئی۔ یا شاید سہ پہر'' دایاں قدم۔ بایاں قدم دایاں۔ بایاں۔ بایاں مبین کو محسوس ہوا کہ تھکن سیسہ بن کر اُس کے ٹخنوں اور گھٹنوں میں منجمد ہو رہی ہے۔ آگے بڑھتے اُس شخص کا تعاقب کرتے قدموں کی دُھن کھوپڑی میں دھمک پیدا کرتی تو بریف کیس کا بوجھ اُس کے ناقابل برداشت ہونے لگتا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ بازو ور کو زور سے گھما کر سیاہ رنگ کے اُس چوکور ڈبے کو دور پھینک دے اور اِس طرح کم از کم بازوؤں کے درد سے نجات حاصل کرلے۔ مگر پھر اُسے یاد آیا کہ بریف کیس میں تو انتہائی اہم اعداد و شمار کی وہ رپورٹ بند ہے جس کی روشنی میں مملکت کی ترقی کے کئی نئے منصوبے وضع کئے جائیں گے۔ اُس کا ذہن دفتر میں اپنے کمرے کی طرف بھٹک گیا۔

کریم رنگ کا کمرہ جس کی دیواروں پر اوپر کو اُٹھتے بے شمار گراف ٹنگے ہیں۔ دفتر کرسی جس کا کُشن ایک کونے سے پھٹا ہے۔ ردی کی ٹوکری، بڑی میز، پیپر ویٹ کیلنڈر، بک

سیلف، زرد رنگ کے پردے جن کی سبز دھاریاں بہت بری لگتی ہیں۔ ''نہیں آئے ابھی تک الیاس صاحب'' ایم ڈی نے پوچھا۔ ''نہیں صاحب جی۔'' چپڑاسی نے کہا۔ ''کوئی درخواست چھٹی کی۔'' ''نہیں صاحب جی'' ''ہیڈ کلرک کو بلاؤ۔'' ''جی صاحب۔'' مظفر صاحب اِس ایاس مبین کو Absent مارک کریں۔'' ''یس سر۔'' کمرے میں اب خاصا اندھیرا ہے۔ پیپر ویٹ نظر نہیں آتا اور کیلنڈر پر آج کی تاریخ پڑھی نہیں جاتی۔

وہ شخص اتنی تیزی سے پیچ دار گلیوں میں سے چکراتا نکلا کہ الیاس کے لئے اپنے تھکے ہوئے جسم کو متوازن رکھنا بھی مشکل ہونے لگا۔ پھر جب وہ شخص بالکل غیر متوقع طور پر ایک تنگ سی گلی میں مڑ کر کسی کشادہ شاہراہ پر نکلا تو الیاس نے شدت سے چاہا کہ وہ رُک کر تھوڑی دیر کیلئے ہانپ لے اور ساکن ہو کر ٹانگوں کی تھرتھراہٹ دور کر لے۔

''یہ مجھے پاگل کردے گا۔ یہ خود پاگل ہے۔ جب ہی تو گھر سے بھاگا ہے۔ گھر! مجھے تو گھر جانا ہے۔ کاش یہ میرے گھر کے سامنے سے گزرے اور میں خاموشی سے گھر میں داخل ہو جاؤں اور اِسے جہنم واصل کردوں۔ کہیں اِسے یہ علم تو نہیں ہوگیا کہ اُسے پہچان لیا گیا ہے۔ کہیں یہ مجھے جُل دے کر غائب تو نہیں ہونا چاہتا...''

اب وہ عظیم شہر کے ایک پرہجوم علاقے میں داخل ہونے کو تھے اور ہجوم کو دیکھتے ہی الیاس کے اوسان خطا ہونے لگے۔ مدتوں سے ایک ہی متحرک نقطے پر مرکوز اُس کی آنکھیں باہر کو اُبل آئیں اور گردن کے اعصاب تن گئے۔

''بس اب گیا ہاتھ سے۔ غائب ہو جائے گا۔ بھیڑ میں رَل مل جائے گا۔ میں اُسے کھودوں گا اور پھر کبھی کسی کو علم نہیں ہو سکے گا کہ وہ کہاں ہے۔ ہٹو۔ ہٹو۔ پیچھے ہٹو۔ گزرنے دو۔ نکل جائے گا وہ۔ بھئی مجھے رستہ دو۔ بھائی صاحب۔ بزرگو۔ بی بی۔ مسٹر۔ پلیز ذرا ایک طرف ہوں مجھے گزرنے دیں۔ آگے نکلنے دیں۔ دیکھیں دیکھیں وہ جا رہا ہے۔ سب کے سامنے نکلا جا رہا ہے۔ میرا رستہ نہ روکو۔ یہ گردن اُس کی تو نہیں۔ کہاں گیا۔ ہاں وہ ہے۔ گم تو نہیں ہوا۔ رستہ دو، بے وقوفو۔ تمہیں علم نہیں وہ کون ہے تم میں سے کوئی اُسے نہیں پہچانتا۔ تم کچھ نہیں جانتے۔

احمقو وہ ہمیشہ کے لئے کھو جائیگا۔ پھر اُس کا سراغ کبھی نہیں ملے گا۔ میں۔ میں جانتا ہوں وہ کون ہے۔ میں عظیم شہر کا واحد آدمی ہوں جو اُس شخص کو پہچانتا ہے۔

تیز و تند آندھی میں کسی کٹی پتنگ کے پیچھے بھاگتے بچے کی طرح۔ طوفانی دریا میں بہتی لاش کی طرف بڑھتے تیراک کی طرح الیاس نے عظیم شہر میں چکراتے اُس انسانی بگولے کے تعاقب کا جوکھم جاری رکھا۔

سڑکوں پر۔ شاہراہوں پر۔ گلیوں میں۔ بازاروں میں۔ چوکوں میں، پارکوں میں اتنا مسلسل کہ ''کب اور کہاں'' مٹ کر درد کے ایک ایسے دائمی اب میں بدل گیا جسے سائرن کی طرح گونجتے دو احساس بریکٹ کر رہے تھے۔

''میں ایک سنگین حماقت کر رہا ہوں۔''

''میں اُس شخص کو ہرگز دوبارہ نہیں کھونے دوں گا۔''

پُل صراط کے اُس سفر کے دوران الیاس نے اپنے وجود کی لمبی چیخ کو سوچ تخیل اور یاد کے سہاروں سے دبانے کی کوشش کی۔ اُس نے گھر، بیوی، بچے کے تصور کو۔ Tranquilizer بنانے کی آرزو کی۔ اُس نے ملک و قوم، دین، دنیا پر بنے صالح افکار کو ذہن میں بسانا چاہا۔ مگر اُس کے پھوڑے جیسے جسم کی ٹیسیں سب کچھ تار تار کرتی رہیں۔

مسلسل!

پھر وہ شخص گہری رات میں تاریک ایک ایسی گلی میں داخل ہوا جس کے اوپر تنی لمبی آسمانی مستطیل میں سوڈیم لیمپ جیسی زرد روشنی کا چاند تیرتا تھا۔

''میں اب ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ مگر میں قدم اٹھاؤں گا۔ میں یہیں ڈھیر ہو کر گہری نیند سو جاؤں گا۔ میں آخری دم تک اُس کا پیچھا کروں گا۔''

الیاس کو وہ شخص اب تاریکی میں محض ایک غائب ہوتا ہیولہ دکھتا تھا پھر الیاس نے یہی سمجھا کہ اب اُسے تیزی سے آگے بڑھ کر دائیں یا بائیں کسی گلی میں مڑنا ہوگا۔ کیونکہ وہ پہلے بھی کئی بار اسی طرح اچانک اپنی سمت بدل کر پیچھے آنے والے کو متحیر کر چکا تھا۔

اپنی بچی کھچی سب قوتیں یکجا کرتے ہوئے الیاس مبین نے اپنے جسم کو آگے کی طرف دھکیلا اور پھر پہلی بار۔ قرنوں بعد پہلی بار اُس کے قدم رک گئے۔

سامنے ایک مکان کا بند دروازہ تھا اور وہ ایک بند گلی تھی! مجنونانہ وحشت کے زیرِ اثر وہ چاروں طرف گھوم گیا۔

گلی بالکل سنسان تھی!

آسمانی مستطیل سے جھانکتا چاند گلی کے سب بند کواڑوں سے لٹکتے آہنی تالوں پر روشنی کی آخری نحیف کرنیں گرا رہا تھا!

بریف کیس الیاس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گرا۔ دھماکے کے چھیدتے ارتعاش کے ساتھ ہی سب کچھ بالکل تاریک ہو گیا۔

بریف کیس کے گرنے کی آواز نے بس سٹاپ پر کھڑے سب لوگوں کو چونکا دیا اور جونیئر اسٹیٹسٹیکل آفیسر الیاس مبین (ایم۔ایس۔سی اسٹیٹ) نے بھی چونک کر اپنی نظریں سائنٹیفک بیکری۔ لاثانی جنرل سٹور۔ خالی تھڑے اور قصائی کی دکان پر ٹنگے تین سر کٹے بکروں کے معمول کے منظر سے ہٹا لیں۔ اُس نے جلدی سے بریف کیس دوبارہ ہاتھ میں تھاما اور گزرتی ٹریفک میں 50 نمبر کی بس ڈھونڈنے لگا۔

''تعجب ہے ابھی تک بس نہیں آئی۔'' اُس نے گھڑی دیکھی۔ ''سات بج کر تیس منٹ'' ''نہیں ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی۔'' الیاس نے ٹھوڑی کھجلاتے ہوئے سوچا۔

آفٹر شیو لوشن کی خوشبو کے منتظر نتھنوں تک جب قریبی انگلیوں سے اُڑتی ایک انجانی بو پہنچی تو اُس وقت سیکنڈ کی سوئی تیسویں سے چوبیسویں منٹ کی طرف رواں تھی۔

اور پھر اُن کے درمیان کا کوئی سیکنڈ یا مائیکرو سیکنڈ ایک پاگل لمحہ تھا۔ جب پوروں نے ٹھوڑی پر بے تحاشا بڑھے بالوں کی خبر دماغ تک پہنچائی۔

شاید وہ صبح الیاس مبین کیلئے حیرت اور ناممکن کی صبح تھی۔ بریف کیس ایک بار پھر اُس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا اور وہ سراسیمگی سے اپنا ہاتھ چہرے کی جلد پر رگڑنے لگا۔ ''یہ کیا۔

میرے خدا یہ کیا۔ میں۔ میں اتنی بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ دفتر جا رہا ہوں۔ یہ کیسے ہو گیا۔ میں نے شیو نہیں کی۔ ناممکن۔ یہ تو قطعی ناممکن ہے۔ انتہائی کم ممکن۔ ایسا ہونے کے امکانات تو پچاس لاکھ میں ایک سے بھی کم ہوں گے۔ چالیس لاکھ میں ایک۔ تیس لاکھ... دس لاکھ میں ایک!

وہ صبح بھی ویسی ہی تھی جیسی کہ صبح جو کل تھی۔

دیوار کا تھیٹر

"نہیں سفیدی چھوڑیے! ڈسٹیمپر یا پینٹ کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ جانے بھی دیجیے شیخ صاحب! گلابی۔ ہرا۔ نیلا کریم کچھ نہیں چلے گا۔ آپ اسے ایسا ہی رہنے دیں۔ اسی حال میں!"

"مگر کیسے رہنے دوں اسی حال میں نعیم صاحب! ذرا اس دیوار کا حال تو دیکھیں۔ چونا جھڑ جھڑ کر کتنے چٹاک پڑ گئے ہیں۔ ہر طرف دھبے ہی دھبے! میں نے تو سُنا تھا کہ تصویریں بنانے والے صفائی کا خاص خیال رکھتے ہیں! اور پھر آخر آپ کے ملنے والے کیا کہتے ہوں گے۔"

خدا داد بلڈنگ کے مالک شیخ قائم الدین نے بیاسی نمبر کے کریک سے کہا جو خدا داد بلڈنگ کے اُن محدودے چند کرایہ داروں میں سے ایک تھا۔ جنہیں شیخ قائم الدین نے اُن کے ذرائع آمدنی سے لاعلم ہونے کی بنا پر Unclassified چھوڑ رکھا تھا۔ اور یادداشت کے لئے ان میں سے ہر ایک کے لیے تلنگا۔ کریک۔ چور۔ یتیم۔ ہیرو۔ کالیا۔ کلّو اور چڑیل جیسے جامع اسمائے صفت وضع کر رکھے تھے۔ باقی سب کرایہ داروں کی صرف تین اقسام تھیں۔ پانچ ہزار روپے تک آمدنی والے دس ہزار والے اور دس ہزار سے بیس ہزار تک والے اُس سے زیادہ آمدنی والے کنوارے یا اکیلے کرایہ داروں سے شاید اہلیان شہر کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ اس لیے وہ شاذ و نادر ہی شاہراہ "گ" پر واقع اُس بلڈنگ میں کمرہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے جو شہر بھر کے کم آمدنی والے اکیلے مرد کرایہ داروں میں۔ "کنواروں کا جنت دوزخ" کے نام سے مشہور تھی۔

"مگر یہ آپ سے کس نے کہا کہ تصویریں بنانے والے صفائی کا خاص خیال رکھتے

ہیں" نعیم نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں پوچھا۔

"چلو جی نہیں رکھتے ہوں گے۔ پر مجھے تو بلڈنگ کی دیکھ بھال کرنی ہے ناں! بحثیت مالک میرا مطلب ہے۔ پچھلے سال بھی آپ نے کمرہ سفیدی نہیں ہونے دیا تھا۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی آخر اِس ضد کا مطلب کیا ہے۔ عجیب بے تکی ضد ہے یہ بھی۔ ذرا یہ دیوار دیکھیں" شیخ قائم الدین نے کمرہ نمبر 82 کی ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا اور دوسرے ہاتھ کی انگلی سے اپنے بائیں گال پر اُبھرے انگور کے دانے جتنے موٹے سیاہ مَسّے کو ہلکی ہلکی ضربیں لگانے لگا۔

"اضطراب!" نعیم نے سوچا۔

شیخ قائم الدین کے پھُولے گال کے وسط میں اُگا موٹا سیاہ مَسا اُس کے بھاری بھرکم جسم کا وہ مقام خاص تھا جہاں اُس کے تمام نفسانی اور روحانی جذبے فوکس ہوتے تھے اور گفتگو کے دوران جب اُس کے ہاتھ کی فربہ انگلیاں بائیں گال کی طرف بڑھتیں تو انگلیوں اور مسّے کا ہر ایک مخصوص تعلق نعیم کو شیخ قائم الدین کے میٹھے لیس دار لفظوں پر بھنبھناتی ہیجانی کیفیتوں سے بھی آگاہ کر دیا کرتا تھا!۔۔۔ سہلانا۔۔۔ حرص۔ لالچ۔ دبانا۔۔۔ "اُلو کے پٹھے آخر ایک دن تو قابو آؤ گے۔" ضربیں لگانا۔ اضطراب۔ "آخر اُس پاگل کے پُتر سے کیسے نپٹا جائے۔" کھجلانا۔۔۔ "اب پھنسے ہو ناں! ذرا یہ مزہ بھی چکھو اب۔" مروڑنا۔ غصہ۔ "تم ہو کیا آخر۔ دل ہی دل میں گالیاں۔ نوچنا۔ کمینگی بُزدلی۔ "یہ تو ایک ہی حرامی نکلا اِس سے تو بچنا ہی چاہیے۔" اور پھر بے انتہا مسرت وانبساط کا وہ ایک عالم بھی جس میں ڈوب کر جب انگوٹھے اور انگلیوں کے دو پورے مسّے کے گرد آہستگی سے پھرنے لگتے تو نعیم کو شیخ قائم الدین کا بایاں گال انتہائی ننگا نظر آنے لگتا اور اُس کے وسط میں اُبھرے انگور کے دانے جتنے موٹے سیاہ مسّے میں اُگے بالوں سے وہ فحاشی کی شعاعیں پھوٹتی دیکھا کرتا۔

"دیکھئے نعیم صاحب۔ سفیدی تو ہوگی ہر حال میں۔ ساری بلڈنگ میں کام ہو رہا ہے۔ ہر سال ہوتا ہے۔"

"اور اس سال کرایہ کتنا بڑھے گا سفیدیوں کے بعد!" نعیم نے پوچھا۔

"ہی۔ ہی۔ ہی۔ تو آپ بھی چالیس نمبر کے چڑیں..... میرا مطلب ہے خالد صاحب کی طرح یہ سمجھتے ہیں کہ میں کرایہ بڑھانے کے لئے Repair کا کام کرواتا ہوں۔

ویسے تو بڑھے گا ہی ہر حال میں۔ میرا مطلب ہے سہولتیں بھی تو ملیں گی آخر۔" شیخ قائم الدین نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "تو پھر کب بھیجوں کاریگر کو ذرا اُس دیوار کا حال تو دیکھیں۔"

"شیخ صاحب آخر کیوں آپ اِس دیوار کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ بلڈنگ میں اور بہت دیواریں پڑی ہیں سفیدیاں پھیرنے کے لئے۔ اور آخر یہاں رہنا تو مجھے ہے کسی اور کو تو نہیں۔" نعیم نے اکتاہٹ سے کہا اور پھر اُس نے فوراً ہی موضوع بدل ڈالنے کی ایک کامیاب کوشش کر ڈالی۔

"شیخ صاحب وہ آپ کے نئے ٹرکوں کی باڈیاں بن گئیں کیا۔ آپ کہہ رہے تھے کہ کام وغیرہ ہو رہا ہے۔"

شیخ قائم الدین کا چہرہ کھل اُٹھا اور ہاتھ تیزی سے بائیں گال کی طرف بڑھ گیا۔ "جی ہاں! اللہ کے فضل سے سب کام مکمل ہو چکا ہے۔ فِنِش ٹیٹ میرا مطلب ہے بس اب پینٹر کا کام باقی ہے۔ اور اُس کے لئے....." شیخ قائم الدین کی چہکاریں اک دم رکیں۔ انگلی مسّے پر ٹھہر گئی اور آنکھیں باہر کو اُبل پڑیں جیسے کوئی انتہائی اہم بات یاد آ گئی ہو یا کوئی بہت منفعت بخش کاروباری نقطہ سوجھ گیا ہو۔ نعیم نے دلچسپی سے قائم الدین کی طرف دیکھا اور چارکول کے خیالی ٹکڑے کو انگلیوں میں دبا کر چند ہی سیکنڈوں میں ہوا میں ایک اسکیچ بنا ڈالا۔ پھر گہری سوچ اور ہونقیت کی اُس تصویر کے لئے کوئی موزوں Caption ڈھونڈنے لگا۔

"میں کہہ رہا تھا نعیم صاحب کہ پینٹر کا کام ابھی ہونا ہے۔ پر جناب ہاتھ تو آپ کا بھی بہت صاف ہے۔ لو جی میں تو بھولا ہی رہا۔ کاریگر تو گھر ہی میں موجود ہے۔! بس دو شیر ہر پیچھے ڈالے پر۔ سیڈوں پر چار پانچ سینریاں اور دروازوں پر پھُل بوٹے! ذرا فِس کلاس! میرا مطلب ہے گڈی ذرا لشک جائے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ آخر آپ کے ہنر کا ہمیں بھی تو کوئی فائدہ پہنچے۔" شیخ قائم الدین نے مسّے کو انگلیوں سے سہلاتے ہوئے کہا اور نعیم کی طرف دیکھا پھر کونے میں پڑی میز پر بکھری آئل کلر کی ٹیوبوں برشوں اور نامکمل کینوسوں کو پُر خیال انداز میں تاکنے لگے۔

نعیم نے موضوع بدلنے کی اپنی اُس کامیاب حرکت پر پچھتانا چاہا تو اُس کا منہ اِس طرح بگڑ گیا جیسے ابکائی روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ شیخ قائم الدین کی بائیں گال کو قہر آلود نگاہوں

سے گھورتے ہوئے اُس نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر کسی فوری مصلحت کے تحت اُس نے جلدی سے
اپنے چہرے کے بگاڑ کو مسکراہٹ میں بدل دیا اور کہنے لگا۔ " کچھ کر لیں گے شیخ صاحب دیکھیں
گے!"

"زندہ بادہ۔ بات ہوئی ناں۔ تو کب شروع کریں کام۔"

"کریں گے۔ کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"دیکھو لو نعیم صاحب!۔ آپ نے اپنا پہلا وعدہ بھی پورا نہیں کیا ابھی!"

"پہلا وعدہ؟ کون سا وعدہ؟" نعیم متعجب ہوا۔

"میری تصویر جناب عالا! م میری فوٹو نہیں بنائی تھی آپ نے۔ فس کلاس قسم کی میرا
مطلب ہے! وعدہ کیا تھا آپ نے! خیر پہلے باڈی کا کام ہو جائے پھر..... پھر میری باڈی کا
کام ہوتا رہے گا۔"

خدا داد بلڈنگ کے مالک نے ایک بے ڈھنگا قہقہہ لگایا اور اپنے اُس پُر مزاح جملے کا
متوقع ردِ عمل نعیم کے چہرے پر ڈھونڈنے لگا۔

"بنائیں گے۔ آپ کی تصویر بھی بنائیں گے۔" نعیم نے نہایت مردہ سی آواز میں
کہا۔

قائم الدین کا قہقہہ یوں رُکا جیسے ٹرک بجری پر یک دم بریک لگا دے اور پھر ایک ایک
لفظ پر زور دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"نعیم صاحب یہ کام کردو دونوں ہمارے! میرا مطلب ہے دو شیر ببر پچھلی طرف
ڈالے پر۔ چار پانچ سینریاں سیڈوں پر اور پھل بوٹے چار چوفیرے۔ اور پھر بعد میں ایک تصویر
ہماری! ذرا بڑی والی میرا مطلب ہے! اور..... اور اِس ماہ کا آدھا کرایہ معاف! چلو جی پورا کرایہ
معاف! تم بھی کیا یاد کرو گے! ویسے مُنشی کہہ رہا تھا کہ آپ کا پچھلے چار ماہ کا واجب ادا ہے۔"

نعیم کے چہرے پر گھبراہٹ طاری ہوگئی اور پہلی دفعہ لہجے میں لکنت کے آثار نمودار
ہوئے۔

"وہ..... ایک نیا..... نیا CONTRACT شاید ہو جائے اِس ماہ۔ ایک میگزین کے
ساتھ۔ آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

"ہاں جی..... کام تو آپ کا خیر حرام ہی ہے پر میرا خیال ہے پیدا اس میں بھی بہت
ہے۔! لو جی میں چلا۔" شیخ قائم الدین نے اختتامیہ انداز میں کہا اور کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے
دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

نعیم نے کمرے کا دروازہ بولٹ کرتے وقت ایک طویل سانس لیا۔ اور اس طرح
کمرے کی فضا میں رچی بسی آئل پینٹ کی مانوس بو کو اپنے اندر کھینچ کر اُس پراگندگی کو سانس کی
ہوا کے ساتھ ہی باہر نکال پھینکنے کی کوشش کی جو جانے کب سے اُس کی نس نس میں زہریلے خمیر

اُٹھا رہی ہے۔

خدا داد بلڈنگ کی تیسری منزل پر واقع کمرہ نمبر 82 کا کریک دیر تک ایک اَدھورے
کینوس کو گھورتا رہا پھر شاہراہ "گ" سے اُٹھتے ٹریفک کے شور سے بچنے کے لئے اُس نے بیرونی
کھڑکی بند کردی اور کمرے کے کونے میں بچھی چارپائی پر اوپر تلے رکھے تین تکیوں کے سہارے
نیم دراز ہو کر اُس نے اپنی نظریں سامنے والی اُس دیوار پر مرکوز کر دیں جہاں اُکھڑتے چونے کی
کئی سطحوں میں ہر طرف ہزاروں بے ہنگم دھبوں اور چٹاکوں کا سیلاب موجزن تھا۔

یہ دیوار کا تھیٹر تھا!

اُس تھیٹر کے پہلے سین کا آغاز ڈیڑھ سال قبل نعیم کے بخار زدہ ذہن کے کسی دہکتے
گوشے میں ہوا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب آرٹس کالج کے ہاسٹل سے خداداد بلڈنگ کے اُس کمرے
میں منتقل ہونے کے فوراً بعد ہی ایک مہلک قسم کے ٹائیفائیڈ نے اُس کے جسم میں بسیرا کرنے
کے بعد اُسے پہروں بستر پر بچھ کر مرض کی سب گھاتوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کی ایک
مسلسل جان کنی میں مبتلا کر دیا تھا اور ایسے میں "مریض کا مشغلہ" ہی اُس کا واحد مشغلہ تھا۔ نیند
سے گریزاں آنکھوں سے کمرے کی چھت اور دیوار کو تکتے رہنے کا مشغلہ!

تیز بخار۔ شدید لاغری اور تنہائی کے ان صدیوں طویل لمحوں میں وہ کوئی ایک لمحہ تھا
جب نعیم کے ٹوٹتے ذہن کا عصبی اُبال ایک بصری ہذیان کی صورت میں دیوار کے مبہم پُراسرار
دھبوں پر متشکل ہونے لگا تھا۔ لایعنی۔ ترتیب و توازن سے عاری اُن بدہیت اشکال میں اُسے
معنویت کے پیکر دکھائی دینے لگے تھے۔ ٹیڑھی میڑھی لکیریں افقی خط بن کر اُس کے سامنے

انوکھی لینڈ سکیپز کے خاکے وضع کرنے لگیں اور اُن میں پھیلے چھوٹے بڑے دھبے آنکھوں کی صورت میں مربوط ہو کر حیرت ناک مخلوقات کو جنم دینے لگے۔ بخار کی اذیت کے اُس عالم میں اُس نے دیوار کے دھبوں میں کرب و عذاب کی سرزمینوں میں موت کے وہ سب مناظر دیکھے تھے۔ جنہیں وہ کبھی دیکھ یا سُن چکا تھا۔

فاتح سپاہی بستی میں داخل ہوتے ہیں بستی میں صرف بہت سے بچے دبکے بیٹھے ہیں جو فرار نہ ہو سکے۔ انہیں ایک نیا کھیل سکھانے کے بہانے ایک جگہ اکٹھا کیا جاتا ہے اور پھر ایک ہی گرنیڈ ان کے لئے کافی ہوتا ہے۔۔ دریا کی تہہ میں پڑی بہت سی بوریاں جن میں حرم شاہی کی اُن عورتوں کی لاشیں بند ہیں جنہوں نے حرم کے بعض نامکمل خواجہ سراؤں کے ساتھ خرمستیاں کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ اپنے ہمراہ اور بہت سے بے گناہ قصور واروں کو جنت کے سفر پر لے جانے نکلا خود کُش بم باز جس کی اُنگلی بٹن کو آخری بار چُھو رہی ہے۔ اور بہت سی دوسری عام حقیر اور غیر دلچسپ اموات۔ دیوار کے دھبوں کی تصویریں۔ ٹائی فائیڈ کا زور ٹوٹا اور نعیم کے جسم اور ذہن سے مرض کے سب اثرات ایک ایک کر کے زائل ہونے لگے۔ مگر دیوار کے دھبوں کی اُس Kaleidoscope میں نئے نئے بصری امکانات ڈھونڈنے کے جنون سے وہ پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا اور پھر اسی جنون کے زیر اثر اُس کے ذہن میں مصوری کے اُس عجیب و غریب منصوبے نے جنم لیا جسے اُس نے ''دیوار کا تھیٹر'' کا نام دیا۔ دیوار کے دھبوں کی بظاہر بے معنی بے شکل اشکال میں چھپی حقیقی تصویروں کو کینوس پر منتقل کرنے کا منصوبہ۔ وہ منصوبہ جسے اُس کے دوست کمرشل ڈیزائنر خاور صدیقی نے سیدھا سیدھا پاگل پن قرار دیا تھا۔

''اُس کونے میں غور سے دیکھو اور کچھ دیر دیکھتے رہو۔ اب بتاؤ کیا نظر آیا ہے۔'' نعیم نے خاور سے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں! ہاں اگر زبردستی کی جائے تو اُس چٹاک کو ایک قسم کا گوبھی کا پھول سمجھا جا سکتا ہے۔'' خاور نے ہنستے ہوئے کہا ''چھوڑو یار تمہارا لینڈ لارڈ ٹھیک ہی کہتا ہے کہ تم کریک ہو۔!''

نعیم نے خالصتاً تکنیکی انداز میں بھی اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ دھبے دراصل

ایک قسم کے ریفرنس اسکیچز ہیں جن کی بنیاد پر ایک مکمل Study ممکن ہے۔ اُس نے موسیقی سے مثال قائم کرتے ہوئے اُسے بتایا کہ دھبے ایک طرح سے بھولی ہوئی دھنوں کے مختصر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں جنھیں سُن کر مکمل دھن یاد آ سکتی ہے۔ لیکن ان دونوں کی گفتگو کچھ آگے نہیں بڑھ سکی تھی اور پھر چند ماہ بعد جب نعیم نے خاور کو اپنا پہلا کینوس دکھایا تو وہ چلا اُٹھا تھا۔

''میرے خدا! یہ تو بھیانک ہے! Completely weird ہر طرف غاریں ہی غاریں۔ تاریک غاریں! اور ان میں یہ کیا ہے؟ یہ چیزیں کیا ہیں؟ انسان ہیں کیا؟

You should stop doing crazy things like this

ایک سال کے عرصے کے دوران نعیم نے آئیل میں ''دیوار کا تھیٹر'' کے سلسلے کی چار پینٹنگز اور درجنوں پنسل اسکیچز مکمل کیے۔ کتابوں کے لئے ٹائٹل اور دوسرا کمرشل تصویری مواد بنانے کے بعد اُس کے پاس جو بھی وقت بچتا اُسے وہ اپنے اُس پراجیکٹ کی تکمیل میں صرف کر دیتا۔ سافٹ پنسل کی ملائم لکیروں اور برش کی ہارڈ اسٹروکس کی مدد سے وہ اپنے خیال کے مطابق ''مصوری کی نئی جہت'' دریافت کرنے کی کوشش میں جُتا رہا۔ کھڑکی کی راہ سے آنے والی روشنی گھٹتی بڑھتی ساعتوں اور بدلتے موسموں کے ساتھ ساتھ جب سایوں کے نت نئے امتزاج دھبوں پر پھیلا دیتی تو دیوار اُس کے لئے تخلیق کا ایک منبع بن جاتی اور اُس کے ہر گوشے میں اُسے تصویر کا ایک نیا جہاں آباد دکھائی دینے لگتا۔

پچھلے سال بھی اِن دنوں جب خدا داد بلڈنگ میں سفیدی اور مرمت کا کام شروع ہوا تھا اور نعیم کو تصویروں کے اپنے وہ سب جہاں سفیدی کی کوچیوں تلے ملیامیٹ ہوتے نظر آئے تھے تو کس مشکل اور مصیبت سے اُس نے بلڈنگ کے مالک کے نیک ارادوں اور کرایہ داروں کی خیر خواہی کے جذبات سے اُس دیوار کو محفوظ رکھا تھا۔ اور یوں مالک اور مکینوں دونوں کی نظروں میں اپنی دماغی صحت کو ہمیشہ کے لئے مشکوک ٹھہرا لیا تھا۔

اِس سال اب نعیم کو جہاں ایک طرف دیواری نقوش کی اپنی وہ سب دنیائیں برباد

ہونے کا خطرہ لاحق تھا۔ وہاں دوسری طرف اُس کے پیشِ نظر اپنے غیر یقینی ذرائع آمدنی کے نتیجے میں کبھی اچانک ظاہر ہو جانے والا شیخ قائم الدین کا غیر یقینی ردِعمل بھی تھا۔ خداداد بلڈنگ کی گزشتہ ڈیڑھ سالہ تاریخ کے بعض مناظر اُس کی نظروں کے سامنے پھرنے لگے۔ طویل عرصے تک کرایہ ادا نہ کر سکنے کے بعد جب ساٹھ نمبر کے یتیم کا ٹیپ ریکارڈر چھینا گیا تو نعیم نے اُس کا چہرہ دیکھ کر سوچا تھا کہ اب یہ واقعی یتیم لگ رہا ہے۔ مگر بارہ نمبر کے ہیرو نے گھڑی اور بریف کیس قرق ہونے پر سخت غیر ہیروانہ رویے کا مظاہرہ کیا تھا اور رونے لگ پڑا تھا۔

"مجھ سے آخر کیا کچھ چھینا جا سکتا ہے۔" نعیم نے اپنے آپ سے سوال کیا اور دیر تک مختلف امکانات کے بارے میں سوچ سوچ کر محظوظ ہوتا رہا۔ پھر اچانک ایک زہر آلود مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی آنکھوں کے سامنے موٹے سیاہ مسّے کو سہلاتی انگلی نمودار ہوئی اور کانوں میں وہ الفاظ گونجنے لگے۔

"نعیم صاحب یہ دو کام کر دو ہمارے..... دو شیر ببر پچھلی طرف۔ چار پانچ سینریاں پھل بوٹے چار چوفیرے اور ایک تصویر ہماری۔ آدھے ماہ کا کرایہ معاف چلو جی پورا معاف تم بھی کیا یاد کرو گے۔"

"تم بھی کیا یاد کرو گے" کے الفاظ ہتھوڑوں کی طرح نعیم کے دماغ پر برسنے لگے، اور ہر ضرب کے ساتھ وہ شیخ قائم الدین کی اُن بے پناہ صلاحیتوں کا قائل ہوتا چلا گیا جو ہر شخص کے لئے اُس کی حیثیت کے مطابق چھیننے اور چھننے کے عمل کو بہت آسان بنا دیتی تھیں۔

ایک خیال اُس کے ذہن میں کلبلایا۔ "رسالوں کے لئے تصویریں بنانا بھی تو کوئی ایسا اعلیٰ تخلیقی کام نہیں۔ ٹرک کی باڈی پر شیر اور سینریاں بنانے میں آخر حرج ہی کیا ہے۔ پورے ماہ کا کرایہ!"

نعیم نے کچھ دیر کے لئے اپنے اس غیر متوقع خیال سے کھیلنا چاہا مگر پھر اُس نے دیوار کے اُس مخصوص مقام کو گھورنا شروع کر دیا جہاں کے مخفی دھبوں سے اخذ کئے گئے اشاروں کی مدد سے وہ "دیوار کا تھیٹر" کے سلسلے کا پانچواں کینوس مکمل کر رہا تھا۔

یہ بے آب و گیا سنگلاخ چٹانوں کا ایک سلسلہ تھا جو تصویر کے عین درمیان میں اتھاہ گہرائیوں کے ایسے خلا پر منقطع ہو رہا تھا جس میں اُفق پھلانگ کر گویا سارا آسمان اُتر آیا تھا۔

نعیم نے اپنی اُس شدید خواہش کو دبانے کی کوشش کی جو اُس مخصوص پینٹنگ کو بنانے کے دوران اُسے بار بار ستاتی تھی۔ کیوں نہ میں خلا میں باہر کو نکلی اُس چٹان کے کنگرے سے چمٹے خلا میں ٹانگیں جھٹکتے ایک ایسے انسان کی تصویر بنا دوں جسے اس بات کا علم نہ ہو کہ وہ نگل جانے والے گہراؤ میں لٹک رہا ہے یا اُس کے پاؤں کے تھوڑا نیچے کوئی ہموار سطح ہے اور پھر کیا میں اُس کے لٹکتے پاؤں کے بالکل نیچے ایک ہموار چٹان پینٹ کروں یا نہ کروں۔ یہ اُدھیڑ بُن اُس کے لئے تکلیف دہ ہونے لگتی تو یہ سارا خیال ہی اُسے بہت سطحی اور عامیانہ محسوس ہونے لگتا۔

یاعلی مدد باڈی بلڈرز کے کھلے احاطے میں کھڑے نئے ٹرک کی اطراف پر شیخ قائم الدین گڈز کے الفاظ لکھنے کے بعد نعیم نے جب پچھلی طرف کے بڑے تختے پر پہلے شیر کا خاکہ مکمل کیا تو شیخ قائم الدین کے کارندے نے پرجوش انداز میں اُسے ببر بنانے کا مطالبہ کیا۔ نعیم نے بلاچون و چراں آدھ سیر وزنی بُرش کے چوڑے منہ کی مدد سے شیر کو قدرے باریش بنا دیا۔ پہاڑیوں، دریا، درخت اور جھونپڑی کی سینری بنتے دیکھ کر کارندے نے پُرجوش انداز میں ایک سڑک اور سڑک پر بھاگتے قائم الدین گڈز کے ٹرکوں کا مطالبہ کیا۔ نعیم نے یہ تقاضا بھی پورا کر دیا۔ چڑیاں طوطے، مور، ہوائی جہاز، پھل بوٹے چار چوفیرے۔ کارندے کی حسب منشا سب کچھ۔ نعیم نے ٹرکوں کی تزئین و آرائش کا شیخ قائم الدین کا پہلا کام مکمل کر لیا۔

کارندے کی پُرجوش داد و تحسین اور یاعلی مدد باڈی بلڈرز کے احاطے میں بکھری گریس میں لتھڑی دھجیوں اور پُرانے ٹائروں کو اپنے پیچھے چھوڑ کر جب وہ واپس شاہراہ "گ" پر واقع خداداد بلڈنگ کے گیٹ تک پہنچا تو رات ہو چکی تھی اور موسم سرد تھا۔ تیسری منزل تک پہنچنے کے لئے اُس نے سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں تو اُس کے گھٹنے کسی ٹرک کے ایسے ڈھرے کی طرح چیں چیں

کرنے لگے جس میں مکینک گریس ڈالنا بھول گیا ہو۔ ہر قدم کے ساتھ اُسے اوپر کی طرف گرنے کا ناقابلِ یقین احساس ہوتا رہا۔ تیسری منزل کی لینڈنگ پر پہنچ کر وہ اپنے پھولے سانس کو ہموار کرنے کے لیے چند لمحے رُکا اور پھر مڑ کر عافیت طلب نظروں سے اپنے کمرے کی سمت دیکھا۔ کمرے کا دروازہ کُھلا تھا اور ایک غیر مانوس روشنی کی مستطیل ریلنگ پر گر رہی تھی!

کمرہ نمبر 82 کے کریک کے چونکنے۔ پھر بہت زیادہ چونکنے اور پھر بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہونے کے افعال اضطراری ہونے کی بجائے کسی چھپکلی کی اچانک اور غیر متوقع طور پر کٹ جانے والی دُم کے لاحاصل جھٹکوں سے زیادہ مشابہ تھے۔ کمرے کے وسط میں اُس کا مختصر سا سامان بڑے قرینے سے دھرا تھا کیونکہ دوسری چابی سے کمرہ کھولنے کے بعد شیخ قائم الدین نے کاریگروں کو سختی سے تاکید کی تھی کہ سامان احتیاط سے درمیان میں رکھ دیا جائے۔ دیواریں اب پاک صاف، شفاف، سپاٹ، اُجلی اور نکھری ہوئی تھیں۔ کسی دھبے چٹاک یا خراش کا نام نشان بھی باقی نہ تھا۔ خداداد بلڈنگ میں سالانہ مرمت اور سفیدی کا کام پایہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

اور پھر چھپکلی کی کٹی دم کو ٹھنڈا ہونے میں بھی زیادہ عرصہ نہ لگا۔ نعیم آہستگی سے اُٹھا اور چارکول کا ایک ٹکڑا انگلیوں میں دبا کر اُس نے سامنے والی دیوار کی اُجلی ہموار سطح پر مشاقانہ سرعت سے ایک لکیر لگائی۔!

پھر دوسری اور تیسری۔!

خاکہ مکمل کرنے کے بعد اُس نے رنگ کی سب ٹیوبیں ایک ایک کر کے کھولیں۔ PALETTE پر ان کے پیٹ پچکائے اور پھر چاقو کے پھل پر گاڑھا رنگ لاد لاد کر وہ ایک وحشیانہ شدت کے ساتھ اُسے دیوار پر تھوپنے لگا۔ وہ دیوار سے چند قدم پیچھے ہٹ کر خاکے کا جائزہ لیتا اور یہ فیصلہ کرنے پر کہ خاکے کا کون سا گوشہ کس رنگ کا مستحق ہے۔ اُس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہراتی اور پھر کسی مخصوص زاویے پر کھڑا ہو کر وہ مجنونانہ انداز میں خاکے پر اپنا

کوئی رنگ تھوک دیتا۔

یہ کسی انسان کی شبیہ تھی مگر جس کے سب اعضا مسخ ہو کر اپنے اپنے قدرتی مقامات چھوڑ چکے تھے جس کے سب ظاہر پوشیدہ تھے اور پوشیدگیاں پوری طرح تن کر ظاہر پر آگ آئی تھیں۔ مگر اُس شبیہ کی پہچان ایک ہی تھی۔ ایک موٹا سیاہ مسا جس سے پھوٹتے بال کسی اکٹوپس کے سایہ بازوؤں کی طرح ہر دیوار کے ہر گوشے کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے ہر طرف بڑھ رہے تھے۔!

سرو رات کے پچھلے پہر "دیوار کا تھیز" کے پانچوں کینوس بغل میں دبا کر جب نعیم نے خداداد بلڈنگ کی نچلی منزل کی ایک ٹوٹی کھڑکی کے راستے باہر کو چھلانگ لگائی تو شاہراہ "گ" پر گہری دھند چھائی تھی اور سیاہ رات میں اپنے اپنے سب خواب دیکھتے لوگوں کو محفوظ کرتی عمارتیں کثیف دھند کی گدلی دیوار پر ایسے دھبوں کی صورت نمایاں تھی جن کا وہ واحد تماشائی تھا!

لکھے لکھائے خطوط کا جنون

ڈاکٹر جاوید جلیس ماہرامراض دماغی نے مجھے بہت مشکل امتحان میں ڈال دیا ہے۔

یہ امتحان میری تحریری صلاحیتوں کا امتحان ہے، میری یادداشت کا امتحان ہے، انسانوں کو سمجھنے اور ان کے معمولی رویوں کے غیر معمولی ہونے کی نشانیوں کو پہچاننے کی صلاحیت کا امتحان ہے، ضروری واقعات کو فروہی تفصیلات سے الگ رکھنے کے سلیقے کا امتحان ہے، کسی دوست کے علاج کی خاطر لکھنے کے تکلیف دہ عمل کو برداشت کرنے کی قوت کا امتحان ہے، سچ کا امتحان ہے جھوٹ کا امتحان ہے اور یقیناً کچھ ایسی باتوں کا امتحان ہے جن کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا... شاید ڈاکٹر جاوید جلیس جانتا ہوگا۔ اور اُسے جاننا بھی چاہیے اگر وہ سمجھتا ہے کہ میرے دوست فہیم ظفر کی زندگی... بلکہ کہنا چاہیے ہوشمندانہ زندگی کے آخری ایام کی میری لکھی روداد اُسے فہیم کے مرض کو سمجھنے اور شاید اُس کا علاج کرنے میں مدد دے سکتی ہے تو اُسے یقیناً 'لکھنے والا'، 'لکھا گیا' اور 'جس کے بارے میں لکھا گیا' ان سب کے بارے میں سب ظاہر و باطن سے آگاہ ہونا چاہیے۔ بہرحال یہ ڈاکٹر جاوید کا مسئلہ ہے، وہ جانے اور اُس کا کام جانے۔ لیکن اُس نے مجھے بہت بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔

میں نے کوشش کی تھی، بہت کوشش کی تھی کہ اُسے گفتگو اور مکالمے وغیرہ کے ذریعے ان تمام عجیب وغریب واقعات سے آگاہ کر سکوں جن کے نتیجے میں... شاید... فہیم عام روزمرہ کے باہوش نارمل لوگوں کی دنیا سے دور ہٹ گیا تھا اور اُس کا طرزِ عمل اور یقیناً طرزِ فکر بھی ایسا ہو گیا تھا کہ ذی ہوش دنیا کو مداخلت کرنا پڑی تھی اور بالآخر اُسے ڈاکٹر جاوید کے سپرد کرنا پڑا تھا۔ ڈاکٹر مذکور عام ماہرین امراض دماغی سے کچھ مختلف ہے ورنہ وہ اب تک فہیم کو ادویات اور دیگر

معالجاتی ہتھکنڈوں کے ذریعے دیوانگی سے دور بھگا دینے کی کوشش کر رہا ہوتا۔ مگر اُس کا کہنا ہے کہ فہیم کی دیوانگی کچھ غیر معمولی ہے اور وہ اُس کے پس منظر میں جانے کی ضرور کوشش کرے گا۔ اُس کا خیال ہے کہ میں اِس سلسلے میں اُس کی مدد کر سکتا ہوں کیونکہ میں فہیم کا دوست سمجھا جاتا ہوں۔ اور یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں کہ میں فہیم کی فرزانگی کے معدوم ہونے کا آخری عینی شاہد ہوں۔

مگر وہ شہادت اِس قدر عجیب وغریب ہے اور اتنی ناقابلِ یقین ہے کہ اظہار کی گرفت میں نہیں آتی۔ خود فہیم سے ان معلومات کو حاصل کرنا جو اُس کی دیوانگی کا باعث بنیں ناممکن ہے۔ اِس لیے نہیں کہ بیرونی عناصر کے لیے اپنی ذات کے بارے میں معلومات کا دروازہ بند کر دینا دیوانگی کا طرہ امتیاز ہے بلکہ یہاں سب اِس کے بالکل برعکس ہے۔ فہیم نے دیوانگی کے روزمرہ منطق کے برعکس اپنے اوپر ہزاروں دروازے کھول دیے ہیں جو وہ حسب حکم کسی پر بھی کھول دیتا ہے۔ یہ دروازے جو وہ خود اپنے اوپر کھولتا ہے وہ ہزارہا تحریریں ہیں جو اُس نے کارڈوں، چٹوں، لفافوں، مختلف جسامت کے کاغذوں اور سگریٹ کی ڈبیوں کے ٹکڑوں کی شکل میں اپنی ان گنت جیبوں میں ڈال رکھی ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ صورتحال کچھ مزید واضح ہونی چاہیے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ فہیم کیا کرتا ہے۔ فرض کریں آپ فہیم سے ملتے ہیں اور اُس سے اُس کا نام پوچھتے ہیں۔ تو وہ کچھ بولے گا نہیں وہ فوراً اپنی قمیض کی جیب میں سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر آپ کو دکھا دے گا۔ بظاہر عجیب ہے لیکن بہرحال یہ ایک معقول حرکت ہے۔ لیکن اب فرض کریں آپ کہتے ہیں فہیم صاحب آپ کا کارڈ بہت پھٹا پرانا ہوگیا ہے اِس کی مرمت کیوں نہیں کروا لیتے تو وہ جھٹ جیب سے ایک چٹ نکال کر آپ کو دِکھا دے گا جس کے اوپر آپ کے سوال کا جواب لکھا ہوگا۔ لیکن ہم ابھی بھی سوال جواب کی مادی معلوماتی سطح پر ہیں جہاں کارڈ، چٹیں، آویزاں تختیاں، سائن بورڈ، معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ جیسے آپ نے وہ گونگا بہرہ گداگر دیکھا ہوگا جو گلے میں ایک کارڈ لٹکائے پھرتا ہے جس پر اُس کی ابتلا کے بارے میں بنیادی حقائق درج ہوتے ہیں۔ لیکن قصہ یہ ہے کہ فہیم بنیادی حقائق کے سطحی مقام سے بہت آگے جا چکا ہے۔ میں جانتا ہوں آپ کو سمجھنے میں دقت ہو رہی ہے اور مجھے سمجھانے میں بھی۔

لیکن میں پھر کوشش کرتا ہوں۔ فرض کریں کہ اب میں اُس کا دوست آتا ہوں اور اُس سے کہتا ہوں "فہیم یار زندگی کس قدر لغو شے ہے۔" تو وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر فی الفور اپنی کسی جیب میں سے..... اُس نے بے شمار جیبیں بنوا رکھی ہیں۔ بلکہ آخری دنوں میں..... میرا مطلب ہے ڈاکٹر جاوید کے پاس لے جائے جانے کے وقت تو اُس نے کارڈوں سے بھرے چار تھیلے بھی تھام رکھے تھے..... تو خیر..... تو ہوگا یہ کہ زندگی کی لغویت کے بارے میں اپنے موقف کو ظاہر کرنے کے لیے فہیم کہیں نہ کہیں سے مگر حیرت انگیز سرعت سے کوئی کارڈ یا چٹ یا سگریٹ کی ڈبی کا ٹکڑا نکالے گا اور میرے سامنے رکھ دے گا۔ اُس پر کیا لکھا ہوگا۔ یہ میں آپ کو..... بتا نہیں سکتا۔ اِس لیے نہیں کہ بتانا نہیں چاہتا بلکہ بتا ہی نہیں سکتا۔ یہ بھی نہ سمجھیں کہ کارڈ خالی ہوتا ہے۔ نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں۔

میں نے ڈاکٹر جلیس کو وہ واقعات بتانے کی کوشش کی تھی جو کہ شاید..... میں کہتا ہوں شاید..... فہیم کی اُس ذہنی کیفیت کا سبب بنے تھے۔ مگر شاید ڈاکٹر کو اُن واقعات کی صداقت پر یقین نہیں آیا تھا۔ یا وہ سمجھتا تھا کہ میں کسی علامتی رمزیہ انداز میں بات کر رہا ہوں۔ یا اُس کا خیال تھا کہ باتیں قابو میں نہیں آتیں تحریر البتہ محفوظ رہتی ہے۔ میں نہیں جانتا لیکن کچھ ایسے ہی خیال سے میں نے اُسے پیشکش کی تھی کہ وہ فہیم ظفر کی دیوانگی کے حوالے سے میرا بیان ریکارڈ کرے اور میں پھنس گیا۔ اُس نے کہا ریکارڈ بھی تحریر ہی کی ایک شکل ہے کیوں نہ تم اُسے باقاعدہ تحریر کی شکل میں ہی دے ڈالو۔ میں نے بہت بہانے کیے۔ مثلاً یہ کہ مجھے لکھنے کا کچھ تجربہ نہیں گو کہ یہ ایک طرح سے جھوٹ ہی تھا۔ میری گرامر بہت کمزور ہے اور ذخیرہ الفاظ بہت محدود ہے۔ میری یادداشت انتہائی ناقابل اعتبار ہے۔ میری قریب کی نظر اس قدر کمزور ہے کہ مجھے تقریباً اندھا کہا جا سکتا ہے۔ میرا دایاں ہاتھ آج کل رعشے کا شکار ہے..... وغیرہ وغیرہ وغیرہ..... مگر اُس نے ایک نہ سنی اور کہنے لگا "دیکھو تم فہیم کی ہوشمندانہ زندگی کے آخری ایام، ماہ، سال وغیرہ کے بارے میں جو کچھ بھی لکھ سکتے ہو، جتنا بھی لکھ سکتے ہو، جیسا بھی لکھ سکتے ہو، وہ لکھو، جو چاہو لکھو، تمہیں مکمل آزادی ہے۔"

اب یہ ظلم ہے جو اُس نے سب سے بڑا میرے ساتھ کیا۔ مجھے لکھنے کی مکمل آزادی دے دی... جو چاہو لکھو... فہیم کی باہوش زندگی کے آخری ایام کے بارے میں ہی سہی مگر یہ ایک

بہت بڑی مصیبت کی بات ہے جو مجھے ایک لمحے میں انتہائی دلیر بناتی ہے اور دوسرے ہی لمحے میں میرا بیڑہ غرق کر دیتی ہے۔ اب مثلاً دیکھیں وہ دن وہ لمحہ جب فہیم نے پہلی بار اُس سارے معاملے بلکہ اُس سارے فساد کی جڑ کے بارے میں بتایا یعنی 'لکھے لکھائے' خطوط کی اُس دوکان کے بارے میں بتایا جہاں سے میرے خیال میں یہ ذہنی آفت شروع ہوتی ہے تو وہ دن، وہ لمحہ کیسا تھا، اِس کے بارے میں میرا کئی طرح کی باتیں لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ کیونکہ مجھے کہا گیا ہے بلکہ کبھی تو لگتا ہے کہ حکم دیا گیا ہے کہ جو چاہو لکھو۔

جب فہیم نے پہلی بار مجھے 'لکھے لکھائے' خطوط کی اُس ناقابل یقین دوکان کے بارے میں بتایا تو اُس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ دنیا نحوست سے بھری تھی اور موجودات پر لعنت برس رہی تھی..... مگر کیا واقعی ایسا ہی تھا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد میں کیا کہہ سکتا ہوں اور کیا یہ ضروری ہے مثلاً اگر میں یہ لکھ دوں کہ دنیا ایک لازوال حسن سے بھری تھی اور موجودات ہستی اور نیستی کے درمیان جھول رہی تھیں تو اُس سے کیا فرق پڑے گا۔ دنیا خواہ نحوست سے بھری ہو اور موجودات پر لعنت برس رہی ہو یا دنیا لازوال حسن سے بھری ہو اور موجودات ہستی اور نیستی کے درمیان جُھول رہی ہوں، اِس سب کلام سے، 'لکھے لکھائے' خطوط کی دوکان کی حقیقت پر کچھ فرق نہیں پڑے گا۔

'لکھے لکھائے' خطوط کی دوکان کی حقیقت جو فہیم نے مجھے بتائی اُس کا بیان کچھ اس طرح ہے۔

فہیم نے اپنے کسی دوست کو اُس کی سالگرہ پر مبارک باد کا خط لکھنا تھا۔ اُسے علم تھا کہ اس طرح کے خطوط 'لکھے لکھائے' مل جاتے ہیں۔ عبارتیں کسی بھی شخص سے اپنے اپنے تعلق کے حوالے سے بنی بنائی مل جاتی ہیں۔ بس تم ناموں کی خانہ پری کرو اور بھیج دو بات ختم ہوئی۔ فہیم کا بیان ہے کہ وہ انہیں سب توقعات کے ساتھ اُس دوکان میں داخل ہوا تھا جو شاہراہ پر واقع تھی اور اتنی الگ تھلگ تھی کہ بقول فہیم حیرت ہوتی تھی کہ یہ یہاں کیسے بنی ہے۔ ارد گرد درخت تھے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ فہیم کی اس طرح کی منظر کشی پر میں نے اُس پر کچھ نشے پانی کا شک کیا تھا مگر نہیں وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور ذہنی طور پر مکمل مستعد تھا۔ بہرحال وہ اُس دوکان میں داخل ہوا اور سالگرہ کے خطوط کے خانے کے سامنے پہنچ گیا۔ وہاں اُسے دوستوں کی

سالگرہ پر بھیجنے کے لائق 'لکھے لکھائے' چھ قسم کے خطوط ملے۔ کاش کہ اُن چھ میں سے کوئی ایک تو اُسے پسند آجاتی اور وہ خریداری کر کے اُس منحوس دوکان سے نکل جاتا۔ مگر افسوس ایسا نہیں ہوا۔ وہ چھ کی چھ عبارتیں جو دوستوں کی سالگروں پر اظہار جذبات کی خاطر خریدی جا سکتی تھیں فہیم کے لیے موزوں نہ تھیں۔ یعنی فہیم اور وہ جو کوئی اُس کا دوست تھا کسی دوسرے شہر میں غالبًا..... تو اُس کے ساتھ اپنے تعلق کے تمام تر پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ جس طرح کی بات خود کرنا چاہتا تھا وہ 'لکھی لکھائی' تحریریں اُس پر پوری نہیں اترتی تھیں۔ فہیم نے بتایا کہ اُس نے اُن 'لکھی لکھائی' چٹھیوں کو کئی طرح سے پڑھنے اور کئی طرح سے اُن کی تعبیر کرنے کی کوشش کی مگر پھر بھی اُس کے دل نے کہا "نہیں، نہیں"..... اِس ساری مصیبت میں لگتا ہے کہ اسے بہت دیر لگ گئی تھی۔ اور پھر اچانک اُس کے پاس سے ایک آواز سنائی دی جو دوکان کے مالک کی تھی۔

اب میں فہیم اور 'لکھے لکھائے' خطوط کی دوکان کے مالک کے درمیان ہونے والی گفتگو کو من و عن پیش کرتا ہوں۔ میرے لیے سہل رہے گا اور میں خود فقرے بنانے کے عذاب سے کچھ دیر کے لیے بچ جاؤں گا۔

دوکاندار نے کہا "لگتا ہے کہ آپ کے لیے دوست کی سالگرہ کا کارڈ منتخب کرنا کچھ مشکل ہو رہا ہے۔ میں جناب کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں۔"

فہیم نے کہا "دیکھیں، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ دنیا کے کوئی سے بھی دو دوستوں کے درمیان جس طرح کے بھی تعلق ہو سکتے ہیں، کیا اُن کو آپ کی اِن چھ 'لکھی لکھائی' چٹھیوں تک محدود کیا جا سکتا ہے۔"

"یقیناً نہیں۔ ہرگز نہیں۔" دوکاندار نے شدت سے کہا "لیکن جناب اگر آپ کو چھ سو ایسی ہی چٹھیاں دکھا دی جائیں تو شاید انتخاب کچھ آسان ہو جائے۔"

"چھ سو" فہیم حیرت سے بولا۔"

"نہیں چھ سو تو نہیں۔ لیکن پانچ سو ترانوے، ابھی ہم دوست دوست، مرد مرد، سالگرہ کی ترتیب کی مناسبت سے اتنی ہی امکانی 'لکھی لکھائی' عبارتیں وضع کر سکے ہیں۔ لیکن امکانات لامحدود ہیں۔ ہمارے لوگ کام کر رہے ہیں۔"

"لیکن یہاں تو..... صرف چھ ہیں۔"

"دیکھیں جناب یہاں ہم۔ انسانوں کے تعلق کی مقبول ترین صورتوں یا یوں کہیں چالو صورتوں کی مناسبت سے 'لکھے لکھائے' خطوط رکھتے ہیں۔ مثلاً دیکھیں، میاں، بیوی، سالگرہ، محبت، جوان العمر، اِس ترتیب میں یہاں صرف گیارہ کارڈ ہیں۔ لیکن اصل میں ہم گیارہ سو سے بھی آگے نکل چکے ہیں اور اگر ہم میاں، بیوی..... محبت، محبت..... نفرت، محبت..... محبت، نفرت..... نفرت، نفرت..... لالچ، نفرت..... حقارت محبت..... سچ، جھوٹ..... انتقام، محبت..... ٹھنڈا، گرم..... سالگرہ، سالگرہ..... کی سب ترتیبوں کو شامل کریں تو لکھی لکھائی تحریروں کی تعداد اب ترپن ہزار سے اوپر جا چکی ہے۔

"مگر یہ سب کہاں ہے" فہیم کہتا ہے کہ اُس نے ڈرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اِس کے لیے آپ کو میرے ساتھ دوکان کے عقب میں بنے تہہ خانے میں جانا ہوگا مگر وہاں جانے کے لیے آپ کو ایک چھوٹی سی شرط پوری کرنی ہوگی۔"

"وہ کیا" یقیناً جب فہیم نے یہ دو لفظ ادا کیے ہوں گے تو اُس کی زبان لڑکھڑا رہی ہوگی اور اُس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے قطرے پھوٹ رہے ہوں گے۔ اگر ایسا نہیں بھی تھا تو پھر بھی میں لکھ دیتا ہوں، ڈاکٹر جلیس نے مجھے کچھ بھی لکھنے کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔

فہیم نے بتایا..... اور اب میں یہاں مکالمہ لکھنے کا انداز چھوڑتا ہوں۔ اُس سے بات بہت کم ہو رہی ہے۔ فہیم نے بتایا کہ جواباً دوکاندار نے اپنی میز کی دراز میں سے 'لکھے لکھائے' کارڈوں کے دو بنڈل نکالے اور کہا کہ یہ گاہک اور دوکاندار کے تعلق کی مختلف صورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے گاہک کے دوکاندار اور یہ دکاندار کے گاہک کے نام مختلف امکانی پیغامات ہیں۔ آپ ان کا مطالعہ کریں اور میرا..... جو آپ سمجھتے ہیں آپ کے ساتھ تعلق ہے، اُس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مجھے منتخب کردہ 'لکھا لکھایا' پیغام دکھا دیں۔ کیونکہ ہم آمنے سامنے ہیں، ڈاک کا نظام بیچ میں نہیں۔ جواباً میں بھی اپنا پیغام دکھا دوں گا اور پھر ہم اِس طرح 'لکھی لکھائی' عبارتوں کا تبادلہ کرتے تہہ خانے کی طرف بڑھیں گے مگر ایک بات یاد رکھیں ہم ہرگز آواز اور گفتگو کو بیچ میں نہیں لائیں گے۔ اگر آپ کو منظور ہو اور آپ انسانوں کے غیر مقبول تعلقات کے غیر مقبول رشتوں سے جنم لینے والے پیغامات کو دیکھنا چاہیں گے تو..... ویسے میں وضاحت کردوں یہاں ہمارے تعلق کے یہ صرف بیس کارڈ ہیں۔ لیکن اصل میں گاہک، دوکاندار تعلق کی ساڑھے چار سو تحریری

شکلوں تک ہم پہنچ چکے ہیں۔ اگر ہم تہہ خانے میں جائیں گے تو وہ بھی ہمیں وہاں میسر ہوں گی۔"

فہیم نے بتایا کہ وہ شخص تیز تیز بول رہا تھا، اِس طرح کہ جیسے اُس کے پھیپھڑوں میں ہوا ختم ہو رہی ہے اور وہ اگلے ہی لمحے خاموش ہو جائے گا اور تیزی سے کوئی کارڈ اٹھا کر سامنے رکھ دے گا۔ پھر واقعی اُس نے یک لخت بولنا بند کر دیا اور قہقہہ لگانے کی ناکام کوشش کی اور پھر کارڈوں کے بنڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ فہیم نے بتایا کہ یہی وہ لمحہ تھا جب خوف کی ایک سرسراتی ہوئی لہر اُس کے جسم میں دوڑ گئی اور اُس ناقابل فہم مقام سے جلد از جلد دور بھاگ جانے کی شدید خواہش اُس کے دل میں پیدا ہوئی اور پھر اُس نے اپنے آپ کو دوکان کے باہر ایک جگہ سڑک پر موجود پایا۔ اور وہیں سے وہ میرے پاس اپنی روداد سنانے آیا۔ تعجب ہے اور مجھے اب خیال آتا ہے کہ فہیم نے مجھے آج تک نہیں بتایا کہ وہ دوکاندار دیکھنے میں کیسا تھا اور اُس دوکان کا اندرونی منظر کیسا تھا اور اب یہاں میرا خیال ہے کہ میں 'آزادی تحریر' کے اجازت نامے کا استعمال نہ کروں تو بڑی زیادتی ہوگی۔ چنانچہ 'لکھے لکھائے' خطوط کی دوکان کا مالک ایک دبلا پتلا طویل قامت شخص تھا۔ جس کی عمر کا کچھ اندازہ لگانا تقریباً ناممکن تھا۔ اُس کی آنکھیں راکھ جیسے رنگ کی تھیں جن میں کبھی کبھی کالے رنگ کی لکیریں دوڑ جاتی تھیں۔ دوکان ایک عجیب سرنگ نما تعمیر تھی جس کے عقبی حصے میں پہنچتے ہی روشنی نیلگوں ہو جاتی تھی اور یہیں سے دوکان کے مختلف کارندے نظر آنا شروع ہوتے تھے جو تیزی سے ایک دوسرے کو لکھے لکھائے کارڈ دکھا کر اظہار خیال کر رہے تھے۔ سناٹا گہرا تھا جس میں فقط کارڈوں کے تیزی سے حرکت کرنے کی پروں کی پھڑ پھڑاہٹ جیسی آواز سنائی دیتی تھی۔ کچھ ہی آگے نیچے اُترتی بل دار سیڑھیاں تھیں جو انسانوں کے نامعلوم تعلق کے تہہ خانے....."

مگر نہیں..... میں حد سے بڑھ رہا ہوں۔ فہیم نے آج تک مجھے تہہ خانے کا حال نہیں سُنایا۔ بلکہ اُس نے تو یہ بھی نہیں بتایا کہ آیا وہ کبھی وہاں گیا بھی تھا یا نہیں۔ میں..... میں واپس آتا ہوں، اُس لمحے میں..... اُس دن میں بلکہ رات میں واپس آتا ہوں جب فہیم نے پہلی بار مجھے یہ سب کچھ بتایا..... میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ مجھے اُس پر نشے پانی کا شک ہوا تھا۔ یہ شک مجھے کئی بار دور کرنا پڑا۔ پھر میں نے اُسے دیکھا تو مجھے شک ہوا کہ وہ کسی نامعلوم خوف کی کیفیت میں ہے۔ مگر پھر وہ کسی عجیب سی محویت کے عالم میں چائے پیتا رہا جو میں نے اُس کے لیے بنائی

تھی اور آپ ہی آپ مسکراتا دکھائی دیا۔ پھر جتنی دیر وہ میرے پاس رہا، اُس نے اور کوئی بات نہیں کی اور میرا شک کروٹیں بدل بدل کر میرے اندر گھستا چلا گیا مگر حیرت ہے کہ آخر میں مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کس بات پر شک ہے ہاں ایک بار مجھے شک ہوا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ مگر یہ شک بھی غلط ہی نکلا۔

اُس کے بعد کیا ہوا؟ جو کچھ بھی ہوا اُسے تحریری گرفت میں لانا میرے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر نے مجھے تحریر کی لامحدود آزادی دے رکھی ہے مگر یہ آزادی عجیب لایعنی جذبے میرے اندر اٹھا رہی ہے۔ جی چاہتا ہے گالیاں لکھوں۔ آہیں لکھوں۔ سیدھی سیدھی بکواس لکھوں۔ حتیٰ کہ 'کچھ نہ لکھنا' بھی لکھوں۔

میں 'جو چاہو لکھو' کے ظالمانہ جبر سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور اپنے اصل کام کی طرف آتا ہوں جو کہ مجھے سونپا گیا ہے یعنی فہیم کی ہوشمندانہ زندگی کے آخری ایام کے بیان کی طرف آتا ہوں۔ وہ ایام اب مجھے کچھ مناظر، کچھ مکالموں، کچھ کیفیتوں کے ٹکڑوں کی صورت میں یاد آتے ہیں۔ میں انہیں جوں کا توں بیان کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہوتا ہوں۔ آگے جاوید جلیس کی مرضی ان کے جو چاہے مطلب نکالے۔

فہیم آتا ہے اور دیر تک خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ پھر مجھ سے صرف ایک سوال پوچھتا ہے "تمہارا کیا خیال ہے، زندگی، انسان..... انسان، موت..... کی ترتیب میں تعلق کی کتنی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں"..... "میں کیا کہہ سکتا ہوں" میں اُسے تشویش سے گھورتے ہوئے کہتا ہوں۔ وہ مسکراتا ہے اور کہتا ہے "بہتر ہزار نو سو باسٹھ۔ مگر ابھی گنتی جاری ہے۔"

وہ ایک روز آتا ہے جبکہ آندھی چل رہی ہے۔ وہ دروازے میں کھڑا رہتا ہے اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے دور کچھ دکھاتا ہے۔ آندھی میں کاغذ کے ان گنت ٹکڑے اڑ رہے ہیں۔ میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں تو وہ غائب ہے..... "فہیم فہیم" میں آوازیں دیتا ہوں..... وہ جا چکا ہے۔

ایک رات سونے سے ذرا پہلے 'لکھے لکھائے' خطوط کی دوکان کو براہ راست اور فوری طور پر دیکھنے کی خواہش میرے اوپر مجنونانہ غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ میں فہیم کو ساتھ لے کر جانے کے لیے اُس کے فلیٹ پر پہنچتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ تو مدتوں پہلے وہاں سے جا چکا ہے۔ میں اُس کے سابقہ بیانات سے اخذ شدہ اُس دوکان کے پتے کی طرف چل پڑتا ہوں۔ رات گئے

شاہراہ 'ج' پر آوارہ گردی کرنے کے الزام میں پولیس مجھے پکڑ لیتی ہے۔ میں انہیں کہتا ہوں کہ اگر وہ مجھے میرے گھر تک لے جائیں تو میں وہاں پہنچ کر اچھی خاصی رقم انہیں دوں گا۔ ہم دوستانہ انداز میں گھر پہنچتے ہیں تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ فہیم وہاں پہلے سے موجود ہے۔ پولیس اُس سے پوچھتی ہے کہ وہ کون ہے۔ جواباً وہ حیرت انگیز سرعت سے اپنا شناختی کارڈ انہیں دکھاتا ہے پھر وہ پوچھتے ہیں کہ وہ اِس وقت وہاں کیا کر رہا ہے۔ وہ مزید سرعت سے ایک اور کارڈ نکال کر انہیں دکھاتا ہے مگر میں انہیں رقم دے کر دروازے سے ہنسی خوشی رخصت کر دیتا ہوں۔ فہیم سے میری مزید بات نہیں ہوتی۔ وہ فرش پر سو چکا ہوتا ہے اور صبح سویرے اٹھنے سے پہلے وہ جا چکا ہوتا ہے۔

ایک روز وہ مجھے سڑک پر مل جاتا ہے جبکہ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ میں اُس کا لباس دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں۔ اُس کے لباس میں جیبیں ہی جیبیں ہیں..... جیبیں ہی جیبیں ہیں۔ "یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔"

"میں ایک کائناتی لیٹر بکس ہوں" وہ رازداری سے کہتا ہے۔

میں ایک دفتر سے نکل رہا ہوں، وہ اچانک نمودار ہوتا ہے اور کہتا ہے "میری طرف سے ہر کسی کے لیے سب کچھ لکھا جا چکا ہے اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اِسی میں سے کاٹ کاٹ کر، پھاڑ پھاڑ کر دیتا جاؤں گا۔"

میں دیکھتا ہوں کہ وہ یہ فقرہ بمشکل ادا کرتا ہے جیسے اُس کے پھیپھڑوں کی ہوا ختم ہو چکی ہو۔

اور پھر ایک دن مجھے اطلاع ملتی ہے کہ فہیم کو ڈاکٹر جاوید جلیس کی تحویل میں دے دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر کے ساتھ میرا مکالمہ بے اثر رہتا ہے لیکن وہ مجھے فہیم کے بارے میں 'جو چاہو لکھو' کی آزادی دے دیتا ہے۔

میں اب اِس آزادی کا استعمال کر چکا ہوں۔ مگر خیال آتا ہے کہ ہرگز نہیں کر سکا۔ اب دیکھیں کہ جو مناظر کے ٹکڑے میں نے اوپر بیان کیے ہیں، ان کے درمیان کیا کچھ نہیں لکھا جا سکتا، کیا کچھ نہیں بھرا جا سکتا، کیا کچھ نہیں بکا جا سکتا۔

میں اپنی باغیانہ خواہش کا گلا گھونٹ کر اِس لعنتی کام سے مکمل نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں تو دروازے پر ایک مخصوص دستک ہوتی ہے۔ میں سمجھ جاتا ہوں کہ فہیم ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ ڈاکٹر جاوید جلیس کے چنگل سے کیسے نکل آیا ہے۔ میں اُس سے یہی سوال کرتا ہوں۔ حیرت انگیز سرعت سے وہ مجھے ایک کارڈ دکھاتا ہے۔ میں چیخ کر پوچھتا ہوں "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔" وہ تیزی سے مجھے ایک چٹ دکھاتا ہے۔ میں مجنونانہ انداز میں چیخ کر کہتا ہوں "دیکھو میں عجیب عذاب میں ہوں۔ مجھے تمہارے ڈاکٹر نے تمہاری ہوشمندانہ زندگی کے آخری ایام کا بیان لکھنے کو کہا ہے۔ بولو میں کیا لکھوں..... بولو..... بولو..... بولو..... فہیم ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرتا اور اپنی کسی اندرونی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا سے پھاڑا ہوا ایک ٹکڑا مجھے دکھا دیتا ہے۔

ڈاکٹر جاوید جلیس نے نرس سے کہا کہ وہ ان دو افراد کو جو اُس کے کمرے میں بیٹھے تیزی سے ایک دوسرے کو چٹیں، کاغذ، کارڈ، لفافے دکھا رہے ہیں، وہاں سے ہٹا لے جائے۔ نرس نے ایسا ہی کیا۔ ڈاکٹر نے گہرا سانس لیا اور مفروضے پر سوچا کہ شاید 'لکھے لکھائے' خطوط کا جنون ایک متعدی مرض ہے۔

پھر اُس نے اُن دو افراد میں سے ایک کے لکھے ہوئے کو، جسے وہ پہلے بھی پڑھ چکا تھا، بے خیالی سے اٹھایا اور بے خیالی سے ہی ایک جگہ نظر ڈالی..... جہاں لکھنے والے نے لکھا تھا.....

.....دنیا خواہ نحوست سے بھری ہو اور موجودات پر لعنت برس رہی ہو یا دنیا لازوال حسن سے بھری ہو اور موجودات ہستی اور نیستی کے درمیان جھول رہی ہوں، اُس سب کلام سے 'لکھے لکھائے' خطوط کی دوکان کی حقیقت پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔

سخت پلاسٹر میں اِندمال

آج شام چھ اور سات بجے کے درمیان کسی وقت میں نے اپنے اُس فیصلے پر عمل کر
ہے جو چند ماہ پہلے میں نے کیا تھا۔ اور وہ فیصلہ یہ تھا بلکہ وہ فیصلہ یہ ہے کہ میں ڈائری کلرک انوار
احمد کو اپنے ساتھ باہر سیر پر لے جانے کے بہانے اپنی موٹر سائیکل پر اپنے پیچھے بٹھاؤں گا۔ شہر
سے باہر نکل کر میں اپنی موٹر سائیکل کا رُخ اُس سڑک کی طرف کر دوں گا جو پہاڑی گہرائیوں
میں سے ہو کر گزرتی ہے اور پھر اُس سڑک کے تیسرے میل کے پاس ایک موڑ تک پہنچتے پہنچتے
میری رفتار یعنی میری موٹر سائیکل کی رفتار اتنی تیز ہو چکی ہوگی کہ اُس سے زیادہ تیز ہو نہیں سکے
گی۔ پھر میں موڑ کے اُس مقام کے سامنے پہنچوں گا جہاں حفاظتی جنگلہ موجود نہیں اور پھر میں
سڑک سے یک دم مُڑ کر اپنے آپ کو، موٹر سائیکل کو اور ڈائری کلرک انوار احمد کو اُس گہرے گڑھے
میں اُڑتا ہوا گرا دوں گا۔ مجھے یقین ہے، پتہ نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ اُس لمحے انوار کے حلق
سے ایک چیخ بلند ہوگی۔ ایک ناقابلِ یقین دہشت اُس کے دل میں پھٹ پڑے گی۔ اور ہم نیچے
کو گرنا شروع ہو جائیں گے۔ جیسے سٹنٹ فلموں میں موٹر سائیکلیں گرتی ہیں۔ یہ گھڑیاں میری نجات
کی گھڑیاں ہوں گی اور میں انوار کو جلد جلد بتانے کی کوشش کروں گا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو
رہا ہے اور کیسے ہو رہا ہے۔ جتنا بھی مجھ سے ہو سکا میں اُسے بتانے کی کوشش کروں گا۔ اور جلد
کیونکہ کششِ ثقل کے مکمل غالب آنے کے بعد میں اور ڈائری کلرک انوار احمد اور موٹر سائیکل
کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔

اِس وقت میں اُس کا انتظار کر رہا ہوں۔ موٹر سائیکل فلیٹوں کے نیچے اپنی معمول کی
جگہ پر تیار کھڑی ہے اور میں یہ سب لکھ رہا ہوں۔ کیوں؟ شاید اِس لیے کہ انتظار میرے لیے

عذاب بن رہا تھا اور میں اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھنا چاہتا تھا یا شاید اُس کی وجہ
یہ ہو کہ کہیں میرے اندر ہی اندر یہ خواہش پل رہی ہو کہ جو ہوگا اور جو ہونے والا ہے اُسے صرف
انوار ہی کیوں جانے! انوار کی کوئی خاص حیثیت نہیں۔ آج موٹر سائیکل پر میں اُس کی بجائے کسی
اور کو بھی بٹھا سکتا ہوں۔ ایسے کتنے ہی اور ہیں جنہیں میں آج کے سفر پر لے جانا چاہوں گا۔ وہ تو
اتفاق ہے کہ انوار فارغ تھا اور مان گیا کہ آ جائے گا۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ ہیڈ کلرک میری پیشکش
قبول کر لیتا کہ ذرا ہوا خوری ہو جائے گی۔ باقی کلرکوں میں سے کوئی بھی اگر اُسے سیر کے ساتھ
کچھ کھلانے پلانے کی لالچ دی جاتی تو یقیناً مان جاتا۔ اب یہ سوچ کر مجھے کس قدر مزا آ رہا ہے
کہ وہ اُن سب میں سے کوئی بھی ہو سکتا تھا جس کی آج کی شام میرے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے
گزر جاتی۔ لیکن خیر یہ ڈائری کلرک انوار تھا جو فوراً رضامند ہو گیا کہ آج شام وہ میرے فلیٹ یا
فلیٹ کیا آٹھ ضرب دس کا منحوس ڈربہ کہنا چاہیے میں آجائے گا اور ہم موٹر سائیکل پر باہر سیر
سپاٹے کے لیے نکلیں گے۔ تو شاید میں اِس لیے لکھ رہا ہوں کہ جو کچھ آج شام ہوگا اُسے جاننا
انوار کے علاوہ باقیوں کا بھی حق ہے۔ اور پھر لوگ جب تیسرے میل کے موڑ کے ساتھ گہرے
کھڈوں میں ہمارے آثار دیکھ کر یہاں پہنچیں گے اور کچھ ہمارا آگا پیچھا ڈھونڈیں گے تو اُس
وقت اگر انہیں یہ تحریر مل جائے تو کیا ہرج ہے؟ میرا خیال ہے کوئی ہرج نہیں۔ لیکن ابھی میرے
ذہن میں ایک تصور آیا ہے کہیں اِس تحریر کو پانے والے اِسے کوئی خودکشی سے پہلے لکھا گیا
خط۔۔۔ بلکہ وہ تو سمجھیں گے کہ خودکشی اور قتل دونوں سے پہلے لکھا گیا خط۔۔۔ قسم کی چیز نہ سمجھ
لیں اور یہ بُرا ہوگا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میرے فیصلے کو خودکشی یا قتل جیسی سیدھی سادی حرکت
سمجھ لیا جائے۔ میری حرکت جو آج ہوگی بہت پیچیدہ اور بہت مشکل ہے۔ مجھے اِس احساس سے
کہ میرے فیصلے پر سیدھے سادے حکم لگانا ممکن نہیں بہت سکون مل رہا ہے اور مجھے حوصلہ ہو رہا
ہے کہ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔

اور جو کچھ میرے ساتھ ہوا وہ بھی ہرگز کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو اِس قدر غیر
معمولی اور حیرت انگیز بات تھی کہ اب جبکہ میں اُسے بتانا چاہتا ہوں تو وہ پوری طرح میری گرفت
میں نہیں آتی۔ لیکن شاید اِس کی وجہ تو یہ ہے کہ میں نے برس ہا برس سے کچھ نہیں لکھا حتیٰ کہ کسی کو
خط بھی نہیں۔ مدتوں پہلے کچھ لوگوں نے مجھے شک ڈالا کہ میں اچھا خاصہ لکھ سکتا ہوں اور ان کی

باتوں میں آ کر میں نے کچھ اوٹ پٹانگ چیزیں لکھیں بھی اور میری خواہش ہوتی تھی کہ جلد از جلد میں وہ تحریریں ان کے علم میں لاؤں۔ ایک دن میں نے سوچا کہ یہ میں نے اپنے آپ کو کیسی لعنتی محتاجی میں ڈال لیا ہے۔ لعنت بھیجو اور اُس دن کے بعد سے میں نے پھر کچھ نہیں لکھا۔ لیکن اِس وقت میں سوچتا ہوں کہ اگر میں لکھتا رہتا تو شاید یہ جو کچھ اب آخر میں مجھے لکھنا پڑ رہا ہے زیادہ سلیقے سے لکھ پاتا۔ لیکن ابھی اچانک میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنے دل کا چور پکڑ لیا ہے اور وہ چور شاید ہر لکھنے والے کے دل میں ہوتا ہے۔ کیا میں اپنی اِس تحریر کی خوبصورتی پر بعد از مرگ داد پانے کی ہوس میں مبتلا ہو رہا ہوں۔ شاید یہی بات ہے اور اس بات پر میرا جی چاہتا ہے کہ میں ایک بھرپور قہقہہ لگاؤں لیکن میں قہقہہ نہیں لگا سکتا صرف مُسکرا سکتا ہوں، میری حقیقت درحقیقت اس طرح بیان نہیں ہو پا رہی۔ میں کیسے بتاؤں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی یہ جو میں نے قہقہے اور مسکراہٹ کا آگے پیچھے بار بار ذکر کیا ہے تو میں اُس سے ہرگز ہرگز کوئی علامت یا وہ کیا کہتے ہیں کوئی تشبیہ، استعارہ بنا کر کوئی دور کی کوڑی نہیں لانا چاہتا۔ بلکہ میں تو اپنے چہرے کے پٹھوں یا عضلات اور اعصاب کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں اور یہی دراصل وہ سب کچھ ہے جس کے نتیجے میں آج شام کسی وقت میری موٹر سائیکل تیسرے میل کے موڑ سے نیچے گرے گی اور اُس وقت میرے ساتھ میرے دفتر کا ڈائری کلرک انوار بھی ہو گا۔

سارا قصور میرے چہرے کی مسکراہٹ کا ہے جو پچھلے چند برسوں سے ایک اٹل شدت سے میرے ہونٹوں پر جمی ہے۔ میں چاہوں بھی تو، اور میں نے کتنا نہیں چاہا، جنون کی حد تک چاہا کہ میں کسی طرح اپنے چہرے کو اِس قابل بنا سکوں کہ وہ مسکراہٹ کے علاوہ بھی کچھ دکھا سکے۔ لیکن اِس وقت مجھے یہ شک ہو رہا ہے کہ جو کوئی میری اِس تحریر کو پڑھے گا وہ اِس مرحلے پر ایک عجیب طرح کی جھنجھلاہٹ میں ضرور مبتلا ہو رہا ہو گا کہ آخر یہ شخص کہنا کیا چاہتا ہے۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ میں جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہوں اُسے اندھا دھند بیان کرتا چلا جاؤں۔ کسی بھی لفظ یا فقرے پر دوسری بار غور کیے بغیر۔ میرے ساتھ چند برس پہلے ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ مجھے ہی نہیں یہ حادثہ بہت سے لوگوں کو پیش آیا جس کے نتیجے میں کچھ لوگ مارے گئے اور کچھ زندہ رہے۔ جیسا کہ اکثر حادثوں میں ہوتا ہے۔ میں ان درمیانی لوگوں میں شامل تھا جو نہ مرتے ہیں نہ جیتے ہیں بلکہ زخمی ہوتے ہیں۔ ہوش آیا تو میں آپریشن ٹیبل پر تھا۔ بتایا گیا کہ میرے جسم کی

شاید ہی کوئی ہڈی ہو جو سلامت رہی ہو۔ اور یہ کہ میرا بچ جانا تقریباً ایک معجزہ تھا۔ خود میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ میرا سارا جسم چکنا چور تھا لیکن میرا ذہن بالکل صحیح سلامت تھا۔ سرجنوں نے اپنی بہترین طبی مہارت کے ذریعے مجھے جوڑ جاڑ کر پہلی حالت میں بحال کیا اور سر سے پاؤں تک مجھے سخت پلاسٹر کے خول میں بند کر دیا تا کہ میرا جسم ہلے جلے اور اپنے آپ کو مزید نقصان پہنچائے بغیر شکستہ حصوں کے اندمال کا انتظار کرے۔

جن لوگوں کے ساتھ میرے جیسا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا وہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ سخت پلاسٹر کے خول میں مقید ہو کر اندمال کا انتظار کرنا کیسا تجربہ ہوتا ہے اور شاید میرے قلم میں بھی وہ طاقت نہیں کہ میں اُن کیفیتوں کو بیان کر سکوں اور نہ ہی شائد انہیں بیان کرنے کا کوئی مقصد یا فائدہ ہے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا میں خول کے اندر کہیں ہوں تو سہی مگر کہاں، اُس کا اندازہ نہ ہو پاتا تھا۔ لیکن پھر اچانک کہیں سے خول کے کسی غیر متعین حصے میں خارش یا درد کا کوئی احساس اٹھتا تھا اور میرے بدستور ہونے کے اُکھڑے سے خیال کو ذہن میں جما کر پھر غائب ہو جاتا تھا۔ ان دنوں مجھے یاد ہے کہ ایک تصور میرے خیال پر بے حد حاوی رہتا تھا اور میں کئی طرح اُس تصور سے کھیلا کرتا تھا۔ میں اپنے آپ کو ایک ریشم کا کیڑا گردانتا تھا جو اپنے کوئے میں بند تھا اور کوئے کے اندر اپنے تئیں تتلی بننے کی حسرت لیے بیٹھا کوئے کے پھٹنے کا انتظار کرتا تھا اور طویل راتوں کی گرم نیند میں تباہی اور موت کے خواب دیکھتا تھا۔

میرا اندمال بہت کامیاب رہا۔ میرے سب اعضاء ایسی کامیابی سے جڑ گئے تھے گویا کبھی ٹوٹے ہی نہ تھے۔ سب لوگ خوش تھے۔ میں خوش تھا۔ میرے معالج خوش تھے۔ ایک دنیا خوش تھی۔ خوشی کے اُن لمحات میں کسی نے اور نہ ہی میں نے اُس مسکراہٹ کا نوٹس لیا جو میرے ہونٹوں کے دائیں بائیں کناروں میں پٹھوں کے کسی مریضانہ کھنچاؤ کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ صحت یابی کے بعد مجھے دفتر جانا تھا اور اُس صبح میں کچھ پریشان تھا۔ کچھ تشویش تھی کچھ پیشگی بیزاری تھی کہ لوگوں کے طرح طرح کے سوالوں کا جواب کیسے دوں گا۔ میں ایسی ہی بدمزگی سی لیے آئینے کے سامنے آیا اور اپنے چہرے کے تاثرات کی تصدیق جیسے آئینے میں اپنے عکس سے چاہی مگر وہاں جو چہرہ میری طرف دیکھتا تھا اُس چہرے کے نقوش میں کوئی بیزاری کوئی تشویش نہ تھی بس مسکراہٹ تھی۔ سراسیمگی کی ایک لہر میرے بدن میں دوڑ گئی مگر وہاں

کوئی سراسیمگی نہ تھی مسکراہٹ تھی۔ سراسیمگی دہشت میں بدلی مگر وہاں کوئی دہشت نہ تھی مسکراہٹ تھی۔ اپنی اِس خوف زدگی پر سخت غصہ آیا مگر وہاں کوئی غصہ نہ تھا مسکراہٹ تھی۔ اپنے چہرے کے اس انوکھے فالج کا ادراک ہونے پر آنکھیں تو حیرت سے پھٹ گئی تھیں لیکن چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

یہ گویا سخت پلاسٹر میں اِندمال کے بعد کی دنیا کا آغاز تھا۔ سادہ لفظوں میں بات صرف اتنی تھی کہ اندمال کے بعد میں اگرچہ اور تو ہر طرح سے نارمل ہو چکا تھا لیکن میرا چہرہ ایک ایسے زندہ ماسک میں بدل چکا تھا جو صرف اور صرف ایک مسکراہٹ دکھا سکتا تھا باقی انواع واقسام کے جذبوں اور ہیجانی کیفیتوں کو چہرے کی متحرک لکیروں میں نچانے کی عیاشی کے وہ قابل نہ رہا تھا۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ میں خود جذبوں سے خالی ہو چکا تھا۔ میں کچھ لوگوں سے محبت بھی کرتا تھا اور نفرت بھی۔ حسد بھی تھا اور غصہ بھی۔ شرم، حیا، بے حیائی، آرزو، الجھن، بیزاری، کسلمندی، تھکن، انتقام، تاسف۔۔۔۔ یہ سب کچھ تھا بلکہ میں تو مُسکرانا بھی چاہتا تھا مگر مسکرا نہ پاتا کیونکہ مسکرا تو وہی شخص سکتا ہے جو کبھی نہ بھی مُسکراتا ہو اور میرے چہرے پر تو ایک دائمی مسکراہٹ جم چکی تھی۔ پاگل کیفیتیں آنکھوں میں ابھرتی تھیں مگر چہرے پر ہمیشہ کے لیے تبسم منجمد ہو چکا تھا۔ میری آنکھیں بھیانک نظر آنے لگیں۔ تو میں نے کالی عینک پہننی شروع کر دی۔

ڈاکٹروں اور ماہروں نے میرے کیس پر بہت سنجیدگی سے غور کیا اور ان کی تشریح بھی بالکل سیدھی سادی تھی اور میرے لیے بالکل قابل قبول تھی۔ کھوپڑی کے اندر باہر کے اعمال کو کنٹرول کرنے والے سات اعصاب ہیں۔ ان میں سے ساتواں چہرے کے عضلات کی حرکات وسکنات بشمول جذباتی کیفیات کو کنٹرول کرتا ہے۔ حادثے کے دوران یا اندمال کے عمل کے دوران میرے اُسی ساتویں عصب کو کسی سطح پر کچھ ایسا نقصان پہنچا تھا کہ میرے چہرے کے کچھ پٹھے ایسے اکڑ گئے تھے کہ دیکھنے والے کو ایک متبسم چہرے کا تاثر دیتے تھے۔ ماہروں کا خیال تھا کہ ایسا کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے مجھے بتایا کہ ساتویں عصب کے ضعف سے بعض اوقات بعض لوگوں میں ایسی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ کھانا کھاتے وقت اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں جیسے رو رہے ہوں۔ رونے سے مسکرانا تو بہرحال بہتر ہے۔ ایک معالج نے میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا تھا اور مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں یہ سب کچھ

بھول جانے کی کوشش کروں اور اُس کے ساتھ زندہ رہنا سیکھوں۔

میں نے کوشش کی کہ اپنے اُس نئے چہرے کو بھولنے یا اُس زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ زندہ رہنے کی کوشش کروں۔ مگر جلد ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ صرف میرا اپنا معاملہ نہیں۔ اپنی تحریر کی طرح اپنا چہرہ بھی بہت حد تک دوسروں کا معاملہ ہوتا ہے۔ آپ بھولنا بھی چاہیں تو وہ بھولنے نہیں دیں گے۔ آپ اُس کے ساتھ زندہ رہنا بھی چاہیں تو وہ اُسے آپ سے جدا کر کے آپ کو دکھاتے رہیں گے۔ لیکن پھر بھی میں اپنے آپ الزام نہیں دیتا۔ میں نے اتنی جلد حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ میں بڑی حوصلہ مندی سے ایک ایسے چہرے کے ساتھ دنیا کو دریافت کرنے نکل کھڑا ہوا تھا جس پر ایک اٹل مسکراہٹ کی پھنکار برس رہی تھی اور جو اپنے اُس منحوس تبسم سے دنیا والوں کو مسلسل 'سب اچھا ہے' کا سگنل دیتا تھا۔

میں خواہ مخواہ جذباتی ہو رہا ہوں اور ایسا ہونا میرے لیے بالکل لایعنی ہے۔ اگر میں جذباتی ہوں گا بھی تو بھلا کیا کر لوں گا؟ اِس وقت بھی اگر کوئی میرے اِس آٹھ ضرب دس کے ڈربے میں آئے تو وہ دیکھے گا کہ ایک بندہ بیٹھا خوش وخرم کچھ لکھتا ہے۔ کیا وہ یہ جان پائے گا کہ ساتویں عصب میں گڑبڑ کے نتیجے میں خندہ زن ہونے والے اِس چہرے کے پیچھے کیا ہے۔ اور یہی سب کچھ بتانے کے لیے میں نے دنیا والوں میں سے ایک شخص کا انتخاب کیا ہے جو اتفاق سے میرے دفتر کا ڈائری کلرک انوار احمد ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص قرعہ نکالے اور کسی کا نام نکل آئے۔ ورنہ انوار سے میری ذاتی دشمنی کوئی نہیں۔

میں مانتا ہوں کہ میں اپنے اِس سدا مسکرانے پر مجبور چہرے کے ساتھ دنیا سے معاملہ کرنے میں ناکام رہا ہوں۔ مگر آج کے آخری فیصلے پر عمل درآمد سے پہلے میں نے کوشش تو بہت کی۔ میں نے اپنے آپ کو ایسی ملازمتوں میں لگانے کی کوشش کی جہاں ہنستے مسکراتے چہروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے بڑی کوششوں سے کئی جگہوں پر ریسپشنسٹ کی نوکری حاصل کی۔ مگر مالک اپنے کمروں میں پھر بھی مجھے 'خوش اخلاقی' کا مظاہر کرتے برداشت نہ کر پاتے تھے: ''سنجیدگی اختیار کرو۔ میں کوئی لطیفے سنا رہا ہوں۔'' اِس عرصے میں کچھ واقعے تو ایسے ہوئے تھے کہ جو لوگ قہقہے لگانے پر قدرت رکھتے ہیں وہ اُن پر خوب قہقہے لگا سکتے ہیں۔ گروپ فوٹو ہوا۔ جیسا کہ روایت ہے سب لوگ مسکرائے کہ فوٹو میں اچھے لگیں۔ فوٹو کھنچا اور وہ نارمل ہو گئے۔

فوٹوگرافر نے میری طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا: "جناب، فوٹو تو کب کا بن گیا اور آپ ابھی تک مسکرا رہے ہیں۔ اب میری طرف سے آپ بے شک نہ مسکرائیں۔" اِس پر دفتر کے لوگوں نے خوب خوب قہقہے لگائے۔ "یہ ہمارا SMILEY ہے۔" "دراصل یہ ہمارا مسٹر چیر فل ہے" "یہ ہمیشہ خوش رہتا ہے۔" "سیوے یار ایک بات تو بتاؤ۔ تمہاری اِس خوشی کا راز کیا ہے؟" "اسے تو بھائی لگتا ہے دنیا میں کوئی غم ہی نہیں۔۔۔"

سخت پلاسٹر میں اِندمال کے بعد کی دنیا میں یہ سب کچھ میرے معمولات میں شامل ہو گیا تھا۔ میں بظاہر اپنی کھوپڑی کے ساتویں عصب کی اس کج روی پر شاکر ہو چکا تھا مگر یہ جھوٹ تھا۔ میرے دماغ کو جانے ولاے باقی چھ اعصاب بھی کچھ نہ کچھ ضرور متاثر ہو رہے تھے جو آخر مجھے اپنے اِس فیصلے پر لے آئے۔

اِس فیصلے سے پہلے بھی ایک واقعہ ہوا تھا۔ میرے ایک عزیز کی موت ہو گئی اور میں تعزیت کے لیے گیا۔ لوگ سوگ میں بیٹھے تھے۔ غم زدگی کی فضا تھی۔ میں بھی بیٹھ گیا اور کچھ ایسے فقرے بولے جس سے لوگ اپنے دکھ کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ سب تو مجھے گھور رہے ہیں اور سوگواری کی بجائے ان کے چہروں پر میرے لیے غصے اور شدید نفرت کے جذبات ہیں اور کچھ لوگ حیرت زدہ ہیں اور خوف میں ہیں جیسے بھیڑوں کے گلے میں بھیڑیا گھس آئے۔ غم واندوہ کی فضا میں ایک مسکراتے چہرے والا ایسا ہی تھا جیسے موسیقی کی محفل میں دھماکا۔ میں اٹھ گیا۔ کچھ کہے بغیر۔ اور اُسی دن میں نے یہ جان لیا کہ اب یہ سب مشکل ہے۔ اس چہرے کے ساتھ میں اب اِس دنیا میں چل نہیں سکتا۔ اور پھر وہ فیصلہ، جس پر آج مجھے عمل کرنا ہے، میرے ذہن میں جڑ پکڑتا گیا۔ ایک حادثے کا علاج کسی دوسرے حادثے سے ہی ممکن ہے۔ اور جیسے میں اپنے پہلے حادثے میں اکیلا نہیں تھا اب بھی کوئی تو میرے ساتھ ہونا چاہیے۔۔۔ زخمی بیل کے ساتھ اگر اُس کے زخم گودنے والی کوئی ایک آدھ مکھی بھی ماری جائے تو کیا ہرج ہے!

اِس وقت مجھے ایک عجیب احساس ہو رہا ہے کہ جب میں نے یہ سب لکھنا شروع کیا تھا اُس وقت میرے اندر لکھنے کا مزہ کچھ اور طرح کا تھا اور اب آخر میں کچھ اور طرح کا ہے۔ پتہ نہیں یہ کیا کیفیت ہے۔ میرا خیال ہے اب مجھے اور کچھ نہیں لکھنا۔ یوں بھی انتظار کی گھڑیاں اب

ختم ہونے کو ہیں۔ کمرے میں شام کا اندھیرا ہے جو مجھے نرم نرم چُھوتا ہے۔ میرے ہونٹوں کو بھی۔۔۔ جہاں وہی مسکراہٹ ہے۔

نیچے سیڑھیوں پر مجھے اُس کے قدموں کی چاپ سنائی دی ہے۔ انوار آ گیا ہے۔ پہلی سیڑھی، دوسری، تیسری.....

موٹر سائیکل کی چابیاں میرے سامنے رکھی ہیں!

ٹام اور جیری کی کارٹونی جدلیات:
ایک ''تحقیقی مقالہ''

ٹام اور جیری، دو متحرک کارٹونی کردار، جو ''ہانا'' اور ''باربرا'' نے 1939ء میں تخلیق کیے۔

ٹام ایک بلا ہے جب کہ جیری ایک چوہا۔ چوہے اور بلی کے ازلی اساطیری بیر کے پس منظر میں ہزاروں متحرک تصویری پُر مزاح افسانوی خاکے بنائے گئے جو ہر عمر کے ناظرین میں یکساں مقبول ہوئے۔ نامور فلمی نقاد ڈیوڈ ویسٹ، جس نے کارٹونی فلم کی جمالیات پر اہم نظری مباحث کا آغاز کیا، کے خیال کے مطابق ٹام اور جیری کی مقبولیت کا سبب سادہ معنوں میں محض چوہے اور بلی کی جدلیات نہیں بلکہ اس جدلیات سے انحراف بھی ہے جو ہیرو اور ولن کے روایتی تصور کو متزلزل کر دیتا ہے۔ اگر ٹام ایک ازلی ذلیل بلا ہے تو جیری ایک ازلی کمینہ چوہا ہے۔ اور کارٹونی مبالغے کے اسلوبِ اظہار میں اُن کی پُرتشدد کشمکش اگر ایک لمحہ ناظر کو جیری کی طرف داری پر اُکساتی ہے تو اگلے ہی چند لمحوں میں، جب جیری بے خبر سوئے ٹام کی دم سے بم باندھ کر اُسے اڑا دیتا ہے، تو ناظر کی ہمدردیاں ٹام کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں اور جیری نفرت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ناظر جیری کے لیے اپنے تنفر کو مستحکم بھی نہیں کر پاتا کہ ٹام جیری کو پنیر کی خوشبو سے مدہوش کر کے انتہائی عیاری سے اُسے کھولتے ہوئے تیل کے کڑھاؤ میں گرانے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح ٹام کی ذلالت پھر واضح ہو جاتی ہے۔ مگر پھر یہی وہ لمحہ ہے جب جیری ایک حرافہ مادہ پارہ بلی کا روپ دھار کر ٹام کی صنفی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر اُسے

انتہائی بے رحمی سے ایک روڈ رولر کے نیچے کچل دینے کا کامیاب منصوبہ بنالیتا ہے اور اس طرح یہ معاملات آگے بڑھتے رہتے ہیں۔

ڈیوڈ ویسٹ کے خیال کے مطابق خیر و شیر کی قوتوں کی اس تجسیم سے ناظر کی پیہم متغیر وابستگی اُس کے لیے ایک انوکھی وابستگی کا باعث بنتی ہے۔ درحقیقت ٹام اور جیری کی دنیا کے شاہد کے لیے اس بظاہر خوفناک تصادم کا نظارہ فرحتِ قلب کا باعث اس لیے بنتا ہے کہ وہ یہاں خیر و شر کی روایت طرف داری کے بوجھ سے آزاد رہتا ہے۔ حق و باطل کی روایتی جدلیات پر مبنی فلم گو کہ اپنے اختتام پر حق کی فتح پر منتج ہو کر ناظر کے تشنج جذبات کا سامان فراہم کرتی ہے مگر ٹام اور جیری کی کارٹونی کے زیرِ اثر واقعات کے امتداد کی مظہریت کچھ اس طرح مرتب ہوتی ہے کہ کتھارسس کے پُرلطف لمحات لمحۂ اختتام تک مؤخر ہونے کی بجائے خاکے کے مکمل اسکرینی زمان (Screen time) پر محیط ہو جاتے ہیں۔ حق باطل کو شکست دیتے ہی خود باطل کا روپ دھارنے لگتا ہے اور اُدھر شکست خوردہ باطل میں سے حق سر اٹھانے لگتا ہے۔ ولن ہیرو کے ہاتھوں سزا پاتا ہے مگر سزا یافتہ ولن تادیبی تازیانے کو کمال جرأت سے برداشت کرنے کے غیر معمولی کارنامے کے بعد خود ہیرو کے منصب پر فائز ہوتا نظر آتا ہے اور ماضی قریب کے ہیرو کو ایک سِفلہ وجود گردان کر اُس کی باطنی مخفی شیطنت کو انگیخت دے کر اُسے ولن کی جون اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ٹام جیری کو گھر کی مالکہ کے ہاتھوں پٹوانے کے لیے اُس کے جسم پر کالا پینٹ پھیر دیتا ہے تاکہ صاف شفاف کمرہ اُس کے قدموں کے نشانات سے غلیظ ہو جائے مگر اُس سے پہلے کہ ٹام اپنی اُس سازش میں کامیاب ہو جیری اُسے دھوکے سے ایک مقناطیس کھلا دیتا ہے اور لوہے کی ہر چیز اُس کے جسم سے آ کر چپکنے لگتی ہے حتیٰ کہ چھریاں اور لوہے کی گرم استری بھی، وغیرہ وغیرہ۔

ڈیوڈ ویسٹ نے ٹام اور جیری کی دنیا کے محرکات اور تحرکیات پر مبنی کارٹونی جدلیات کے اپنے اس نئے وضع کردہ نظریے کو اپنی کتاب ''متحرک تصویری خاکوں کی فلم میں جمالیات کی حرکیات'' (The Dynamics of Aesthetics in Animation Film)، مطبوعہ 1985ء، کیلیکسی پریس، نیو یارک میں تفصیل سے پیش کیا ہے اور آخر میں کارٹونی جدلیات کے اس تصور کو ایک تفہیمی عمل سے گزارنے کے بعد اُس کا اطلاق فلمی اظہار کی وسیع تر شکلوں پر کرنے

کی دعوت دی ہے۔ وہ لکھتا ہے: ''اگر خیر و شر، حق و باطل، سیاہ اور سفید کی بظاہر ازلی اٹل تقسیم کو دھندلا دیا جائے یا زیادہ بہتر الفاظ میں ایسا اہتمام کیا جائے کہ ٹام اور جیری کی دنیا کی طرح ایک ایسے زمانی و مکانی تسلسل کو مرتب کیا جائے کہ لمحہ بہ لمحہ حق باطل میں اور باطل حق میں بدلتا رہے تو اس طرح ہم ناظر کو صرف مزاح کے میدان میں ہی نہیں بلکہ تمام سنجیدہ موضوعات میں بھی ایک مسلسل ہیجانی کیفیت میں مبتلا رکھنے اور ایک کبھی ختم نہ ہونے والے کتھارسس کی لذت سے ہمکنار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو کہ ٹام اور جیری کی دنیا کا اصل تخلیقی انعام ہے۔ (ص 251۔)

ڈیوڈ ویسٹ کا ''کارٹونی جدلیات'' کا تصور اپنی 'ندرتِ تخیل' کے باوجود غالباً انسانی، فنی، تنقیدی اور نفسیاتی مسلمات سے اُس قدر متصادم تھا کہ قابل فہم طور پر شدید اور فوری تنقید کا نشانہ بنا۔ چنانچہ کرسٹوفر میزل نے رسالہ Film Critic (مطبوعہ بوسٹن، 1985ء، خزاں، ص 61-83) میں اپنے مضمون An Apology for Tom and Jerry ۔ میں لکھا: ''ڈیوڈ ویسٹ کی نام نہاد کارٹونی جدلیات کی بنیاد ہی غلط ہے۔ درحقیقت یہ نظریہ سازی ٹام اور جیری کے ناقص مطالعے پر مبنی ہے۔ اصل صورتحال یہ ہے کہ ٹام اور جیری کی جملہ کارٹونی فلموں میں ہمیشہ ٹام ہے جو جیری کے ہاتھوں مار کھاتا ہے یعنی غالب اور ظالم، مغلوب اور مظلوم کے ہاتھوں پٹتا ہے اور یوں ناظر کی جذباتی آسودگی کا سامان فراہم ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ان کارٹونی کرداروں کے خالق یعنی ہانا اور باربرا نے اعلیٰ پائے کی تخلیقی چالاکی یہ کی کہ انہوں نے بلی اور چوہے کے ہمارے آرکیٹائپل تصور کو الٹ دیا یعنی اب چوہا ظالم اور بلا مظلوم.....''

اس مضمون کے جواب میں ڈیوڈ ویسٹ نے Film Critic (بہار 1985ء) کے شمارے میں صرف اتنا جواب دیا: ''اگر کرسٹوفر میزل یہ جانتا ہے کہ ٹام اور جیری میں ظالم کی جگہ مظلوم نے لے لی ہے تو میں خود اور کیا کہتا ہوں۔ صرف یہ کہ مسٹر میزل سٹال میں بیٹھ کر فلم دیکھنے کی بجائے پیچھے ڈریس سرکل میں بیٹھ کر دیکھا کرے، اس طرح اُس کی تنقیدی صلاحیتوں میں اور بھی نکھار آئے گا۔''

میزل نے ویسٹ کی اُس پھبتی کا کیا جواب دیا، یہ تو معلوم نہیں لیکن 'کارٹونی جدلیات' کی تردید اور تنقید کا سلسلہ چل نکلا جو بتدریج نیم دلانہ تردید سے ہوتا ہوا محتاط تشریحی

تائید کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن فلم پروڈیوسر سڈنی شومیکر کا ویسٹ پر حملہ اتنا ہی شدید تھا جتنا کہ میزل کا جارحانہ تجزیہ۔ اُس نے ویسٹ کی وضع کردہ اصطلاح، ''کبھی ختم نہ ہونے والے کتھارسس کی لذت'' کو کسی سادیتی مزؤ کی حریصانہ ذہن کے مالک شخص کا ''گیلا خواب'' قرار دیا۔ علمی حلقوں میں بہرطور پیچیدہ نظری معاملات پر ''محض ایک فلم پروڈیوسر'' کے ریمارک کو کوئی اہمیت نہ دی گئی بلکہ 'کارٹونی جدلیات' کے تعقلاتی تجزیے پر کثیرالجہتی مباحث کا آغاز ہوا۔ ورجینیا یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ آف فلم آرٹس اینڈ کرافٹس کی پروفیسر ڈورتھی لی لینڈ نے شعبے کے سالانہ مجلے Light and Shade میں ٹام اینڈ جیری کے سو سے زیادہ خاکوں کا ڈیوڈ ویسٹ کی 'کارٹونی جدلیات' کے حوالے سے فریم بائی فریم از سرِ نو جائزہ لیا اور آخر میں اس رائے کا اظہار کیا: ''کارٹونی جدلیات، کے تصور کو من و عن قبول کرنا خواہ ناممکن ہی کیوں نہ ہو لیکن ویسٹ کے نظریات یقیناً سنجیدہ علمی تجزیے اور تحقیق کے مستحق ہیں۔''

اس طرح کا سنجیدہ علمی تجزیہ اور تحقیق Bernard Berofsky کی کتاب ''ٹام اور جیری کا جدلیاتی مبالغہ'' The Dialectical Exaggeration of Tom and Jerry مطبوعہ 1988ء کالوراڈو یونیورسٹی پریس) کی شکل میں سامنے آیا۔ یاد رہے کہ بیروفسکی اپنی کتابوں ''کیمرے کی میں'' (The 'I" of the Camera) اور Thematics and Problematics of a Motion Picture کے حوالے سے فلمی تخلیقات کے تاریخی، جمالیاتی اور فلسفیانہ مطالعے کے شعبوں میں خصوصی شہرت کا حامل ہے۔ بیروفسکی نے ڈیوڈ ویسٹ کے 'کارٹونی جدلیات' کے نظریے کا خصوصی جائزہ لینے سے پہلے جدلیات کے موضوع پر اُس کے وسیع تر تاریخی پس منظر میں بحث کی اور قبل از افلاطون سے لے کر مابعد المارکس تک مستند حوالے دے کر یہ حیران کن نظریہ پیش کیا کہ مغربی جدلیات ہمیشہ سے مبالغے کی حرکت کاری کے اصول کی مرتکب ہوتی رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جدلیات آگے نہیں بڑھتی۔ بیروفسکی کی کتاب کا یہ باب فلم تھیوری سے الگ خالص نظری حوالوں سے بھی خاصے کی چیز ہے۔ لیکن جدلیات کے پس منظر کو نئی فکری جہت دینے کے بعد جب بیروفسکی ویسٹ کی کارٹونی جدلیات کو زیرِ بحث لاتا ہے تو متحرک بصری فنون کے میدان میں بالعموم اور کارٹونی متحرک خاکوں کے میدان میں بالخصوص اہم فکری تشکیلات اور تشریحی حربوں کا اضافہ کرتا ہے۔ بیروفسکی کا کہنا ہے

کہ درحقیقت ویسٹ کی کارٹونی جدلیات کا کارٹونی مبالغے سے گہرا ساختیاتی رشتہ ہے۔ ویلرز نے خیر دشر کے ''مسلسل باہمی ہٹاؤ'' (Perpetual Displacement) کو جو بنیاد بنایا ہے وہ درست کیا ہے لیکن یہ Displacement بھی اصل میں کارٹونی مبالغے کی ایک شکل ہے۔ کارٹونی مبالغہ اگر کششِ ثقل، ٹھوس، مائع، گیس کی طبعی تقسیم؛ زندگی اور موت میں نامیاتی فرق؛ زندہ رہنے اور مرنے کی کم از کم شرائط وغیرہ وغیرہ کو رد کر سکتا ہے اور کارٹونی کردار گھاٹی کے آگے بھی دوڑتا ہوا جاتا ہے اور چند لمحے ہوا میں معلق رہنے کے بعد نیچے گرتا ہے اور روڈ رولر کے نیچے کچلے جانے اور ہموار تختہ بننے کے بعد بھی بھلا چنگا ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو آخر وہ زیادہ اعلیٰ نسلوں کی ناممکنات مثلاً اخلاقی، سیاسی، سماجی، ثقافتی، تاریخی اور سب سے بڑھ کر۔ اور موضوع سے زیادہ متعلق رہتے ہوئے۔ یہ کہ افسانوی، تنقیدی، نفسیاتی پر بھی کیوں حاوی نہیں ہو سکتا؛ یقیناً ہو سکتا ہے اور کارٹونی مبالغہ کارٹونی جدلیات کو بھرپور قوت فراہم کرتا ہے جس کے نتیجے میں خیر وشر، حق و باطل، سیاہ وسفید، حاکم ومحکوم، ظالم ومظلوم کی روایت اور فرسودہ تقسیم اگر رد نہیں ہوتی تو کم از کم غیر متعلق ضرور ہو جاتی ہے۔ بیروفسکی اپنے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کارٹونی جدلیات حقیقت اور غیر حقیقت کے تضاد سے جنم نہیں لیتی بلکہ موجودہ حقیقت اور کارٹونی حقیقت کے تضاد سے جنم لیتی ہے اور یہ تضاد ساختیاتی اعتبار سے کارٹونی مبالغے کی نشانیات (Conography) سے ناقابلِ تقسیم انداز میں منسلک ہے۔

آگے چل کر بیروفسکی کارٹونی جدلیات کی اساس یعنی کارٹونی مبالغے کے بارے میں ایک دلچسپ بات کرتا ہے: ''عام طور پر مبالغہ جھوٹ اور سچ کی روایتی منطقی اور اخلاقی تقسیم کے حوالے سے زیرِ بحث آتا ہے اور یہ ایک حد تک جائز بھی ہے۔ لیکن جدلیاتی مبالغہ بالعموم اور کارٹونی جدلیاتی مبالغہ بالخصوص سچ اور جھوٹ کی اٹل تقسیم کے طابع نہیں۔ کارٹونی مبالغہ نہ جھوٹ ہے نہ سچ۔ یہ سچ اور جھوٹ کے مابین لاتعلق جھوٹ سچ کا مطلق زمان ومکان ہے جہاں واقعات سچ سچ جھوٹ یا جھوٹ جھوٹ سچ، سچ جھوٹ جھوٹ، جھوٹ سچ سچ کی ان گنت ترکیبوں میں سے کسی طرح بھی جنم لے سکتے ہیں اور انسانی فطرت، کہ ازل سے محض جھوٹ سچ کی زنجیروں میں جکڑی ہے، ان انوکھی واقعاتی تعبیروں سے انوکھا حظ اٹھاتی ہے اور یہی وہ کیفیت ہے جسے ڈیوڈ ویسٹ ''ایک کبھی ختم نہ ہونے والے کتھارسس کی لذت'' کا نام دیتا ہے۔''

کارٹونی مبالغے کی دھندلی منطق (Fuzzy Logic) کی وضاحت کے بعد بیروفسکی اس تکنیک کے استعمال کی راہ میں حائل سنگین مشکلات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کارٹونی مبالغے کا ایسا تخلیقی استعمال، کہ اُس کے نتیجے میں سامنے آنے والی کارٹونی جدلیات قبولیت عامہ کا درجہ بھی حاصل کر سکے، ایک انتہائی مشکل مرحلہ ہے۔ ایسی تخلیقیت کے اصول کیا ہوں گے؟ اس پر بہت کچھ تفکر کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے بیروفسکی نے خود کارٹونی مبالغے کے تخلیقی اور غیر تخلیقی استعمال پر تفکر سے اجتناب کیا ہے۔ اگرچہ اُس نے مبہم انداز میں چند رہنما اصولوں کی طرف اشارہ بھی کیا ہے مثلاً ماورائی حقیقت پسندی (Transcendental Realism) جس کی پابندی اور حدود وقیود کارٹونی مبالغے پر قائم رہنی چاہییں۔ اسی طرح بصری جمالیات کے حوالے سے Visual Gestalt Formalism کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور اسی طرح مریضانہ نظاروں سے اجتناب (Avoidance of morbidity and sickness) وغیرہ وغیرہ۔

کارٹونی مبالغے کے تخلیقی اور غیر تخلیقی استعمال کے حوالے سے بیروفسکی کے یہ اشارے گو اہم ہیں لیکن محسوس ہوتا ہے کہ یہ فکری مشورے اس موضوع کی گھمبیر پیچیدگیوں کا پوری طرح احاطہ نہیں کرتے۔ یوں بھی یہ ضروری نہیں کہ کوئی نظریہ ساز اپنے نظریے میں زیرِ بحث موضوع کے تمام پہلوؤں کو سمو سکے۔ علم کی ترقی نظریات کے مسلسل ادھورے پن سے بھی جنم لیتی ہے۔ بہرطور یہ ضروری ہے کہ ہم اس موضوع کی وسعت اور پیچیدگیوں کا زیادہ تفصیل سے جائزہ لیں۔

کارٹونی مبالغے کے تخلیقی اور غیر تخلیقی استعمال کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے کسی مشکل تکنیکی بحث میں الجھنے کی بجائے زیادہ سودمند یہ رہے گا کہ ہم خود، الفاظ کی سطح پر ہی سہی، ٹام اور جیری کی فرضی تمثیل بنائیں جس کا عنوان ہی ''مثلاً کارٹونی مبالغے کا امتحان'' ہو۔ یہ کچھ مشکل نہیں۔

فرض کریں ٹام اور جیری کی مالکہ اُن کی آئے دن کی مار دھاڑ سے تنگ آ کر اُن کا ذہنی علاج کروانے کے لیے انہیں کسی ماہرِ نفسیات کے پاس لے جاتی ہے۔ ماہرِ نفسیات اُسے مشورہ دیتا ہے کہ ٹام اور جیری کو فوری طور پر کسی مفید تخلیقی کام میں لگنا چاہیے تاکہ ان کی توانائیاں

انسانیت کی فلاح کے لیے صرف ہوں۔ ایسا کام کیا ہو؟ بہت ردوکد کے بعد فیصلہ ہوتا ہے کہ ٹام اور جیری کو کارٹون فلم بنانے کا کام سکھانا مناسب ہوگا۔ مالکہ اُن کو فلم آرٹس اینڈ کرافٹس کی سب سے بڑی اکیڈمی کے ڈائریکٹر کے پاس لے جاتی ہے۔ ڈائریکٹر انہیں کارٹون فلم کے شعبے میں داخلہ دینے سے پہلے ان کا ''کارٹونی مبالغے کی صلاحیت'' کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ ایسے امتحان کسی بھی تعلیم ادارے میں داخلے سے پہلے لیے جاتے ہیں، کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے، حتیٰ کہ ٹام اور جیری کو بھی نہیں۔ ڈائریکٹر ٹام اور جیری سے کہتا ہے میں تمہیں دنیا میں سے ابھی دیکھ کر، چن کر چند واقعات دوں گا، تمہیں کارٹونی مبالغہ استعمال کر کے انہیں نئی تخلیقی شکل دینا ہوگی۔ یہ کہہ کر وہ اپنی عظیم الشان دوربین، جو بیک وقت خوردبین بھی ہے، کے ذریعے دنیا میں دیکھتا ہے۔ اِس دُور خوردبین کی کروڑوں ٹیوبیں ہیں جن میں ہر ایک کے آگے ایک لینز لگا ہے۔ اُس دُور خوردبین کی شکل ایک مشینی آکٹوپس جیسی ہے جس کے ذریعے اکیڈمی کا ڈائریکٹر دنیا کے ہر گوشے میں اپنے بصری پنجے گاڑے بیٹھا ہے۔ وہ دو واقعات چن کر ٹام اور جیری کو دیتا ہے۔

واقعہ نمبر 1: دنیا کے ایک گوشے میں کچھ لوگ خوشیاں مناتے ایک بارات کی شکل بنائے جا رہے ہیں۔ بارات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے دولہا دلہن بھی موجود ہیں۔ لوگوں کی خوشیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں تو ہوا میں گولیاں چلانے لگتے ہیں۔ اتفاق سے آسمان میں کچھ جہاز گزر رہے ہیں جو ڈیزی کٹر اور بنکر بسٹر بموں سے بجے ہیں۔ جہاز والے اُن کی گولیوں کے جواب میں مذکورہ بم چلاتے ہیں اور بارات والے انسانی قیمے اور خون کے چھوٹے بڑے ڈھیروں اور تالابوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ میرے پیارے ٹام اور جیری اب تمہارا امتحان یہ ہے کہ کاٹونی مبالغے کو اس طرح کام میں لاؤ کہ سب کچھ ہونے کے باوجود بارات والوں کو کچھ بھی نہ ہو اور سب کچھ بھلا چنگا رہے اور شادی بخیر وخوبی انجام پائے۔

واقعہ نمبر 2: دنیا کے ایک اور گوشے میں رہنے والے لوگ اس ذہنی بیماری کا شکار ہیں کہ وہ ہر قیمت پر دنیا کے کسی ایک ایسے گوشے میں جانا چاہتے ہیں جہاں مزے ہی مزے ہیں۔ وہ سبزیوں اور پھلوں کے ایک بہت بڑے فریزر ٹرک میں چھپ کر مزے ہی مزے والے گوشے میں جا پہنچتے ہیں لیکن ایک تو رستے میں اُن کے سانس کی ہوا ختم ہو جاتی ہے اور دوسرے سردی

بہت بڑھ جاتی ہے۔ نتیجتاً جب وہ اپنے خوابوں کی سرزمین تک پہنچتے ہیں تو منجمد ٹماٹروں، ٹھنڈے ٹھار آلوؤں اور یخ بستہ پھلوں جیسے ہی نکلتے ہیں۔ سادہ لفظوں میں یوں کہہ لو کہ مرے ہوئے نکلتے ہیں۔

ٹام اور جیری اب تمہارا کام یہ ہے کہ 'کارٹونی مبالغے' کو کام میں لاتے ہوئے ایسا سکرپٹ لکھو کہ یہ لوگ زندہ سلامت اپنی جنت میں پہنچ جائیں اور سب ٹھیک ٹھاک رہے۔

فرض کریں ٹام اور جیری طویل سوچ بچار کے بعد مندرجہ ذیل کارٹونی مبالغے پیش کرتے ہیں جو انجام بخیر، سب ٹھیک ٹھاک ہے اور اچھا وہی جس کا انجام اچھا ہے پر منتج ہوتے ہیں۔

واقعہ نمبر 1:

(1) ڈیزی کٹر بموں کے اندر کچھ ایسے مرکبات بھی ہیں جو باراتیوں کے انسانی قیمے میں موجود الگ الگ قسم کے DNA مالیکیولز پر ایک پیچیدہ Biochemical عمل کرتے ہیں اور ہر باراتی کا ایک ایک کولون تیار ہو جاتا ہے اور وہ ہنستا کھیلتا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ بارات شادیانے بجاتی شادی کی منزل کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔

(2) باراتیوں میں شامل ایک روحانی پیشوا، جو مسلسل انہیں شادیانے بجانے سے منع کر رہا ہے، قیمہ بننے کو ان کے گناہوں کی سزا قرار دیتا ہے لیکن خود اپنی روحانی قوت کے بل بوتے پر محفوظ رہتا ہے۔ مگر اُسی مرحلے پر وہ اچانک اپنے قبیلے کی تباہی پر جلال میں آ جاتا ہے اور اپنی قوت استعمال کر کے نہ صرف انہیں دوبارہ زندہ کرتا ہے بلکہ اینٹی گریوٹی قوت استعمال کر کے بموں کو واپس جہازوں کی طرف روانہ کر دیتا ہے اور وہ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بارات آگے روانہ ہو جاتی ہے۔

(3) ڈیزی کٹر اور بنکر بسٹر عظیم الجثہ بم بڑے طمطراق سے گرتے ہیں مگر مقابلے میں چھوٹی چھوٹی گولیاں دیکھتے ہیں تو ان کی بھی غیرت جوش میں آتی ہے اور وہ اس قدر کمزور اور نحیف ونزار دشمن کا مقابلہ کرنا فی الحال اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور شرمندہ

ہو کر اپنا رخ مستقبل کی طرف کر دیتے ہیں۔ بارات محفوظ۔

واقعہ نمبر 2:

(1) فریزر ٹرک میں سوار ایک جنتِ ارضی کا متلاشی کمیسٹری کا طالب علم بھی موجود ہے۔ جب ہوا کی کمی اُن کا گلا گھونٹنے آتی ہے تو وہ فوراً ٹرک کی بیٹری میں سے تاریں نکال کر ریڈی ایٹر کے پانی میں ڈال دیتا ہے۔ پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن میں بدل جاتا ہے۔ آکسیجن کو سب استعمال کرتے ہیں، ہائیڈروجن پر لعنت بھیجتے ہیں اور یوں سب زندہ سلامت منزلِ مراد پر جا پہنچتے ہیں۔

(2) فریزر ٹرک سبزیوں پھلوں سمیت ایک خفیہ ادارے کی انتہائی خفیہ لیبارٹری میں جا پہنچتا ہے اور یہ چوٹی کا خفیہ انکشاف ہوتا ہے کہ اصل کارگو تو یہی منجمد انسان تھے جن پر Freeze اور Defreeze کرنے کا تجربہ کرنا ایک پہلے سے بنے خفیہ در خفیہ منصوبے کا حصہ تھا۔ Defreezing بہت کامیاب رہتی ہے اور سب لوگوں کو انتہائی معقول معاوضے اور جاب دیے جاتے ہیں۔ آخر میں یہی لوگ اپنے ہم وطنوں کو اس انسان دوست ایجنٹ کا پتا بنانے کے لیے خط لکھتے دکھائے جاتے ہیں۔ اُن کے چہرے سرسبز و شاداب ہیں۔

(3) جب قابلِ استعمال ہوا کی مقدار کم ہو جاتی ہے تو آمدہ متوقع موت کو ٹالنے کے لیے سب ٹھنڈے ٹھار انسان اپنے ذہنوں کو پہلی بار استعمال کرتے ہیں اور ایک منصوبہ سامنے آتا ہے۔ اگر کسی طرح ہم سفر پھلوں کی خوشبو آگے بیٹھے ڈرائیوروں اور ٹرک کے عملے تک پہنچا دی جائے تو ہو سکتا ہے اُن کے دلوں میں پھل کھانے کی خواہش جاگے اور وہ فریزر کا یہ حصہ کھولیں اور اُن کی حالت دیکھ کر انہیں نکال لیں۔ ایک انتہائی باریک تار کو خالی کراس کی ٹیوب کو اگلے حصے میں گھسایا جاتا ہے اور پھلوں کی خوشبو باقی ماندہ سانسوں کے ساتھ عملے تک پہنچائی جاتی ہے۔ آخری سانسوں سے چند لمحے پہلے ہی عملے میں ثمر خوری کی خواہش جاگتی ہے۔ فریزر کھولا جاتا ہے۔ زندگی کی امید پھیل جاتی ہے۔ فریزر ٹرک کا عملہ ٹھنڈے ٹھار لوگوں کو نکالنے سے پہلے

خوب پھل کھاتا ہے اور سب کا انجام مثبت ہوتا ہے۔

اکیڈمی کا ڈائریکٹر ٹام اور جیری کے مہیا کردہ کارٹونی مبالغوں کے متبادلات کو دیکھتا ہے اور اطمینان سے سر ہلاتا ہے پھر عدم اطمینان سے سر ہلاتا ہے اور کہتا ہے: ''یہ سب تو ٹھیک ہے مگر یہ بھی تو بتاؤ کہ دونوں واقعات کے لیے الگ الگے سب سے زیادہ تخلیقی کارٹونی مبالغہ کون سا ہے۔ تم خوب سوچ کر جواب دو اور اپنا وقت لو۔

ٹام اور جیری، کہ پہلے ہی اپنی ذہنی صلاحیتوں کا بے محابا استعمال کر چکے ہیں، سوچ میں پڑ جاتے ہیں اور خوب اپنا وقت لیتے ہیں حتیٰ کہ 'دور خوردبین' میں سے پھر بموں کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ ٹام اور جیری بے حد متاثر ہوتے ہیں اور ان کے سروں سے دھواں نکلنے لگتا ہے۔ ٹام کا سارا جسم مرنے والا ہو جاتا ہے اور وہ دیوانگی کے عالم میں جیری پر جھپٹتا ہے تو جیری بجلی کی سرعت سے ڈائریکٹر کی پتلون میں گھس جاتا ہے۔ ڈائریکٹر چیخ مار کر اٹھتا ہے تو اُس کا سر آکٹوپس مشین سے جا ٹکراتا ہے۔ وہ اور بھی زور سے چیختا ہے: ''رک جاؤ ٹام اور جیری، اگر تمہیں یہ واقعات پسند نہیں تو میں تمہیں اور واقعات دیتا ہوں۔ کارٹونی مبالغے کے امتحان کے لیے میرے پاس واقعات کی کوئی کمی نہیں۔ کوئی کمی نہیں......''

اِس تمثیل کے آخری حصے کا مقصد محض اِس علمی اور نظری حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اگرچہ ڈیوڈ ویسٹ کی 'کارٹونی جدلیات' اور اُس پر برنارڈ بیروفیسکی کی کارٹونی مبالغے کی تشریحی تفسیر، فلم بطور فن، کے میدان کی اہم تعقلاتی (Conceptual) پیش رفت ہے لیکن کارٹونی مبالغے کا تخلیقی اور غیر تخلیقی استعمال ہنوز ایک کھلا سوال ہے اور جمالیات آرٹ، فلسفۂ آرٹ کے ماہرین کے لیے ایک چیلنج ہے۔ یہ درست ہے کہ بعد میں یہی سوال اور خاص طور پر ڈیوڈ ویسٹ کی 'کارٹونی جدلیات' کی بحث تاریخی، مابعد الجدیدی، مابعد السامراجی، مابعد القومی، مابعد البصری اور مابعد البعدی سمتوں کی طرف بھی مڑ گئی اور اِس ضمن میں بالترتیب ہینز سلوگا (Hans Sluga) رچرڈ پرٹل (Richard Pertal)، ڈایانا راف مین (Diana Roffman)، جوزف میڈولا (Joseph Medola) اور گورڈن گراہم (Gordon Grahm) کے کام

خصوصی اہمیت کے حامل ہیں لیکن جائز طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ موضوعات زیرِ نظر مقالے کے دائرہ کار سے خارج ہیں۔ امید کی جا سکتی ہے کہ دیگر مقالہ نگار ان پہلوؤں کو بھی ضرور زیرِ بحث لائیں گے۔

حوالہ جات: محققین کے رجوع کرنے کی صورت میں خفیہ طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ایک ناممکن کہانی

(۱)

ان دنوں میں س ش شہر کی کسی غلیظ آبادی کی ایک انتہائی غلیظ کوٹھڑی میں رہا کرتا تھا۔ جس کی دیواروں میں رچی صدہا برساتوں کی نمی اور کونے کونے میں پھیلی ازلی تاریک سڑانڈ آمیز ہوا، کاکروچوں، جھینگروں، کھٹملوں اور چھپکلیوں کی ان گنت نسلوں کو پروان چڑھا چکی تھی۔ زندگی کی یہ ارزل اقسام گذشتہ کئی ماہ سے ہر رات کونے کھدروں میں اپنی خوراک تلاش کرنے کے علاوہ میرے زندہ جسم کو مکمل تنہائی سے محفوظ رکھنے کا کام بھی سرانجام دے رہی تھیں۔ میرے بازوؤں، ٹانگوں اور چہرے پر رینگتی ان کی نحیف لرزتی سویوں جیسی ٹانگیں بار بار مجھے یہ احساس دلاتی رہتیں کہ میں بان کی کھاٹ، چھت کی چوبی کڑیوں اور کوٹھڑی کے پتھریلے فرش سے قدرے مختلف شے ہوں۔

وہ کوٹھڑی ایک منحوس صورت بوڑھے کی ملکیت تھی جسے لوگ میرا رشتے دار کہنے پر مصر رہا کرتے تھے۔ مردہ مچھلی کی جیسی آنکھوں اور چیل کے پنجوں جیسے ہاتھوں والا وہ بوڑھا میرے مردہ باپ کا بھائی تھا اور وہ کوٹھڑی س ش شہر کی غلیظ آبادی میں واقع اس کی دکان کا عقبی سٹور ہوا کرتی تھی۔ مجھے اس کوٹھڑی میں لاموجود کرنے میں میری تباہ حالی، فاقہ زدگی اور بے روزگاری سے زیادہ بوڑھے کے خدا ترسی، اقربا پروری کے ان جذبات کا دخل تھا جو ثواب کے ذخیرے میں اضافہ کرنے کے مشتاق لوگوں کے دلوں میں کسی رشتے دار کو مرتے سڑکوں پر مارے مارے پھرتے دیکھ کر کبھی بیدار ہو جاتا کرتے ہیں۔

میرے ساتھ یا اس بوڑھے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ کئی ماہ پہلے اس نے مجھے اس قسم کی حالت میں شہر کے کسی فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھے دیکھا تھا۔ اس دن جبکہ میرے باپ کو مرے تین سال، میری ماں کو گنجے سر والے بے تکے رنڈوے سے شادی کئے دو سال اور مجھے بذات خود ملازمت سے برطرف ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ میں فٹ پاتھ پر بیٹھا اپنے لباس کے کوٹ نما حصے کی جیب میں ہاتھ ڈالے پانچ پیسے کے سکے پر ٹکسال کی مہریں ٹٹول رہا تھا اور میری ندیدی آنکھیں ''نان چھولے'' کی دوکان کا طواف کر رہی تھیں۔ سکہ میری انگلیوں کی حرارت سے گرم ہوا تو میں نے اسے باہر نکال لیا تھا اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں نے اُس کی اُوپر اُبھری عبارتیں اور تصویریں بلاوجہ غور سے دیکھ ڈالیں تھیں۔ چاند تارہ۔ مینارِ پاکستان۔ پودے کی ڈالیاں۔ پیداوار بڑھاؤ۔ 5 پیسہ۔ چاند تارہ۔ مینار۔

میرے ساتھ سب کچھ ہو رہا تھا جب چچا قدرت اللہ کی نگاہ مجھ پر پڑی تھی۔ پھر میں نے اس کی کھنکارتی بلغم زدہ آواز میں کچھ ایسے فقرات سنے تھے جو کسی جاندار سے اپنی ہمدردی اور رحم ظاہر کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں... تھوڑی ہی دیر بعد میں س ش شہر کی غلیظ آبادی کی جانب اس کے پیچھے پیچھے قدم گھسیٹ رہا تھا۔

اس دن میں نے اس کے ساتھ چل پڑنا کیوں قبول کر لیا تھا؟ شاید اس لئے کہ میں جلد از جلد اپنے معدے کا خلاپُر کرنا چاہتا تھا یا شاید وہ ایک بے کار قسم کا تجسس تھا جو مجھے وہاں لے گیا! وجہ کچھ بھی ہو اس دن کے بعد میں بوڑھے کی نیکیوں میں اضافہ کرنے کے لئے ہر رات ایک ثواب مجسم بن کر اپنے آپ کو اس سیلن زدہ کوٹھڑی میں موجود کرنے لگا جس کی دیواروں سے گیلے چونے کے کھرینڈ سدا جھڑا کرتے اور کاکروچوں کے سکون میں ایک دائمی خلل کا باعث بنتے۔ اس کوٹھڑی سے میرا تعلق گویا اندھیرے کا تعلق بن گیا۔ س ش شہر پر اُمنڈتی راتوں کا اندھیرا! میرے پیٹ میں سنسناتی بھوک کا اندھیرا! یہ اندھیرے ہر رات مجھے گھسیٹتے دھکیلتے وہاں لے جاتے اور پھر وہی جمے سالن۔ باسی روٹیوں کے ٹکڑے۔ ایلومینیم کے چکنے گلاس... پانی کی کھاٹ... کاکروچ۔ کھٹمل۔ سڑانڈ... ایک رات... دو راتیں... تین راتیں... کئی راتیں... راتیں کہ جانداروں کے سونے اور آرام کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں! پس ہر رات میں بھی ہر حیوانِ ناطق کی طرح سو جاتا اور خواب دیکھا کرتا۔ وہ تمام خواب جن کا ذکر نفسیات کی کتابوں اور

اسلامی جنتریوں کے تعبیر ناموں میں پایا جاتا ہے... اجنبی چہرے۔ جانے پہچانے چہرے۔ کھمبے۔ درخت۔ غار۔ کھائیاں۔ سانپ۔ آگ۔ بجلی۔ طوفان... ملازمت کے لئے انٹرویو دینے والوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی قطاریں جن میں کھڑے تمام افراد میرے ہم شکل بن جاتے جنسی عمل میں اُلجھے۔ جسم پٹختے۔ چیختے چلاتے بے حد بوڑھے مرد عورتیں۔ غسل خانے مسجدوں کے حجرے۔ ہوا میں اپرتی بین بجاتی بھینس... بے سروپا۔ دلچسپ ڈراؤنے شہوت انگیز۔ کراہت انگیز مناظر کے گڈ مڈ ہوتے سلسلے دھندلاتے، پھیلتے۔ واضح ہوتے اور پھر بکھر جاتے ____ میں اپنے آپ کو ایک وسیع و عریض مرغزار میں گھومتا پاتا ہوں۔ چاروں طرف گڑتے پہاڑوں پر چمکتی برف آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ مرغزار میں رنگ بکھرتے ہیں اور نیلے پانی کی جھیلوں کے کنارے ان گنت رنگوں کے پھول کھل جاتے ہیں۔ پھر اچانک مرغزار کے بیچوں بیچ ایک پتلی سی بدرو نمودار ہوتی ہے اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے پھیل کر ایک گندہ نالہ بن جاتی ہے۔ جس میں پھولی ہوئی انسانی لاشیں تیر رہی ہیں۔ جن کی شکل کتوں جیسی ہے۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے بدن میں دوڑ جاتی ہے۔ میں دیوانہ وار اس نالے سے دور بھاگ جانا چاہتا ہوں! نالے کا ایک کنارہ میرا تعاقب شروع کر دیتا ہے اور ایک بلند و بالا پہاڑ میرا راستہ مسدود کر دیتا ہے۔ کنارہ مجھے چھونے کو ہے۔ قریب... قریب... اور قریب...

کچھ اسی طرح کی دہشت سے ہر رات میری آنکھ کھل جایا کرتی تھی اور میں کھاٹ پر آڑے ترچھے پڑے چکٹ رضائی میں ملفوف اپنے لرزتے جسم کو پسینے سے شرابور پاتا تھا تب میری جلد پر لہو اور پسینے کے نمک کا شکار کھیلتے کسی کھٹمل کا تازہ وار مجھے مزید بیدار کر دیتا اور میری آنکھیں ہر رات کی طرح ایک بار پھر دیوار کے شگاف پر جا ٹکتیں۔ جس سے گذرتی پچھلے پہر کے چاند اور سٹریٹ لیمپ کی روشنی خالی بوریوں اور کریٹوں کے ڈھیر پر کس ظالمانہ شدت سے ایک زرد مستطیل گرایا کرتی تھی۔ آنکھیں شگاف سے پلٹ کر مستطیل پر لوٹ آتیں۔ پٹ سن کی بوریوں کے کونے۔ لکڑی کے خالی ڈبوں کے کنارے... چیزوں کے ننھے ننھے ہاتھ! زرد مستطیل کے بوجھ تلے ہانپتے اس بوجھ کو پرے دھکیل دینے میں مصروف نظر آتے... اس وجود کو جو کسی اجنبی دنیا کے جارح فاتح کی طرح کوٹھڑی کی سرد تاریک دنیا کے ذرّے ذرّے سے اُٹھتی احتجاج کی کرب ناک مبہمن آوازوں پر ڈھٹائی سے قہقہے لگا تا اسے چھیدنے، برہنہ کرنے کے درپے نظر

آتا تھا۔

آوازیں! میرا وجود میرے کانوں میں سمٹ آتا۔ کاٹھ کباڑ کے ڈھیر تلے چوہوں کے خاندان کی گھسر پھسر مدھم سرسراہٹیں۔ کھاٹ کی چرچراہٹ۔ دھاتی اجسام کے کوٹنے اور رگڑنے کی آوازیں۔ دیواروں کے اس پار کسی دوسری دنیا کی آوازیں... میں چپکے سے اپنے آپ کو بتلایا کرتا کہ یہ اس فیکٹری کی آوازیں ہیں جو دور کہیں س ش شہر کے کسی کونے میں اب بھی موجود ہے۔ جہاں ہزاروں مکان ہیں اور مکانوں میں لاکھوں انسان بستروں کی حرارتیں اپنے گرد لپیٹے کروڑوں خواب دیکھ رہے ہیں۔ دیوار کے شگاف کے پار غیر حقیقت کا ایک وسیع خلا ہے۔ جس میں صرف خواب ہیں۔

میں رضائی کو پرے جھٹک کر اُٹھتا اور آہستگی سے اپنے پاؤں کوٹھڑی کے ادھڑے فرش پر ٹکا دیتا۔ پاؤں کے تلوے ٹھنڈے نوکیلے سنگ ریزوں سے جھنجھنا جاتے... ریت اور کنکریٹ کے باریک ذرّے۔ بوریوں کی رسیاں۔ لوہے کا کیل... کسی مردہ جھینگر کا جسم۔ تلووں کی جھنجھناہٹ کھوپڑی کے کسی گوشے میں پہنچ کر وجودوں کے ناموں میں تبدیل ہو جاتی۔ میرے قدم اُٹھنے لگتے۔ زرد مستطیل اب کسی عفریت کی اکلوتی آنکھ کی طرح مجھے گھور رہا ہوتا تھا۔ میں کسی نامعلوم کشش سے مغلوب ہو کر اپنا ہاتھ اس کی زردی کے اوپر تان دیتا... بھورے رنگ کا پانچ ٹانگوں والا جانور... میرا ہاتھ... چھوٹا سا اکٹوپس! مجھے یوں محسوس ہوا کرتا تھا جیسے میرا ہاتھ میرے جسم سے جدا ہو کر اپنا ایک علیحدہ تنہا وجود قائم کر چکا ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اور باوجود کوشش کے میں اسے اپنے جسم پر واپس نہیں لا سکوں گا۔ میری زبان حلق میں پھنسنے لگتی اور دم گھٹنے لگتا۔ میں کسی زخمی جانور کی سی تیزی سے پلٹ کر اپنے آپ کو بستر پر گرا دیتا اور پھر سے رضائی کے اندھیرے میں اپنے آپ کو گم کر دیتا۔

یہ تو ان دنوں کی راتوں کی باتیں تھی۔ دنوں کا حال بہت مختلف ہوا کرتا تھا۔ سورج کی روشنی پھیلتے ہی وہ کوٹھری کسی دیوزاد مچھلی کے پیٹ کی طرح پچک کر مجھے شہر کی سڑکوں پر اُگل دیا کرتی تھی۔ لمبی چوڑی۔ تنگ۔ سیدھی۔ بل کھاتی، حماقت زدہ سڑکیں! سلیٹی رنگ کی انہیں بے ہنگم سڑکوں پر میں نے سینکڑوں میل کے بے مقصد فاصلے طے کیے۔ میرے پاؤں انسانوں اور

میکانکی سواریوں کے ریلے میں بھٹکتے رہتے۔ میں پیدل چلنے سے اکتا جاتا تو کسی بھی بس شاپ پر کسی بھی نمبر کی کسی بس میں بغیر ٹکٹ لیے بیٹھ جاتا اور کہیں بھی اُتر جاتا۔ س ش شہر کے تمام گوشے میرے لئے ایک جیسے تھے۔ ایک جیسے مناظر پلٹ پلٹ کر میرے سامنے آتے۔ بازار، چوک، دکانیں، تجارتی مراکز، دفاتر، سینما گھر، سکول کالج، عدالتیں۔

میں عجلت میں اپنے دفتروں اور کام کی دوسری جگہوں کی طرف بھاگتے لوگوں کی جھلاہٹ سے محظوظ ہونے کے لئے ان کو ٹھہرا کر بڑے اطمینان سے وقت پوچھا کرتا حالانکہ نہ تو مجھے کہیں جانا ہوتا تھا اور نہ کسی کو میرے پاس آنا۔ نہ مجھے کسی کا انتظار ہوا کرتا تھا اور نہ کسی کو میرا۔ میرے لئے تو وقت کے یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بالکل بے معنی ہو چکے تھے سات بجکر نو منٹ یا پانچ بجکر دس منٹ تیرہ جنوری یا سترہ جون سب میرے لیے ایک جیسے لایعنی اور مضحکہ خیز تھے۔ میں تو صرف یہ جانتا تھا کہ چائے اور ڈبل روٹی کے آمیزے کی ڈکاریں آنے کا مطلب ہے صبح۔ ٹریفک کا رش بڑھنے اور نیون سائن روشن ہونے کا مطلب ہے شام۔ اگر مجھے پیاس بجھانے کے لئے بار بار کارپوریشن کا نل تلاش کرنا پڑ رہا ہے تو گرمی ورنہ سردی۔!

مجھے ہر شے سے نفرت ہو چکی تھی۔ ہر شے سے۔ حجام کی دکان کے سامنے ٹنگے تولیوں سے۔ اخبار کی جلی سرخیوں سے۔ دفتروں کی طرف بھاگتے لوگوں سے۔ پُر اعتماد مسکراہٹیں بکھیرتے، ادھیڑ عمر مردوں سے، مولویوں سے، باحیا، بے حیا، خوب صورت، بدصورت، جوان، بوڑھی عورتوں سے، فضا میں پھیلے دھوئیں اور لید کے آمیزے سے۔ مسجدوں سے کلیساؤں سے... نفرت، نفرت... میرے وجود کے جوالا مکھی میں ایک لاوے کی طرح اُبلتی تھی۔ مگر میں نے کبھی اس دائمی نفرت کا سبب جاننے کی کوشش نہ کی تھی شاید محبت کی طرح نفرت کا سبب جاننے کی کوشش بھی لغو بات تھی۔ شاید مجھے اس نفرت سے محبت ہو چکی تھی شاید میں اسی کے سہارے جی رہا تھا۔

لاکھوں انسانی چہرے فٹ پاتھوں پر یوں بھاگتے نظر آتے جیسے فٹ پاتھ جہنم کی پگڈنڈی ہو اور جیسے شیطانی سران کے تعاقب میں ہو اور وہ سب ایک دوسرے کے تعاقب میں۔ ان سب کو میں حیرانی اور خوف کے جذبات سے تکا کرتا۔ پھر آہستہ آہستہ بہت ہی آہستہ میرے اندر کوئی مبہم تار لرزنے لگتا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے میرے ساتھ کوئی بہت بڑا حادثہ بیت

چکا ہے۔ میں کوئی سنگین غلطی کر کے بھول چکا ہوں۔

پھر س ش شہر پر دوپہر اُتر آیا کرتی تھی۔ روشنی کی دھند میں متحرک چیزیں کتنی تیزی سے اپنی جگہ بدل لیتی تھیں۔ جیسے ایک دوسرے کو اُلٹ پلٹ کرنے پر تُلی ہوں۔ میری نظریں ان کا تعاقب کرتے کرتے ہانپ جاتیں تو میرا سر پیچھے کو ڈھلک کر اُنہیں خلاؤں کی جانب پھینک دیتا... نیلگوں گدلاہٹ سے اٹا آسمان۔ بجلی کی تاریں، چیلیں، پتنگیں جیٹ کے دھوئیں کی لمبی لکیر۔ ٹیلی ویژن کے اینٹینے۔

”دیکھ کر چلو اندھے ہو گیا۔؟“

نرم سطح اور کھردرے ریشوں سے بنی کوئی شے میرے جسم سے ٹکراتی تو سر جھٹکے سے سیدھا ہو جاتا اور نظریں آسمان اور اونچی اونچی عمارتوں پر ایک لمبی قوس کھینچتیں نیچے اتر آتیں۔ ”یہ کسی انسان کی آواز تھی“ میرا جسم کسی دوسرے جسم سے چھو چکا تھا۔

سراسیمگی کا ایک بے نام احساس مجھے اپنے گھیرے میں لے لیتا۔ ”کیا میں غائب ہو چکا ہوں؟ کیا میرا جسم فضا میں تحلیل ہو رہا ہے۔ کیا میں روشنی کی دھند میں تیزی سے حرکت کرتے انسانوں کی نظروں سے اوجھل ہو چکا ہوں؟ مجھے یہ سڑک پار نہیں کرنا چاہیئے۔ اس چیختی چنگھاڑتی کار کا ڈرائیور یقیناً مجھے دیکھ نہیں پائے گا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو اوجھل ہو چکا ہوں جو چیز اوجھل ہو جائے اُسے کچلا نہیں جا سکتا۔“

عمارتوں کے طویل تیکھے خطوط کند ہونے لگتے۔ آبی رنگوں کی تصویر پر گدلے پانی کی پھوار برس جاتی۔ اب س ش شہر پر شام سرکنا شروع کر دیتی تھی۔

اس سے کیسا گھمبیر احساس ذمہ داری اُس کے لوگوں پر چھا جایا کرتا تھا۔ بک سٹالوں پر دھرے اخباروں اور رسائل کی جھوٹی سرخیاں دیکھ کر وہ لوگ کس شوق سے اپنے آپ کو مبہم اضطراب میں مبتلا کرتے اور آگے بڑھ جایا کرتے تھے..... وہ سب لوگ..... بس سٹاپوں پر کھڑے۔ شوکیسوں پر نگاہیں ڈالتے۔ گداگروں کو خیرات دیتے۔ خوب صورت عورتوں کو دیکھ کر خیالی جنسی ملاپ کے نقشے ذہنوں میں جماتے۔ موٹر سائیکلیں دوڑاتے۔ جیبیں کاٹتے۔ فلمیں دیکھتے۔ زیر جامے خریدتے۔ ”ہر چیز کتنی اہم ہے۔“ کے غیر مرئی سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہے جاتے ــــــ کیلوں کی چھابڑی کے قریب کھڑا

وہ شخص کیسی حیرت ناک سنجیدگی سے کیلا چھیلنے میں مصروف ہے۔ جیسے کیلا کوئی چھوٹا سا جانور رہا ہو جسے مٹھی میں دبوچ کر اس کی کھال اُتارنا مقدس ترین انسانی فریضوں میں سے ایک ہو۔ گودے کو منہ کے سوراخ میں آہستگی سے داخل کر کے وہ جبڑوں کو نہایت محتاط انداز میں حرکت میں لاتا ہے۔ اس کے دانت گودے میں پیوست ہو جاتے ہیں اور وہ جان جاتا ہے کہ کیلے کا گودہ کس قدر نرم، گداز، شیریں اور خوشبو دار شے ہے۔ ایک پُراسرار چمک اس کی آنکھوں میں لہرا جاتی ہے اور وہ پُرخیال انداز میں آتے جاتے لوگوں کو یوں دیکھتا ہے جیسے انہیں بآواز بلند بتا دینا چاہتا ہو ”شہر کے لوگو دیکھو! میں کہ اسی شہر کا باشندہ ہوں اور کیلا کھا رہا ہوں۔“

شام گہری ہو جاتی نیم تاریک فضا میں سینکڑوں ہزاروں نیون سائن اُگتے تو رنگین روشنیوں کے تیر ہر سو بکھر جایا کرتے تھے اور میں سینما گھروں کے سامنے کھڑا ہو کر عریاں تصویروں کو لاتعلقی سے گھورا کرتا ــــــ عورتوں اور مردوں کا وہ ہجوم سینما گھر سے باہر نکل رہا ہے۔ ان کی آنکھوں میں کیسے انوکھے تحیر کا کہرہ چھا رہا ہے۔ پھر وہ کیسی بوجھل ناگواری اور اچنبھے سے باہر کی دنیا کو دیکھتے ہیں۔ ان کے سروں کے گرد دھند کے دائرے ہیں جن میں کیسے کیسے خواب ناک مناظر ہلکورے لے رہے ہیں۔ کامک کتابوں کے کارٹون کرداروں کے مکالموں اور سوچ کی تصویروں کے گرد کھینچے دائروں جیسے دائرے شاید یہ لوگ پھر اسی روشنیوں اور سایوں کے سراب کی طرف پلٹ جانا چاہتے ہیں۔ لیکن... نئے لوگ، نیا ہجوم ان کی جگہ لے چکا ہے۔

شام اور گہری ہوتی تو رات اُمڈ آتی۔ ابدی و ازلی تاریکی۔ اُمنڈتی راتوں کا اندھیرا۔ اندھیرا۔ بھوک۔ حبس آمیز گرمی یا شاید سردی... س ش شہر کی تمام سڑکیں مجھے ایک ہی منزل کی طرف بڑھتی نظر آنے لگتیں۔ سڑکیں جیسے اب بڑے بڑے چوڑے آہنی پٹوں کی طرح گھومنے لگتیں اور کنویئر بیلٹز کی طرح وہ مجھے اپنے اوپر دھرے ہر رات ایک ہی جگہ گرا دیتیں۔ ایک ہی مقام پر۔ س ش شہر کی غلیظ آبادی میں واقع کوٹھڑی میں جو میرے چچا کی دکان کا عقبی سٹور ہوا کرتی تھی۔

وہ دن آخر آن پہنچا جس کا مجھے اُسی دن سے انتظار تھا جب میں نے اُس کوٹھڑی کے اندر پہلا قدم رکھا تھا۔ وہ دن جو ہر لمحے میرے تالو سے ذرا اوپر ایک پھانس کی طرح موجود رہتا تھا۔ کوٹھڑی سے میرے اخراج کا دن۔ چچا قدرت اللہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کا دن۔

اس نے فیصلہ کن انداز میں مجھے آگاہ کیا کہ وہ مجھے ایک انتہائی نکھٹو، ناکارہ اور کام چور قسم کا انسان سمجھتا ہے اور یہ کہ وہ مجھے اب خوراک اور رہائش کی سہولت صرف اسی صورت میں بہم پہنچا سکتا ہے اگر میں دکان کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹانا منظور کروں۔

میری شخصیت کے عیوب کی نشاندہی کرنے کی کوشش پر میں نے اسے دل کھول کر داد دی لیکن دکان کے کام میں ہاتھ بٹانے وغیرہ کے مشورے کو ایک احمقانہ خیال قرار دیا۔ اس پر اسے غصہ آ گیا جو کہ اس کے نوکر کے خیال کے مطابق اسے بہت کم آیا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے مجھے فی الفور کوٹھڑی سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ میں نے خاموشی سے چمڑے کا وہ بوسیدہ تھیلا ہاتھ میں تھاما جس میں میرے تعلیم یافتہ ہونے کی گواہی دینے والے کاغذات ٹھنسے رہا کرتے تھے۔ اور میں کوٹھڑی سے باہر نکل آیا۔

پھر وہی سڑکیں۔ وہی چوراہے۔ شہر کے وہی لاکھوں انسان۔ نیلگوں گدلاہٹ سے اٹا وہی آسمان۔ صبح۔ دوپہر۔ شام۔

ہر رات مجھے اپنے اندھیرے میں پناہ دینے والی سیلن زدہ دیواروں سے مجھے نکال دیئے جانے کے بعد کی پہلی رات میں نے ایک پُرانے شناسا کے مکان کے برآمدے میں گزاری۔ دوسری رات ایک واقف کار کے باورچی خانے میں۔ تیسری رات ایک شکل آشنا طالب علم کے ہوسٹل کے کمرے میں۔۔۔

اب پُرانے شناساؤں اور واقف کاروں کو کھود نکالنا میرا مشغلہ بن گیا۔ میں انہیں ان کے گھروں اور دفتروں میں اس تپاک سے ملا کرتا جیسے دنیا میں مجھے صرف انہیں سے ملنے کی حسرت باقی تھی۔ ایک عجیب سی بوکھلاہٹ ان پر طاری ہو جاتی۔ کسی اندرونی اضطراب سے ان کے اعصاب کسمسا جاتے۔ وہ کامل توجہ سے میری گفتگو سنا کرتے اور دوستوں کے سے انداز میں دوپہر کے کھانے کی دعوت دیتے اور میں اسی انداز سے ان کی دعوت قبول کر لیا کرتا تھا۔ جیسے وہ ہرگز کوئی اہم بات نہ رہی ہو۔ میں ان کے ڈرائنگ روموں میں بیٹھا ان سے باتیں کرتا تو ان

کے بچے اپنے ڈیڈی کے کانوں میں کیسی پُراسرار سرگوشیاں کیا کرتے۔ جن کے جواب میں ان کے ڈیڈی کچھ کھسر پھسر کرتے تو بچے اپنی ننھی ننھی آنکھوں میں ڈری ڈری حیرانی لیے کمرے سے باہر بھاگ جایا کرتے تھے۔ میری عزت نفس کا پاس رکھتے ہوئے انہوں نے قرض کا بہانہ بنا کر میری مدد کی۔ ایک شخص نے تو مجھے اون کا ایک مفلر تحفے کے طور پر دے دیا..... وہ کتنے مہربان اور ہمدرد لوگ تھے۔

کتنے ہی دن کتنی ہی راتیں گذر گئیں۔ ایک شام کسی مکان کے دروازے پر میری دستک کے جواب میں ایک چھوٹے سے بچے نے اپنی لڑکھڑاتی توتلی زبان میں مجھے اپنے باپ کی گھر میں عدم موجودگی کی خبر سنائی..... ایک دوپہر ایک واقف کار نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو نظریں بچا کر کسی دوسری گلی میں مُڑ گیا... دفتروں میں مجھے داخل ہوتے دیکھ کر میرے شناساؤں کے دوست انہیں آنکھیں مارنے لگے... واقف کاروں کی بیویاں مجھے اپنے خاوندوں کے قریب بیٹھا دیکھ کر زور زور سے دروازے پٹخنے لگیں......

ایک سرد تاریک رات میں ایک خالی بس سٹاپ کے سامنے بچھے پتھر کے بنچ پر بیٹھا تھا۔ سامنے سڑک پر کبھی کبھار کوئی آوارہ کتا۔ کوئی تیز رفتار رکشہ یا منہ سے بھاپ چھوڑتا کوئی انسان گزر جاتا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا تھا کہ پتھر کے بنچ پر دھری میری پیٹھ پتھر کے ٹکڑوں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ میرا سارا جسم پتھرا رہا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے رنگ برنگی روشنیوں کے دائرے لرزنے لگے۔ جیسے س ش شہر کے نیون سائن ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے پھٹ رہے ہوں۔

"تم ایک ذلیل اور مردود انسان ہو۔" کسی نے کہا۔

میں نے چونک کر ارد گرد دیکھا۔ بس سٹاپ خالی پڑا تھا۔

"تمہاری نفرت ختم ہو چکی ہے۔ تم جو ایک جوالا مکھی بنے پھرتے تھے اب سرد پتھر کی ایک چٹان بن چکے ہو۔ تمہیں تو کسی بھی شے سے نفرت نہیں ہرگز نہیں۔"

میں نے وحشت زدگی کے عالم میں کھڑے ہو کر منجمد ہوا میں زور زور سے کے

لہرانے شروع کردیے۔

''تم مر رہے ہو۔'' انکشاف کا ایک ڈائنامائیٹ میری کھوپڑی میں دھماکے سے پھٹا۔

''بھوک اور بے پناہ سردی تمہیں ہلاک کر رہی ہے۔ تم مر رہے ہو، تم کئی ماہ سے مر رہے ہو۔ آہستہ آہستہ۔''

ایک ناقابل بیان کراہت سے میری انتڑیاں کٹنے لگیں۔

''میں مر رہا ہوں۔ ناممکن۔ قطعاً ناممکن۔ اس طرح مر جانا تو بالکل ناممکن ہے۔ میں اس قدر مضحکہ خیز اور واہیات ہوں کہ بھوک اور سردی کے ہاتھوں... ناممکن... یہ بالکل بکواس ہے... ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا... میرے ساتھ کوئی بہت بڑا گھپلا ہو رہا ہے۔ کوئی عظیم فراڈ۔ میں اتنا حقیر نہیں ہوسکتا کہ بھوک اور... لعنت... لعنت...''

تاریکی میں ڈوبی عمارتیں۔ سڑکیں۔ روشنیاں۔ گاڑیاں پیلی ہونے لگیں۔ ''یہ سب کچھ بہت بڑی بکواس ہے۔'' میں پورے زور سے چیخا۔ چند راہگیر مجھے حیران نظروں سے دیکھتے آگے بڑھ گئے۔

مجھے زور سے قے آگئی۔ ایک سرد سکون میری رگوں میں دوڑ گیا۔

''میں مر نہیں سکتا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے بکھیر نہیں سکتی۔ میرا جسم میرا ہے۔ صرف میرا اور میں خود ہی اسے... ہاں خود ہی۔''

''کوئی طاقت میرے جسم پر فتح حاصل نہیں کرسکتی۔ سوائے میرے۔ میں خود اپنے جسم! کیا مجھے خود اسے بکھیر دینا چاہیے۔ اس پر فتح حاصل کرنے کا حق صرف میرا ہے... میرا۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں زمین سے اٹھ رہے ہوں۔ میں نے ایک بار پھر تاریک گوشوں اور رنگین روشنیوں کے اس لایعنی ملغوبے کو دیکھنا چاہا جو شہر کی شکل میں میرے اردگرد میلوں تک پھیلا تھا۔ دفعتاً میں اتنے زور سے ہنسا کہ میرے آنسو نکل آئے۔

ریل کی پٹڑیاں۔ میرے سامنے اندھیرے میں پٹڑیوں کا جال بچھا تھا۔ میں نے آہستگی سے اپنے جسم کو ایک پٹڑی کے اوپر بچھا دیا۔

پٹڑی کا ٹھنڈا سیت لوہا میری گردن سے چپکا۔ میرے جسم کی آخری حرارت نچوڑ رہا

تھا۔

مجھے ریل کی تیز سیٹیوں کا شور سنائی دیا۔ جو پٹڑی کو روندتی چلی آرہی تھی۔

میں نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھولیں اور تاریک آسمان کو دیکھا۔ ستارے۔ کہکشاں کی دھند۔ ستاروں کے جھرمٹ سے بیچوں بیچ ایک مصنوعی سیارہ سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔

پہیوں کی گڑگڑاہٹ سے میری کھوپڑی میں دھماکے سے ہونے لگے۔ مصنوعی سیارہ کہکشاں میں داخل ہو چکا تھا۔

انجن کی تیز روشنی میرے قریب پہنچ چکی تھی۔

بے پناہ شور۔ مصنوعی سیارہ غائب ہوگیا۔ پوری کائنات پر ایک یخ بستہ سکوت چھا چکا تھا۔

(ب)

ریلوے لائن پر پڑا اُس کا جسم فریج میں لگے چوزے کی طرح اکڑ چکا تھا۔

لوگوں کا ایک ہجوم حیرانی سے اُس کے جسم اور ریل کی اس پٹڑی کو دیکھ رہا تھا جو تھوڑا آگے بڑھ کر ختم ہوجاتی تھی۔ اس کے آگے کنکریٹ کی ایک مضبوط دیوار کھڑی تھی۔

بفر سائیڈنگ۔ ریل کی وہ چھوٹی سی ذیلی بند پٹڑی جو ریلوے لائنوں کے ساتھ بچھا دی جاتی ہے۔ جس پر کبھی فالتو ڈبے یا ریلوے کا کاٹھ کباڑ کھسکا دیا جاتا ہے لیکن کوئی تیز رفتار گاڑی اس بند پٹڑی سے نہیں گزرتی۔

اس رات بفر سائیڈنگ پر پڑے اُس کے جسم کو کسی بھی پہیے نے چھوا تک نہ تھا۔ کوئی بھی ریل گاڑی اس کے جسم کو بکھیر نہ پائی تھی۔

(ج)

اُن دنوں میں س ش شہر کی ایک انتہائی معمولی سی آبادی کی ایک انتہائی معمولی سی رہائش گاہ میں رہتا تھا۔ جس میں انتہا کے معمولی لوگ بستے تھے مگر اُن سب کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے ایک ایک ایسے ادارے یا محکمے سے تھا جو بہرحال معمولی نہ تھا میری مراد ریلوے کے محکمے سے ہے۔ خود میرا تعلق بھی ایک سطح پر اسی ادارے سے بنتا تھا اگرچہ یہ تعلق شاید خوفناک یا جان لیوا قرار پائے گا۔ دراصل میں نے ایک رات اسی محکمے کی ایک ہمیشہ سے مہیا کردہ سہولت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔ میری مراد اُس سہولت سے ہے جو یہ ادارہ اب غالباً ڈیڑھ صدی سے ایسے افراد کو مہیا کرتا رہا ہے جو ہر رستہ مسدود پا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے بھی ایسی ہی ایک ناکام کوشش کی تھی۔ لیکن میری ناکامی میں محکمے کی بدانتظامی کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ غلطی میری اپنی تھی۔ میں جو سب رستے مسدود پا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے نکلا تھا یہ اندازہ نہ لگا سکا تھا کہ ریل کے جس رستے پر میں اپنا جسم بچھا رہا ہوں وہ خود آگے جا کر مسدود ہو جاتا ہے جسے وہ لوگ بفر سائیڈ ینگ کہتے ہیں چنانچہ میں رات بھر کسی چالو ریلوے لائن کی بجائے اسی مسدود پٹڑی پر پڑا رہا۔ اور پھر یہ بھی نہ ہوا کہ کوئی فالتو ڈبہ اُدھر دھکیل دیا جاتا یا کوئی شنٹنگ کرتا انجن ہی اُدھر آ نکلتا اس طرح بھی میرا مسئلہ حل ہو جاتا مگر ایسا بھی نہ ہوا رات بھر صرف بھوک کی بے ہوشی اور۔ یخ سردی میری دشمن بنی رہی لیکن پھر یہ دونوں مل کر بھی میرا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ اگرچہ جن لوگوں نے مجھے صبح کاذب کے دھندلکے میں وہاں پڑے ہوئے دیکھا وہ یہی سمجھے کہ میں جا چکا ہوں نشے باز ٹھنڈ میں اِدھر اُدھر گر کر مرتے رہتے ہیں یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا۔ وہ کہیں اطلاع دینے کی سوچ ہی رہے تھے کہ ریلوے کا ملازم بابا رمضان آ گیا اور پھر "لائنوں پر اگر کوئی چیز پڑی ملے خواہ وہ کوئی بیگ ہو یا لاش اُس کی اطلاع فوراً اپنے افسران بالا کو دو۔" ـــــــ بابا رمضان اپنے اس محکمہ جاتی قانون پر عمل شروع کرنے کے لیے 'لاش' کے قریب جھکا تا کہ پہلے یقین کر لے لیکن پھر ٹٹولنے پر اُسے اندازہ ہوا کہ میں ابھی لاش نہ تھا پھر شاید 'اپنے بندے کی جان بچانے کی کوشش کروں۔ کی کوئی اُس کی اعلیٰ اخلاقی قدر اُس پر غالب آ گئی اور وہ مجھے اٹھوا کر اپنے کوارٹر میں لے آیا جو وہاں سے کچھ زیادہ دور

نہیں تھا۔ یہ سب کچھ مجھے بابے رمضان نے بتایا۔

بابا رمضان مجھے اپنے اڑھائی کمرے کے کوارٹر میں کیوں لے آیا؟ وہی شاید کسی انسان کی جان بچانے کی کسی قدیمی جبلت کی وجہ سے۔ لیکن پھر میری جان بچ جانے کے بعد بھی اُس نے مجھے ڈیڑھ کمرے کے آدھے کمرے میں کیوں رہتے رہنے دیا شاید اُس کے پاس اپنے اس فیصلے کا کوئی عذر ہوگا مگر میں نے اِسے ہمیشہ اُس کا ذاتی معاملہ گردان کر اُس میں دخل دینے کی کبھی کوشش نہ کی۔ تو بابا رمضان مجھے منجمد حالت میں اپنے آدھے کمرے میں جو کوارٹر کی رسوئی کے ساتھ ایک سٹور جیسا تھا میں لے آیا۔ مجھے بتایا گیا کہ مجھے چارپائی پر ڈالنے کے بعد میرے اوپر کے آدھے جسم پر رضائی ڈالی گئی اور ٹانگوں اور پاؤں پر نیم گرم پانی ڈالا گیا۔ کوئلوں کی انگیٹھی دہکائی اور پھر آخرکار اُن کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ 'اُن' اس لیے کہ وہ کوارٹر میں اکیلا نہ تھا وہ تین افراد تھے۔ جو اُس کوارٹر کے مکین تھے اور جب میرا جما ہوا خون پھر سے پگھل کر میری رگوں میں دوڑنے لگا تو وہ جو کہا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں۔ کہ جب میری آنکھ کھلی تو جب میری آنکھ کھلی تو وہ انہیں تین افراد پر کھلی۔

کہا جاتا ہے کہ گہری غشی کے بعد کھلنے والی آنکھ غشی کے بعد کی دنیا پر کھلنے سے بھی پہلے غشی سے پہلے کی دنیا پر کھلتی ہے کیونکہ 'بعد' اُس وقت تک لایعنی ہے جب تک کہ پہلے کا پھر سے علم نہ ہو۔ وہ تینوں دھندلے چہرے ابھی گہرا خواب تھے اور پھر میرے جسم کا شدید درد جو ابھی درد بھی نہ تھا ایک ہی جھٹکے میں مجھے اُس پہلے کی دنیا میں لے گیا۔ ناقابل بیان دہشت سے میں نے سوچا یا دیکھا۔ سوچنے اور دیکھنے میں فرق بھی ابھی واضح نہ تھا۔ میرے جسم کے ٹکڑے ریلوے لائین پر ہر طرف بکھرے تھے خون میرے ٹکڑوں سے چپکا تھا مگر محسوس ہوتا تھا اور اوپر گہرے آسمان میں سے وہ تینوں چہرے میری طرف دیکھ رہے تھے اور پھر اُن کی 'پہچان' کہ وہ ایک عورت ایک بچے اور ایک بوڑھے مرد کے چہرے تھے۔ اس پہچان کے ساتھ 'پہچان' ایک تیزی سے حرکت کرتی لہر کی طرح دوڑنے لگی مگر کہاں؟ میرے ذہن میں؟ مگر ابھی میرا ذہن کہاں تھا؟ دماغ کہاں تھا۔ ٹانگیں۔ بازو۔ ہاتھ۔ سینہ۔ دھڑ۔ اور ہاتھ کہاں تھے مگر شاید یہ ہاتھ ہی تھے جو جسم کے ٹکڑوں کو پھر سے جوڑنے کے لیے انہیں واپس لانے کے لیے 'مین' بن گے۔ وہ ناقابل یقین کیفیت کہ میں بس دو ہاتھ تھا۔ وہ دونوں ہاتھ جو کچھ بھی تھا اُس سے دور ہٹ جانا

چاہتے تھے۔ دور۔ دور۔ دور۔ اور پھر وہ آواز جو اُن تینوں میں سے کسی کی ہوگی اور کچھ ایسی ہوگی 'ہوش آ گیا ہے'۔ 'آنکھ کھولی ہے'۔ مگر میرے لیے ایسی کچھ بھی نہ تھی بلکہ کنکریٹ کے فرش پر لوہے کی بھاری الماری گھسیٹنے کی آواز جیسی تھی جو کانوں۔۔ مگر کان کہاں تھے۔ میں اپنے ہاتھوں میں سمٹا ایک دوسرے سے دور بھاگنے لگا اور تاریکی اور نیستی ایک بار پھر گہری ہوتی چلی گئی۔

میں جب پھر واپس آیا تو یقیناً غشی کی کائنات میں رہتے ہوئے بھی واپسی کے لیے کئی قدم اُٹھا چکا تھا۔ شاید کئی فیصلے کر چکا تھا۔ شاید کئی منصوبے بنا چکا تھا۔ غشی کہ جو نیند اور موت کے درمیان آباد ایک دنیا ہے اپنا ہی ایک نیستی کا نظام رکھتی ہے جہاں سے بیداری کو پلٹنے کی خواہش کرنے والوں پر حکم جاری کیے جاتے ہیں۔ کِسی کی مجال ہے حکم عدولی کر سکے۔

میں نے دیکھا کہ ایک گیارہ بارہ سال کا بچہ میری آنکھوں میں دیکھ رہا ہے اور اُس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ہیں میں ایک بستر میں لیٹا ہوں۔ کمرہ میرے لیے بالکل اجنبی ہے لیکن وہ شاید پوری طرح کمرہ بھی نہیں ایک طرف سے کُھلا ہے۔ میں کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی کہ میں کہاں ہوں۔ لیکن میرے حلق میں پھندہ سا پڑ جاتا ہے اور صرف ایک لفظ منہ سے نکل پاتا ہے۔ 'پانی'۔ لڑکا تیزی سے جاتا ہے۔

اور پھر وہ تینوں جیسے بھاگے ہوئے آئے تھے بوڑھا۔ بچہ اور عورت۔ بوڑھے کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ پانی جو زندگی ہے۔ مجھے موت کی دہلیز سے واپس کھینچ لانے کے اپنے اُس کارنامے پر وہ کِس قدر خوش تھے۔ ویسی خوشی مدتوں سے میں نے مجھ سے کوئی بھی تعلق رکھنے والے کسی شخص میں کبھی دیکھی نہ تھی۔ اور وہ حیرت تھی جو سرد موسم میں گرم آتی دھوپ کے ساتھ میرے اوپر آتی تھی۔ اُن تینوں پر حیرت۔ اپنے کہیں ہونے پر حیرت۔ اپنے زندہ ہونے پر حیرت۔

تین دیواروں والے اُس کمرے کی کُھلی دیوار کے سامنے ہر شام وہ عورت موٹے سرکنڈوں پرانے کمبلوں اور پلاسٹک کی موٹی چادر سے بنی ایک دیوار گرا جاتی تھی اور مجھے ہر رات کے لیے سردی سے محفوظ کر جاتی تھی پھر اگلے دن کسی وقت وہ اُس دیوار کو اوپر کی طرف لپیٹ دیتی تھی اور میرے سامنے دھوپ اور نیلے آسمان کی دنیا کھول دیتی تھی اور دونوں ہی دفعہ وہ واپس پلٹتے وقت اور اُس آدھے کمرے سے باہر جاتے وقت ایک نگاہ میرے اوپر ڈالتی تھی۔ وہ ایسا

کیوں کرتی تھی۔ کیا وہ مجھے بتانا چاہتی کہ دیکھو میں تمہیں مار دینے والی سردی سے بچانے والی ہوں اور میں تمہارے لیے زندہ کرنے والی گرم دھوپ پر روز لانے والی ہوں اور تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ مگر وہ تینوں جانتے تھے کہ میں اُن کا شکر گزار ہونگا ایسا کون ہوسکتا ہے کہ جو مجھ پر بیتی اُس کے بعد اُن جیسوں کا شکر گزار نہ ہوگا۔ مگر میرے ساتھ ابھی ایسا بھی نہ تھا گو کہ میں کبھی نہ کہتا کہ غشی کی دنیا سے مجھے بس پہچان اور حیرت کا حکم ملا تھا تشکر کا حکم ابھی کہیں مری پہچان میں نہیں تھا۔ مگر میں خاموش تپتے بخار کی سرزمین میں ٹامک ٹوئیاں مارتا اُس عورت کی ان دو نگاہوں پر جو اصل میں ایک ہی نگاہ تھی حیران ہوتا تھا۔ پھر میں سوچتا تھا شاید وہ ایک سوال ہے جو اس کی نگاہ میں ہے سوال جو ایک تنبیہ ہے۔ مرتے ہوئے اجنبی کی جان بچائی جا سکتی ہے تاکہ وہ جدھر سے آیا تھا آسانی سے اُدھر ہی واپس جا سکے۔ پھر مجھے خیال آتا نہیں وہ صرف جاننا چاہتی ہے میں بیماری سے پلٹ رہا ہوں یا نہیں۔، وہ صرف چند لفظ بولتی تھی۔ 'کچھ چاہیے'۔ 'کھانا'؟ 'پانی'۔ 'دوائی' اور بس اور میں بس اثبات میں یا نفی میں سر ہلا دیتا تھا۔

وہ دن ایسے تھے کہ بابا رمضان اپنے درجنوں دفعہ کے پوچھے سوال 'بیٹا تمہاری اطلاع کہاں دیں۔ کِس کو اطلاع دیں' پر میرے دو لفظی جواب 'کہیں نہیں' 'کو' اجنبی' کی آخری حقیقت مان چکا تھا۔ اور وہ دن ایسے بھی تھے کہ میں نے یہ جاننے پہچاننے کی کبھی کوشش نہ کی تھی کہ اُن تینوں کا آپس میں رشتہ کیا ہے۔ یہ سوال میرے ذہن میں کبھی ابھرتا نہ تھا۔ لفظ 'رشتہ' مدتوں سے میرے لیے اتنا لایعنی ہو چکا تھا کہ جیسے کہیں تھا ہی نہیں۔ ہر انسان اپنی اٹل علیحدگی میں ہی مجھے بہت کافی نظر آتا تھا۔ وہ بوڑھا بس ایک بوڑھا تھا۔ بچہ بچہ تھا اور وہ عورت بس ایک عورت تھی۔ مگر ایک دن جب میرے جسم میں بخار کی بھٹی، بجھنے کو تھی۔ میں بستر میں لیٹا دھوپ سے نرم پڑتی رضائی میں لپٹا سامنے کُھلی دیوار میں نیلے آسمان کے اندر تیرتے بادلوں کے ٹکڑوں اور ہواؤں میں گم چیلوں کو دیکھتا تھا اور پھر آنکھ کی ہلکی سی نیچے اترتی جنبش سے بابے رمضان کے کوارٹر کے صحن میں اُگے دھنیئے۔ پیاز۔ پودینے، نیاز بو اور کوار گندل کے پودوں کو دیکھتا تھا اور رسوئی میں کھانا پکاتی اُس عورت کو بھی دیکھ سکتا تھا تو بچہ آیا اور عورت کو ماں کہہ کر کھانا مانگنے لگا اور میں نے جیسے پہلی دفعہ اُس لفظ کو سُنا گو کتنی ہی دفعہ پہلے بھی اُس گھر میں میرے کانوں میں پڑ چکا ہوگا تو میں نے اندازہ لگایا کہ وہ عورت اُس بوڑھے کی بیوی ہے اور بچہ اُس کا بیٹا ہے۔ وہ عورت

جسمانی محنت سے روزی کمانے والی عورتوں پر اُترنے والی اُس 'بے عمری' کی عمر میں تھی کہ جب انہیں دیکھنے والا انہیں اٹھائیس سے اٹھاون تک کچھ بھی سمجھ سکتا ہے۔ شاید اسی لیے مجھے اُسے بابے رمضان کی بیوی سمجھنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ ہوئی۔ لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ اُس کی بیٹی ہے اور اُس کا نام جمیلہ ہے اور اُس کے بیٹے کا نام مجید ہے اور اُس کا خاوند جو محکمہ بجلی میں لائین مین تھا چار سال پہلے حادثے کا شکار ہو کر مر گیا تھا۔ چنانچہ وہ عورت بیوہ ہونے کے بعد اور بھی زیادہ یقین سے اُس لافانی نسوانی نسل میں شامل ہوگئی۔ جو مائی کہلاتی ہے۔

اور پھر ایک دن 'اجنبی' کو پہلی بار یہ احساس دلانے کا لمحہ آگیا کہ اب وہ اِس قابل ہو چکا ہے کہ اپنی دنیا کو پلٹ سکے۔ اُن دنوں میں آدھے کمرے کی چوتھی کھلی دیوار کے سامنے بستر میں لیٹنا آسمان میں دیکھتے رہنے کی بجائے اپنے پاؤں پر چل کر بابے رمضان کے کواٹر میں دوسری گلیوں تک جا سکتا تھا۔ لیکن رات پھر بھی اُسی کمرے میں آتی تھی لیکن جمیلہ کی بجائے اب میں خود سرکنڈوں کی دیوار کو کھول سکتا تھا لپیٹ سکتا تھا۔ لیکن مائی جمیلہ کہ وہ نگاہ اب بھی کبھی میری جانب اٹھ جاتی تھی اور مجھے اُس کی نگاہ پر میری حیرانی پر حیران کر جاتی تھی۔ پھر میں نے اُن کی صحن کی دیوار کے ساتھ بنی کیاریوں میں مٹی کھود کر آنے والے بہار کے موسم میں پھول دینے والے پودوں کی پنیری کاشت کی جو بچہ مجید اپنے سکول سے چرا کر لاتا تھا۔ پھر میں نے انہی پھولوں کے پودوں کے نیچے نیچے کہیں لہسن کے جُوے گاڑ دیے جو ایک ہی دن میں سبز کونپلیں نکالنے لگے۔ میں نے اُن کے باورچی خانے میں مسلسل ٹپکتے نل کی مرمت کی۔ باہر کو کھلتی ایک لکڑی کی کھڑکی کے اکھڑتے قبضے کے پیچ کسے اور وہ آسانی سے کُھلنے اور بند ہونے لگی۔ میں نے بابے رمضان کے سائیکل میں مدتوں کے جمے میل کو کھرچ کر نیچے چُھپے سوراخوں کو ڈھونڈ نکالا اور اُن میں سرسوں اور مٹی کے تیل کا آمیزہ ٹپکایا اور پھر وہ سائیکل خوب رواں ہو کر دوڑنے لگی۔ مائی جمیلہ گندے کپڑوں کے ڈھیر دھوتی تھی تو میں اُن کپڑوں کو کواٹر کی چھت پر خشک ہونے کے لیے ڈالنے لے جایا کرتا تھا اور پھر اور نئے دُھلے لے جانے کے آجاتا تھا تو مائی جمیلہ پھر وہی نگاہ میرے اوپر ڈالتی تھی ▯____ وہ ایسی ہی کسی نگاہ کا دن تھا کہ جب بابا رمضان اپنی بستی کے کسی ایسے شخص کے ایک سوال کا جواب نہیں دے سکا تھا جو بستیوں میں گھومتے بھوکے کُتوں کی طرح گناہوں کی حسرتیں سونگھتے پھرتے ہیں۔ 'تیرے گھر میں آج کل کون رہتا ہے بابا!'

رمضان' اُس نے پوچھا تھا اور بابا رمضان اُسے کوئی جواب نہیں دے سکا تھا۔ گھر اُس نے بتایا کہ وہ جانتا تھا کہ اُسے جواب دینا ہوگا۔ اور وہ کیا جواب دے گا۔ اب بابا رمضان مجھے پوچھتا تھا۔

شام کواٹر میں اُتر آئی تھی۔ بچہ مجید چائے میں رس ڈبو ڈبو کر کھا رہا تھا۔ مائی جمیلہ بابے رمضان کے لیے کل شام کی بچی دال گرم کر رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا مائی جمیلہ مجھے چائے پہلے دے گی یا بابے رمضان کو دال۔ اور پھر اُس نے مجھے چائے دی اور بابے نے وہی سوال پھر کیا مگر اب اس فقرے کے ساتھ 'اِن کنجروں کی ہر گھر پر نظر رہتی ہے'۔ میں نے چائے کا گھونٹ لیا تھا اور سوچا تھا کہ مجھے یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ میں پیالی ختم ہونے کے بعد اِس گھر سے چلا جاؤں گا۔ مجھے اِس پر کوئی دُکھ نہیں تھا۔ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ میں چائے ختم کر لوں۔ بابا رمضان روٹی کھا لے۔ اور بچہ مجید اپنا پانچواں رس کھا لے پھر میں چلا جاؤں گا۔ پھر ہم تینوں کھا پی رہے تھے اور مجھے لگ رہا تھا جیسے یہ دنیا میں ہر کسی کا آخری کھانا پینا ہے اور میری نظر مائی جمیلہ پر پڑی اور میں نے دیکھا کہ وہ پھر اپنی وہی نگاہ میرے اوپر ڈال رہی ہے۔ اور وہ نگاہ کچھ دیر میرے اوپر ٹھہری جیسے پہلے نہ ٹھہرتی تھی۔ میں چائے ختم کر چکا تھا۔

'بابا جی میں چلا جاؤں گا۔ مگر گھر میں جو تین چار کام میں نے شروع کیے ہوئے ہیں وہ ہو جائیں تو میں چلا جاؤں گا''۔ بابے کی نظریں صحن کے کونے میں پڑے چکنی مٹی کے ڈھیر کی طرف اُٹھ گئیں جس پر 'توڑی' کے پیلی لکیروں جیسے تنکے صحن میں روشن بلب کی روشنی میں نمایاں نظر آ رہے تھے۔ کواٹر کی چھت ٹپکتی تھی۔ فیصلہ ہوا تھا کہ لپائی ہوگی۔ اور سب کو پتہ تھا کہ 'گھانی' میں بناؤں گا۔ 'ہاں لپائی تو ہونی ہے'۔ بابے رمضان نے کہا اور پھر اُس کا منہ بگڑ گیا۔ بولا۔ 'جمیلہ دال سے روڑ چن لیا کر'۔ 'چُنے تھے' اُس نے کہا تھا اور نگاہ مجھ سے ہٹالی تھی۔ تب بابے نے لقمہ کہیں پھینکنے کی بجائے پانی کے گھونٹ سے نیچے اتار لیا تھا اور بچہ مجید ہنس پڑا تھا 'بابا روڑ کھا گیا'۔

'روڑ کھانے کے بعد بابا رمضان رات کی ڈیوٹی پر چلا گیا اور میں بچے مجید کے ساتھ اپنے تین دیواروں والے کمرے میں آ گیا تھا۔ اب کچھ دنوں سے وہ مجھ سے اپنے سکول کے سبق پر بات کرنے لگ گیا تھا۔ میں اُس کی بات سُن کر اُسے کئی باتیں بتاتا تھا اور پھر میں نے دیکھا تھا کہ اُس کے دماغ کی مشین جسے اُس کے ماسٹروں نے بند رکھنے کی پوری کوشش کی تھی چلنے لگ پڑی تھی۔ اور نظر آ رہا تھا کہ چائے کے ساتھ رس کھانے اور حساب کے چھوٹے موٹے

سوال نکالنے میں اُسے ایک جیسا مزہ آنے لگا ہے۔ اُس گھر میں ابھی میرے کرنے کے اور بہت سے کام تھے۔ بچے مجید کی کتابیں جلد ہونی تھیں۔ کوڑے کا ٹین گل سڑ گیا تھا کوڑا باہر گرتا رہتا تھا اُسے بدلنا ضروری تھا۔ صحن کے ایک کونے میں بنے غسل خانے کے فرش کی جگہ اینٹیں بچھائی گئی تھیں جو نیچے دھنس گئی تھیں اور نہاتے وقت پاؤں گندے پانی میں ڈوب جاتے تھے۔ وہاں مزید اینٹیں جوڑ کر نسبتاً اونچا چبوترا سا بنانا ضروری تھا۔ گھر کی سب چارپائیوں کی چولیں اتنی ہلی ہوئی تھیں کہ پائے سیدھے کھڑے رہنے کی بجائے ترچھے ہو جاتے تھے اور بیٹھنے والے کو خوف ہوتا تھا کہ وہ چارپائی سمیت نیچے گر جائے گا یہ خوف دُور کرنا ضروری تھا۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے لئی پکا کر برتن آگ سے نیچے اتارا تھا تو مائی جمیلہ وہ ڈوری بٹ کر لائی تھی جسے میں نے بچے مجید کی کتابیں جلد کرنے کے لیے استعمال کرنا تھا تو اُس وقت میری نظر اُس کے چہرے کی طرف اُٹھی تھی تو پہلی دفعہ مجھے اُس کا چہرہ کچھ مختلف نظر آیا تھا۔ مگر کیسے مجھے فوری طور پر کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ مجھے ڈوری دے کر فوراً ہی واپس چلی گئی تھی۔ لیکن میں نے اُسے مڑتے ہوئے دیکھا تو ایک فرق میں نے دیکھ لیا تھا۔ اُس لے سر پر سے وہ اوڑھنی غائب تھی جو چادر اور دوپٹے کے درمیان کی کوئی بدرنگ بدوضع سی چیز تھی۔ اب اُس کے سر پر ہلکے پیلے رنگ کا دوپٹہ تھا۔ جو اُس کی کمر پر نیچے اُتر رہا تھا اور اُس پتلے پیلے پردے کے پیچھے میں نے پہلی بار اُس کے بال دیکھے جو لمبے تھے اور چوٹی کی طرح گوندھے تھے مگر چوٹی نہیں تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اُس کی عمر کا اندازہ لگانا اتنا مشکل بھی نہیں۔ پھر میں نے ابتدائی ریاضی جماعت چہارم کے سب اکڑے ہوئے صفحات کو ترتیب دے کر سُوئے کی نوک مناسب مقام پر رکھی اور پورا زور لگا کر آر پار سوراخ بنایا پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ پھر موٹی لمبی سوئی میں ڈوری ڈال کر تینوں سوراخوں میں سے گھما کر سواتی پکی کی اور پھر گانٹھ لگا کر ڈوری قینچی سے کاٹ کر الگ کر دی۔ پھر سلائی میں سے کپڑے کی دھجیاں اُس طرح نکالیں کہ وہ دونوں اطراف میں گتوں سے جو پہلے ہی کاٹ لیے گئے تھے لئی کی مدد سے جڑ سکتی تھیں۔ کتاب گتوں کی گرفت میں محفوظ ہوتی تو چھوٹے چھوٹے فیروزی اور کالے پھولوں والی ابری کاٹی گئی تا کہ گتوں کے اوپر چپکائی جا سکے۔ بچہ مجید میری مدد کر رہا تھا۔ اور ہم دیر تک کام کرتے رہے اور پھر ابھی کچھ کام باقی تھا کہ مائی جمیلہ ہمارے لیے چائے لائی اور میں نے دیکھا کہ اس کے کانوں میں چھوٹی چھوٹی

بالیاں ہیں۔ یقیناً وہ اوڑھنے کے نیچے چھپی رہتی ہونگی اور پہلے بھی ہونگی میں نے سوچا تھا۔ مگر جو پہلے نہیں تھا وہ اُس کے پیلے دوپٹے کے علاوہ اُس کے چہرے کی جلد پر تھا جو پہلے مجھے اُس کی اوڑھنی کی کھردری بدرنگ سطح کا ہی ایک حصہ لگتی تھی۔ اوڑھنی نہیں تھی مگر اُس کے چہرے کی جلد اُس کے پیلے دوپٹے سے بھی الگ تھی اور مجھے الگ نظر آتی تھی۔

میں نے کوڑے والے گلے سڑے ٹین کو کوڑے سمیت باہر پھنکوا دیا اور نئے ٹین کی تلاش کی۔ گھر میں لکڑیوں کے علاوہ تیل کا چولہا بھی جلتا تھا۔ گھر میں کوئی تو خالی تیل کا ٹین ہوگا۔ مائی جمیلہ نے بتایا کہ تین دیواروں والے کمرے کی وہ دیوار جو چار دیواری کی طرف ہے۔ وہاں اُس طرف ایک لمبی پرچھتی پر ایسا ایک ٹین رکھا ہوا ہے۔ پرچھتی میری ہاتھ کی پہنچ سے اونچی تھی اور ٹین تک رسائی نہ ہوتی تھی مائی جمیلہ میری دائیں طرف کھڑی تھی۔ میری مشکل دیکھ کر وہ ایک اونچی چوکی لائی۔ میں اُس کے اوپر سیدھا کھڑا ہوا تو سر پرچھتی سے بھی اوپر نکل گیا مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اُس گھر کی برسوں کی ردشدہ چیزوں کا پورا خزانہ میری نظروں کے سامنے آ گیا۔ ایک ٹوٹی ہوئی ٹرائی سائیکل جو کبھی بچے مجید کے استعمال میں رہی ہوگی۔ زنگ آلود اوزار جو کبھی اُس کے لائین مین باپ کے کام آتے ہونگے۔ پلاس۔ کٹر۔ ٹوٹے ہوئے پیچ کس۔ تاریں ہی تاریں۔ گچھے۔ بوتلیں، پوڈر کے خالی ڈبے۔ لپ سٹک کے خالی کھوکھے۔ ٹوٹی ہوئی کنگھیاں۔ سرے دانی۔ پتنگوں کے لمبے تنکوں میں الجھی ڈوریں۔ بے شمار چھوٹی بڑی چیزے۔ پلاسٹک کی جوتیاں۔ عطر کی شیشیاں۔

میرا خیال ہے عطر کی خالی شیشی دیکھ کر ہر انسان غیر ارادی طور پر اُسے پکڑ کر ناک کے قریب ضرور لے جاتا ہے کہ دیکھے کہ خوشبو باقی ہے یا نہیں۔ ایسا ہی میں نے کیا۔ اور تب مجھے مائی جمیلہ کی آواز آئی جو ساتھ نیچے کھڑی یقیناً حیران ہو رہی تھی کہ میں ٹین اتارنے کی بجائے اوپر کیا دیکھتا ہوں۔ 'کیا ہے؟' اُس نے پوچھا تھا جواباً میں نے وہ گہرے نیلے رنگ کی خالی شیشی اُس کی طرف بڑھا دی تھی اور وہ بھی ویسے ہی غیر ارادی طور پر اُسے ناک کے قریب لے گئی تھی اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ گہرے گہرے سانس لے رہی ہے۔ میرے اندر دو سوال تھے یہ کہ وہ اتنے گہرے سانس کیوں لینے لگ گئی ہے کہ لمحوں کے لے اُس کا سینہ اتنا اوپر اُٹھ جاتا ہے کہ جیسے اُس کے جسم سے الگ ہو جائے گا دوسرا مجھے اُس خوشبو کی پہچان کا خیال آتا تھا اور

جب وہ پہچان آئی تو پہلے تو یہ آئی کہ یہ خوشبو کی وہ قسم ہے جو عطر کی بجائے سینٹ کہلاتی ہے۔ اور چند برس پہلے تک نچلے درمیانے طبقے کی نسبتاً کم درمیانی خواتین اور حضرات میں مقبول تھی اور کسی مغربی شہر کی مشام نواز شام کا سندیسہ دیتی تھی۔ یعنی 'ایوینگ ان پیرس' پھر مجھے حیرت ہوئی کہ مائی جمیلہ کے گھر پر کیسے آئی ہوگی۔ کیا اس کے مرحوم خاوند نے اسے دی ہوگی۔ اور کیا یہ اسے استعمال بھی کرتی ہوگی۔ اور اس کے جسم پر کیسی لگتی ہوگی۔ یہ آخری خیال حد درجہ احمقانہ تھا اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ میں اس خیال کا کیا کروں کہ مائی جمیلہ کی کرخت سی آواز آئی۔ 'ٹین تو سامنے دھرا ہے۔' میں اپنے آپ میں آ گیا اور تیزی سے ہاتھ ٹین کی طرف بڑھائے۔ اور اُسے اُٹھانے کی کوشش کی کیونکہ وہ نیچے میل کچیل میں چپکا ہوا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ ٹین جسے میں خالی سمجھتا تھا اُکھڑ کر میرے ہاتھوں میں آیا تو یک دم سے ایک طرف کو اُلٹ گیا اور اندر پڑا کوئی پرانا مٹی کا تیل پتلی سی دھار بناتا نیچے مائی جمیلہ کے کپڑوں کے اوپر گر گیا۔ شرمندگی اور اپنی حماقت پر غصے نے مجھے سُن سا کر دیا۔ اتنے میں مجھے اُس کی ہنسی کی آواز آئی۔ وہ عجیب سی ہنسی تھی اور اُس کی آنکھوں میں عجیب سی دیوانی روشنی تھی۔ میں نے ذری ذری سی حیرت سے اُس کی طرف دیکھا تو وہ بولی 'بس ایک تیلی کھینچنے کی کسر رہ گئی ہے'۔ 'کیا مطلب؟' میں نے پوچھا۔ 'بس ایسے ہی وہ ان کے اوپر تیل ڈال کر آگ لگا دیتے ہوں گے۔ یا وہ خود آگ لگا لیتی ہوں گی' اُس نے کہا اور واپس چلی گئی۔ اس کی بات نے مجھے دہلا سا دیا۔ میں بھی ٹین پکڑے کسی مجرم کی طرح صحن میں پلٹ آیا۔ ٹین کاٹنے کا کترا ڈھونڈا اور اوپر کے حصے کو کھولنے کے لیے فالتو پترا کاٹ کر نکال دیا پھر تیز دھار کناروں کو ہتھوڑی کی مدد سے ساتھ ساتھ کوٹ دیا تاکہ کوزا ڈالتے یا کوزا نکالتے وقت کسی کے ہاتھ نہ کٹیں۔ اس سارے کام میں کافی وقت لگ گیا۔ آخر میں ٹین کو اُس کی جگہ پر رکھ کر مڑا ہی تھا کہ وہ پھر آ گئی۔

پہلی نظر میں مجھے بالکل ایسا لگا تھا کہ وہ کوئی اور عورت ہے جو باہر سے کہیں مائی جمیلہ کو ملنے آئی ہے۔ مگر نہیں وہ وہی تھی مگر پھر بھی وہ کوئی اور عورت تھی جو 'ایوینگ ان پیرس' کی خوشبو کو یک دم برباد کر دینے والے مٹی کے تیل کی بدبو کو دور بھگا کر آئی تھی۔ اور میں نے دیکھا کہ پہلی بار میں اُس کی عمر کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ جو مجھ سے آگے تھی شاید کافی آگے تھی مگر وہ مائی جمیلہ نہ تھی۔ مائی مٹی کے تیل کی بدبو کے ساتھ ہی جیسے کہیں دور جا چکی تھی۔ میں مسلسل جمیلہ کو دیکھتا جا

رہا تھا مگر اب میں دیکھتا تھا کہ وہ میری طرف نہ دیکھتی تھی مگر جانتی تھی کہ میں اُس کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ شاید ایسا جیسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں کچھ ایسی لرزش تھی۔ آنکھیں جو پہلے سوئی ہوئی تھیں یا شاید وہ مردہ تھیں مگر اب یک لخت زندہ اور متحرک ہو کر دوسرے دیکھنے والے کی آنکھوں کو اپنے ساتھ چلنے کی ترغیب دیتی تھیں۔ جیسے اکیلے ناچنے والے کی آنکھیں دوسرے کسی اطمینان سے بیٹھے یا کھڑے کا مضحکہ اڑاتی ہیں اور اُسے دعوتِ رقص دیتی ہیں۔ اور میں نے دیکھا کہ اُسکے ہونٹوں پر مستقل جمی رہنے والی پپڑیاں غائب ہو چکی تھیں اور اُس کی کلائیوں کی تڑخی ہوئی کھردری جلد ہموار اور ملائم ہو چکی تھی جس پر گرم تیل کے چھینٹے سے جلنے کا نشان اب بھی نظر آتا تھا مگر باقی جلد کی طرح رنگت بدل کر گہرے سُرخ خون کی قوت سے دھمکتا دھڑکتا نظر آتا تھا۔ تب میں نے سوچا تھا کہ یقیناً اُس نے غسل کیا ہوگا۔ اس پر مجھے غسل خانے اور اُس کے ٹوٹے ہوئے فرش پر اینٹیں جمانے کے کام کا خیال آیا جو ابھی کرنا باقی تھا۔ "غسل خانے کے فرش کے لیے میں نے سوچا ہے۔ اُس مرغیوں کے پرانے کھڈے کو ادھیڑ لیتے ہیں مرغیاں تو ہیں نہیں وہی اینٹیں کام آ جائیں گی۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

میری بات سُن کر وہ ہنس پڑی اور مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے پہلی بار اُسے ہنستے ہوئے دیکھا اور سُنا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔

'تم ان غسل خانے کی اینٹوں اور ٹین کے ڈبوں سے کیا نکالنا چاہتے ہو۔'

مجھے دھچکا لگا تھا جیسے کسی چور کو چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا جائے۔ میرے مُنہ سے کوئی بات نہیں نکل رہی تھی کہ وہ آگے بڑھی اور کوزے کے لیے تیار کیے میرے ٹین میں پہلے کوزے کے طور پر کچھ گرا دیا۔ کھناک کی آواز سیدھی میرے دل میں لگی تھی۔ دیکھا تو وہی گہرے نیلے رنگ کی سینٹ کی خالی شیشی تھی۔

"پھینک دی" میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں۔ خالی شیشی تھی۔ تمہارا چچا بھی تو برتتا تھا' وہ پھر ہنسی اور رسوئی کی طرف چلی گئی میں اب مارچ کی دھوپ میں کسی ایسے چور کی طرح کھڑا تھا جسے اچانک معافی دے دی گئی ہو اور اُسے کچھ سمجھ نہ آ رہی ہو کہ وہ کیا کرے۔ میں نے صرف اتنا کیا تھا کہ پودینے پیاز لہسن کی کیاری کی طرف دیکھا تھا جہاں پر سبزی پھوٹ رہی تھی۔ دوسری کیاری میں بچے مجید کی لائی ہوئی

پھولوں کی پنیری میں اب پھولوں کی ڈوڈیاں نظر آنی شروع ہوگئی تھیں۔

اُس شام رسوئی میں کھانا کھاتے وقت بابا رمضان اور بچے مجید دونوں بار بار نظریں اٹھا کر جمیلہ کی طرف دیکھتے تھے۔ اور دونوں کی بوڑھی حیرت اور بچگانہ حیرت اپنی اپنی جگہ مجھے مضطرب کر کے بتاتی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔

بچے مجید نے پوچھا تھا 'ماں ہم نے کسی کی شادی پر جانا ہے' اُس معصوم نے ماں کا روزمرہ سے ویسا فرق شاید کبھی شادی کی تقریبوں میں شمولیت کے موقع پر دیکھا ہوگا۔ میں نے دیکھا تھا کہ جمیلہ کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ آئی تھی جو پھیلنے سے پہلے ہی غائب ہو جاتی ہے بابے رمضان کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے اور آنکھیں سکڑ گئی تھیں۔ مگر کوئی کچھ نہیں بولا تھا اور سب سر جھکائے آلو پالک کے ساتھ روٹی کھاتے رہے تھے۔ مگر پھر آدھی روٹی کھانے کے بعد جب بچے مجید نے ماں سے پھر وہی سوال کیا تو بابے رمضان کا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا۔

'مت ماری گئی ہے تیری' اُس نے بچے مجید کے سر پر تھپڑ مارا اور کہا، بچہ جو چوکی پر بیٹھا روٹی کھا رہا تھا بائیں طرف کو اُٹھ کر گرا اور پھر یک دم اُٹھ کر روتا ہوا اندر بھاگ گیا۔ پھر جمیلہ غضب ناک ہو کر اُٹھی جیسا میں نے اُسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

'میرا غصہ اُس غریب پر کیوں نکالتے ہو' اُس نے کہا اور بچے مجید کے پیچھے اندر چلی گئی۔ پھر بابا رمضان بھی نہ بیٹھ سکا اور روٹی چھوڑ کر وہ بھی گھر سے باہر نکل گیا۔ سب کچھ لمحوں میں ہو گیا تھا۔ اب میرے سامنے دائیں بائیں تین رکابیوں میں آلو پالک کے سالن کے اوپر روٹی کے تین لقمے دھرے تھے۔ چوتھا میرے ہاتھ میں تھا اور میری رکابی میرے سامنے تھی۔ چولہے میں لکڑیوں کی آگ جل رہی تھی اور میرے ذہن میں تین خیال آئے تھے۔ پہلا یہ تھا کہ ضرور بابے اور جمیلہ میں کچھ پہلے بھی ہو گزرا ہے جس کا بابے کو غصہ ہے۔ میرا دوسرا خیال مجھے بہت سختی سے کہتا تھا کہ مجھے بھی اپنا لقمہ رکابی میں وہیں رکھ کر فوراً وہاں سے چلے جانا چاہئیے۔ لیکن تیسرا خیال کہتا تھا کہ نہیں۔ مجھے بابے رمضان کو بتا کر جانا چاہیے اور جمیلہ کو بھی اور بچے مجید کو۔ میں یہی ــــ تینوں باتیں سوچتا رہا اور مجھے علم ہی نہ ہو سکا کہ کب روٹی سالن ختم ہو گئے اور دوسرے خیال پر عمل کرنے کی گنجائش بھی ختم ہو گئی۔ میں نے لکڑیاں چولہے سے باہر نکال کر بجھا دیں۔ ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ اندر کمرے میں سے کنڈے کو اندر سے بند کرنے کی آواز

ئی اور میں اور دھواں صحن میں سے اکٹھے ہی گزرتے تین دیواروں والے کمرے میں پہنچ گے۔

اُس رات بہت بارش ہوئی تھی۔ جیسے کبھی بہار کے شروع دنوں میں ہوتی ہے۔ میں نے رات ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ صبح سویرے ہی اُن لوگوں کو آخری بار خدا حافظ کہہ کر ایک بار پھر س ش شہر میں نکل جاؤں گا۔ رات کی زبردست بارش اور بجلی کی کڑک کے باوجود میرا فیصلہ برقرار تھا۔ میرا پتلون قمیض پر مشتمل وہ لباس جو میں نے آخری بار ریلوے لائین پر لیٹنے سے پہلے پہنا تھا۔ ایک کیل سے ٹنگا میرا منتظر تھا جسے مائی جمیلہ نے ایک بار دھو کر استری بھی کر دیا تھا، میں اُس جاے میں منتقل ہونے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بچہ مجید آ گیا اور مجھے رات کی بارش کے بارے میں ایسے بتانے لگا جیسے کہ مجھے اُس کا یقیناً کچھ علم نہیں ہوگا۔ مگر جس چیز کا واقعی مجھے علم نہیں تھا وہ یہ تھی کہ ساتھ والے دونوں کمروں کی چھتیں بُری طرح ٹپکتی رہی تھیں اور وہ تینوں رات بھر سو نہیں سکے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ وقت پر لپائی نہیں ہو سکی تھی اگر ہو جاتی تو ایسا نہ ہوتا۔ میں نے صحن میں جھانکا چکنی سُرخ مٹی کے ڈھیر سے بارش کے پانی نے کیچڑ کی دھاریں نکال کر اینٹوں کے فرش پر پھیلا دی تھیں اور تو ڑی بہہ کر جگہ جگہ لمبی لمبی لکیروں کی شکل میں اکٹھی ہو چکی تھی۔ اتنے میں باہر سے اُس کی ماں نے اُسے آواز دی۔ وہ آواز سرد اور کرخت تھی۔ میں اور بچہ مجید صحن کی طرف آئے تو میں نے دیکھا کہ مائی جمیلہ گھر واپس آ چکی ہے۔

مجھے اب فوری طور پر وہاں سے چلے جانا تھا میں نے جلدی جلدی غسل خانہ استعمال کیا اور اپنے آپ کو مسلسل اس سوچ سے باز رکھنے کی کوشش کی کہ اُسکے فرش پر اب بارش کے بعد تو ضرور اینٹیں لگ جانی چاہئیں۔ اور پھر میں نے کمرے میں پہنچ کر پتلون قمیض پہنی اور ایک چھوٹے سے گول آئینے میں اُس شخص کو دیکھا جو ایک بار پھر گھنے س ش شہر میں انسانوں کا مقابلہ کرنے جا رہا تھا۔ میں نے بچے مجید کو آواز دینے کا ارادہ کیا کہ وہ بابے رمضان کو بلا دے۔ مگر پھر اس کی ضرورت نہ پڑی۔ آہٹ سی ہوئی تھی اور میں نے دیکھا تھا کہ وہ تو میرے پیچھے کھڑا چندھیائی ہوئی سی آنکھوں میں حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ یقیناً اُسے میرے خلاف معمول لباس پر حیرت تھی۔ مگر پھر اُس نے میرے ساتھ کچھ باتیں کی تھیں۔ جن کے دوران رسوئی میں سے برتنوں کی کھٹ پھٹ کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ اور پھر آواز کے ساتھ مجھے وہ دو عورتیں مائی جمیلہ اور جمیلہ نظر آتی رہی تھیں۔

بابے رمضان کی باتوں کا مطلب میں سمجھ چکا تھا۔ وہ مجھے اس کواٹر میں مستقل رات گزارنے کا حق دینا چاہتا تھا مگر اس شرط پر کہ میں دن بھر س ش شہر میں کسی روزگار کا دھندہ کروں اور کچھ نہیں تو ایسا دھندہ ڈھونڈتا ہی رہوں۔ وہ دنیا میں اعلان کردے گا اُس کی بیٹی کے مرحوم خاوند کا بھائی شہر میں کام ڈھونڈنے آیا ہے۔ وہ میرا آگا پیچھا کچھ نہ ہونے کو بھولنے پر تیار تھا۔ مگر مجھے اُس کی باتوں میں اپنی مشکل کا ایک آسان حل بھی نظر آ رہا تھا۔ ٹھیک ہے میں اُس کی بات مان کر ابھی س ش شہر میں روزگار ڈھونڈنے نکل جاتا ہوں۔ اور پھر کبھی واپس نہیں آتا ہوں۔ اس طرح مجھے آخری رخصتوں کی جذباتی کھٹ پٹ سے نجات مل جائے گی جو مجھے برتنوں کی کھٹ پٹ کے ساتھ ساتھ سنائی دینے لگی تھی۔ ٹھیک ہے یہ سمجھیں گے میں کام ڈھونڈنے گیا تھا رات واپس نہیں آیا تو کل دن یا رات کو واپس آ جاؤں گا۔ مگر پھر وہ دن یا رات کبھی نہیں آئے گا تو سمجھیں گے... کیا سمجھیں گے مجھے کچھ سمجھ نہ آیا۔ لیکن پھر میں نے سوچا یہی بات بنانی مناسب ہے۔ چنانچہ میں نے بابے رمضان سے کہا کہ میں تو پہلے ہی یہ کپڑے پہن کر اِسی مقصد کے لیے س ش شہر میں نکلنے والا ہوں۔ میں نے دیکھا تھا کہ گہرے اطمینان کی لہر اُس کے چہرے پر دوڑ گئی تھی کہ 'اچھا۔ یہ تو بات پہلے ہی بنی ہوئی تھی'۔ پھر اُس نے مجھے ناشتہ کر کے جانے کی ہدایت کی۔ اور میرے انکار پر بہت اصرار کیا میں نے بھی سوچا تھا کہ چائے کے ساتھ مائی جمیلہ اور بچے مجید پر آخری نظر ڈال لیتا ہوں۔

پہلی آخری نظر میں اُس کی کلائیوں کی جلد پھر تڑخ کر اُس کی بد رنگ اوڑھنی کی ہم رنگ ہو چکی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر پپڑیاں پھر سے مردہ جھڑتی کھال کی طرح نمایاں ہو چکی تھیں۔ اس کی آنکھوں کا مجھے اک دم سے کچھ اندازہ نہ ہوا کہ وہ میری طرف نہیں دیکھتی تھی بلکہ بچے مجید کو چائے ڈال کر دیتی تھی بچہ مجید مجھے اُس لباس میں دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا اور بابے نے کافی جوش سے اُسے بتایا تھا کہ اب اُس کا چاچا۔ اور یہ لفظ اُس نے پہلی بار میرے لیے بچے مجید کو سکھایا تھا___ اب سارا دن کام پر رہے گا اور شام کو گھر آیا کرے گا۔ میں نے دیکھا تھا کہ بابے رمضان کی چہکار سُن کر مائی جمیلہ کے بابے کے لیے چائے انڈھیلتے ہاتھ وہیں رُک گئے تھے اور اُس نے سر اٹھا کر میری طرف براہ راست دیکھا تھا اُس کی نگاہ کچھ لمحے میرے اندر اترتی رہی تھی او وہ ایک نگاہ ہی میرے لیے کافی تھی۔

اُس کی وہ نگاہ وہ نگاہ نہ تھی جو کبھی مائی جمیلہ میرے اوپر ڈالتی تھی اور وہ نگاہ بھی نہ تھی جو میرے بنائے کوڑے کے ٹین میں سینٹ کی خالی شیشی کا پہلا کوڑا ڈالتی جمیلہ کی تھی۔ بلکہ یہ اُس نبری عورت کی تھی جو اپنے جسم کے اوپر اتفاق سے مٹی کا تیل گر جانے پر مجھے بتاتی تھی کہ بس اب ایک تیلی کھینچ دینے کی کسر ہے۔ وہ عورت جو جھوٹ کو صاف پکڑ کر اُس پر لعنت بھیجنے کی ہمت رکھتی تھی اور جس کی ہنسی نے اُس لمحے مجھے دہلا دیا تھا۔ وہ عورت جو نفرت کرنا جانتی تھی۔ میرے سامنے پھر پچھلی رات کے آلو پالک اور پراٹھا رکھا گیا۔ مگر میں جو پچھلی شام تین رکابیوں میں پڑے الم ناک لقموں کو دیکھتے ہوئے بھی اپنے حصے کا کھانا کھا گیا تھا اب چند لقموں سے آگے نہ جا سکا۔

میں اگر یہ کہوں کہ میں ہمیشہ کے لیے چلے جانے کے لیے اُٹھ گیا تھا تو جھوٹ نہیں ہوگا۔ بابا رمضان بھی مجھے شام تک باہر بھیجنے کے لیے میرے ساتھ اُٹھ آیا تھا۔ صحن میں دھوپ پھیل چکی تھی اور بارش کے بعد کا آسمان اتنا گہرا نیلا تھا کہ حیرت ہوتی تھی کہ آسمان اتنا نیلا بھی ہوسکتا ہے۔ اور پھر بابے رمضان نے پہلی بار پچھلی رات کی بارش کی بات کی تھی کہ کس طرح وہ رات بھر مختلف جگہوں پر سے ٹپکتی چھت کے نیچے برتن رکھ کر گھر کی چیزوں کو خراب ہونے سے بچاتے رہے تھے۔ میں نے افسردگی سے چکنی مٹی کے ڈھیر کی طرف دیکھا تھا جو عرصہ پہلے اسی مقصد کے لیے لایا گیا تھا کہ توڑی کے ساتھ اُس کی گھانی بنا کر چھت کی لپائی کر دی جائے۔ مگر وہ اکیلے بندے کا کام نہیں تھا ورنہ شاید میں بچے مجید کی کتابیں جلد کرنے سے پہلے ہی یہ کام کر لیتا۔ بابے رمضان نے میری نظروں کا تعاقب کیا اور وہ بھی افسردگی سے بولا گو کہ اُسکی افسردگی کچھ اور تھی 'ساری توڑی بہہ گئی'۔ اور میرے منہ سے نکلا تھا 'لپائی بہت پہلے ہو جانی چاہیے تھی'۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ فقرہ میرے ارادے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا تو جھوٹ نہیں ہوگا کیونکہ میرا ارادہ تو س ش شہر میں واپس جانے کا تھا۔ جس کے سینکڑوں برباد کرنے والے بھولے بسرے مناظر جنہیں میں نے ریل کی پٹڑی پر سونے سے پہلے دیکھا تھا ایک ایک کر کے واپس پلٹ رہے تھے جیسے ہارے ہوئے فوجی لٹے پٹے وطن واپس لوٹتے ہیں اور شکست کو ناقابل تردید بنا دیتے ہیں۔

میرا معاملہ عجیب تھا میں آخری شکست کے بعد ایک اور شکست کا سامنے کرنے کے

لیے نکلنے والا تھا مگر میرا حوصلہ بلند تھا اور عجیب بات ہے کہ اُس بلند حوصلگی میں اُس آسمان کا بہت ہاتھ تھا جس کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ میرا مستقبل کا ارادہ صرف اتنا تھا کہ میں اُس کوارٹر کے دروازے سے نکل کر س ش شہر کے سب سے خوبصورت پارک میں جاؤں گا جہاں یقیناً کچھ نہ کچھ پھول کھل چکے ہوں گے اور میں کسی پتھر کے بنچ پر بیٹھ کر پھر سے آسمان کو اور پھولوں کو دیکھوں گا اور یہ بھی دیکھوں گا کہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ بس اتنا کچھ ہی مگر مستقبل کی مکمل منصوبہ بندی محسوس ہوتا تھا۔ اور اُس سب کچھ میں کہیں بھی کوارٹر کی چھت کی لپائی کرنے کا ارادہ شامل نہیں تھا۔ مگر پھر بوڑھا بابا رمضان لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف بڑھا تھا اور اُس نے ایک کھرپہ اُٹھا کر تیزی سے نیچے بیٹھ کر چکنی مٹی سے بہہ کر آنے والے گاڑھے سُرخ کیچڑ کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا اگر وہ یہ کام میرے 'باہر کے' دروازے کی طرف مڑ جانے سے چند لمحے بعد کر لیتا تو شاید دنیا کچھ اور ہی ہوتی مگر یہ نہ ہوا اور ہوا وہی جو ہوا۔ اُس نے اپنی بیٹی کو آواز دی کہ وہ اُسے تانبیہ دے تا کہ وہ اُس میں کیچڑ اکٹھا کرے۔ مگر مائی جمیلہ بچے مجید کو اندر لے جا کر سکول کے لیے تیار کر رہی تھی میں جانتا تھا کہ تانبیہ کبھی میرے استعمال میں رہنے والے تین دیواروں والے کمرے میں رکھا تھا۔ میں نے سوچا تیزی سے تانبیہ پکڑ کر لاتا ہوں بابے کے پاس رکھتا ہوں اور اس گھر میں یہ آخری کام کر کے بس ایک لمحہ بھی اور نہیں رُکتا اور نکل جاتا ہوں۔ اور یہ جھوٹ نہیں تھا۔

مگر جب میں اُس کمرے کی طرف جانے لگا تو مائی جمیلہ بچے مجید کو سکول چھوڑنے کے لیے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ پھر میں نے دیکھا تھا کہ اُس کی آنکھیں بھی اب مکمل طور پر مائی جمیلہ کی آنکھیں تھیں جو نہ کسی سے کچھ مانگتی تھیں نہ کسی کو کچھ دیتی ہیں بس اِدھر اُدھر دیکھ لیتی تھیں۔ اور ایسے ہی اُس نے مجھے بھی پھر دیکھ لیا۔ پھر مجید اتنا خوش نظر آ رہا تھا کہ مجھے اُس کی خوشی پر گہرا دُکھ ہو رہا تھا۔ مائی جمیلہ کے ماتھے پر دھوپ نے چکنا پسینہ چمکا دیا تھا جو اُس کے خشک ہونٹوں کی خشکی کو اور بھی نمایاں کر رہا تھا۔ بچے مجید نے اپنی خوشی کا سبب یہ بتایا تھا کہ آج اُس کا حساب کا امتحان تھا جس سے اب اُس کو ڈر نہیں آتا۔ پھر وہ ماں بیٹا چلے گئے۔

اب یہ بالکل سچ ہے کہ تانبیہ اُٹھا کر مڑنے تک میرا وہی ارادہ برقرار تھا یعنی میں ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔ مگر پھر میری نظر کیل سے ٹنگے اُس لباس پر پڑی تھی جو میں نے اُسی صبح اتارا تھا اور پہلی بار مجھے وہ فقرہ اپنے اندر کہیں سنائی دیا تھا۔ ان لوگوں کا یہ آخری کام تو مجھے کر

وا ہی دینا چاہیے۔ یہ فیصلہ تو اٹل ہے کہ میں نے واپس چلے جانا ہے۔ لیکن یہ لپائی کا آخری کام تو مجھے کروا ہی دینا چاہیے۔ بس یہ آخری کام ہوگا'' مجھے یاد ہے کہ میرے اندر وہ کسی ایسی ہی آواز کا دباؤ تھا کہ 'آخری کام' مجھے ضرور کروا دینا چاہیے۔ مگر یہ دباؤ میرے فیصلے کے دباؤ کو کم نہیں کرتا تھا اُسے اور بھی بڑھاتا تھا۔ کسی جگہ سے ہمیشہ کے لیے جانے والے کو وہاں کوئی ادھورا کام نہیں چھوڑنا چاہیے۔

بابے رمضان نے جب مجھے تانبیہ کے ساتھ اور 'لپائی کے لباس' میں دیکھا تھا تو وہ پھر حیران رہ گیا تھا۔ پھر ہمارے درمیان کچھ بات ہوئی تھی اور آخر اُس نے پوری طرح تسلیم کر لیا تھا کہ روزگار کی تلاش میں تو میں کل بھی نکل سکتا ہوں لیکن چھت کی لپائی آج ہی ہو جانی چاہیے۔ ورنہ، بارش پھر ہو سکتی ہے اور چھتیں پھر ٹپک سکتی ہیں اور ایسی چھتیں کسی روز گر بھی سکتی ہیں۔ پھر اُس نے مجھے کہئی لا کر دی اور میں نے گھانی بنانے کے لیے چکنی مٹی کو دائرے کی شکل میں پھیلایا اور پھر اُس کے ارد گرد مٹی کا تھوڑا اونچا سا بند بنایا تا کہ کیچڑ بنانے کے لیے ڈالا جانے والا پانی گھانی کے اندر ہی رہے۔ پھر اچانک بابے کی آواز پریشانی سے بھر گئی۔ توڑی تو بہہ گئی تھی۔ اور پھر فیصلہ ہوا کہ بابا توڑی لینے جائے گا مگر پہلے اپنے افسر سے دن کی چھٹی لے گا پھر کہیں سے کافی توڑی خرید کر لائے گا جس کے بغیر کیچڑ جڑتا نہیں اور لپائی سوکھ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔

جب بابا رمضان گھر سے چلا گیا تو اُس وقت تک میں پانی کی آٹھ بالٹیاں چکنی مٹی کے اوپر گرا چکا تھا۔ مٹی رات کی بارش سے پہلے ہی بھیگی ہوئی تھی اور پانی میں کسی بھورے رنگ کے صابن کی طرح گھل رہی تھی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ میں گھانی میں داخل ہو کر اپنے پاؤں کی قوت آزماتا اور پانی اور مٹی کو اس حد تک یک جان کر دیتا کہ بعد میں چکنا گارا توڑی کو اپنے اندر شامل کر کے ایک دیر تک قائم رہنے والے لیپ کی شکل اختیار کر لیتا۔ تو میں نے اپنی شلوار کو گھٹنوں تک اونچا کھینچ کر اڑس لیا اور تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اپنا دایاں پاؤں گھانی میں اُتار دیا۔ چکنی مٹی پاؤں کے تلووں اور ہاتھوں کے پوروں پر اپنا آپ کیسے محسوس کراتی ہے یہ وہی لوگ جانتے ہیں جنھیں اُس سے واسطہ پڑا ہو۔ پھسلنا۔ پھسلن اور پھیلاؤ جیسے احساس میرے ذہن میں آتے تھے۔ پاؤں کے تلوے چکنی۔ ٹھنڈی ملایمت میں جیسے بہک بہک پڑتے تھے مگر میں انہیں

الٹا اُٹھا کر نیچے اتارتا تھا۔ سخت ڈھیلے پاؤں کے وزن کے نیچے چند لمحوں کے لیے اپنا وجود برقرار رکھتے تھے مگر پھر نرم مخملیں گارے میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ پھسلن۔ نرماہٹ۔ چکناہٹ کے احساس کے اندر اندر کبھی کسی سخت کرخت کنکر روڑے کی آمد چکناہٹ کے احساس کو اور بھی بڑھا دیتی تھی۔

میں نے ابھی تھوڑا سا حصہ ہی گارے میں تبدیل کیا تھا کہ مجھے اندازہ ہوا کہ ڈھیلوں کی سختی کو رام کرنے کے لیے ابھی مجھے اور پانی درکار ہوگا۔ میں نے اُسی طرح گھانی، باہر نکل کر دو بالٹیاں پانی اندر ڈالا اور پھر بالٹی ایک طرف رکھ کر گھانی میں واپس اُترا ہی تھا کہ مائی جمیلہ آ گئی۔ میں توقع کر رہا تھا کہ جب مائی جمیلہ آئے گی تو مجھے اِس حالت میں دیکھ کر کم از کم حیران تو ضرور ہوگی اور وہ حیرت ہی اُس کی مردہ ٹھنڈی آنکھوں میں کچھ نہ کچھ زندگی کی چمک دوڑا دے گی۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا نہ صرف یہ کہ اُس نے کیچڑ گارے میں میرے اُس عجیب ناچ کو انتہائی معمول کا شاید متوقع منظر سمجھا بلکہ خود ہی پانی کی ایک اور بالٹی بھر کر پاس رکھ دی۔ اور مجھے کہا کہ جب اور پانی کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔ جیسے اگر گھر میں اُس کام پر کوئی دیہاڑی دار مزدور لگایا جاتا تو وہ کہتی۔

وہ رسوئی میں جا کر پیڑھی پر بیٹھ گئی اور تھال میں دال پھیلا کر روڑ چننے لگی۔ میں اپنے کام میں مصروف رہا۔ تقریباً آدھا حصہ گارے میں بدل چکا تھا۔ دھوپ تیز تھی اور پسینہ بہتا تھا میں نے قمیض اتار کر دور پڑی چارپائی پر رکھنی تھی میں باہر نکلا اور مجھے احساس ہوا کہ وہ ضرور مجھے دیکھ رہی ہے۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ وہ مجھے نہ دیکھ رہی ہو۔ گھانی کے باہر کا حصہ پانی اور کیچڑ سے زیادہ پھسلوان ہو چکا تھا میں احتیاط سے قدم رکھتا چارپائی پر قمیض رکھ آیا۔ اور واقعی وہ مجھے دیکھ رہی تھی اس لئے وہ پھر آئی اور دوبارہ کہنے لگی کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو اُسے بتایا جائے جیسے وہ اجنبی دیہاڑی دار کو خوامخواہ گھر میں اِدھر اُدھر پھرنے سے باز رکھنا چاہتی ہو۔ میں نے پاس رکھی پانی کی بالٹی گھانی کے اندر پھینکی اس طرح کہ پانی ایک چادر سا بن کر اندر اُترا۔ اور پھر میں مائی جمیلہ سے کہنے ہی والا تھا کہ وہ میرے کام کی فکر نہ کرے اور اپنا کام کرے مگر وہ فوراً ہی پھر بالٹی اُٹھا کر بھرنے چلی گئی۔ میں گھانی سے باہر ہی کھڑا رہا اور اُس وقت اچانک میرے اندر شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں نرم چکنے ملائم گارے میں لیٹ جاؤں اور مٹی کی چکناہٹ کو پورے جسم پر پھیلا لوں عجیب خواہش تھی عجیب خیال تھا میں نے آسمان کو دیکھا جو اب اتنا نیلا نہیں تھا۔ شاید ایک انسانی کیچوا بن کر کیچڑ میں لوٹ لگانے کی خواہش نے آسمان کی نیلاہٹ میں کمی کر دی تھی میں نہیں جانتا۔

مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ میرے ذہن میں کچھ ایسے ہی خیالوں کا کیچڑ بن رہا تھا اور میرے پاؤں پھسلن پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے کہ وہ بالٹی بھر کر لے آئی۔ جو لوگ پھسلن پر چلنے کا تجربہ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ پھسلن خواہ کتنی بھی زیادہ ہو اگر آپ متواتر قدم اٹھائے جائیں یا ایک ہی جگہ رُکے رہیں تو آپ کبھی نہیں پھسلیں گے۔ لیکن یک دم رک جانے یا یک دم آگے بڑھنے کی خواہش پھسلنے کے انجام کی طرف ضرور لے جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مائی جمیلہ پانی سے بھری بالٹی لیے میری گھانی کے قریب پہنچی تھی تو میں نے آگے بڑھ کر بالٹی تھامنے کی کوشش کی تھی اور پھر میں اپنے آپ کو نہ تھام سکا تھا۔ میرے دونوں پاؤں جیسے خودمختار ہو کر مجھ سے پہلے ہی مائی جمیلہ کی طرف بڑھ چکے تھے اور میں کمر کے بل گرتے گرتے ہوئے اپنے بازوؤں اور ہاتھوں کو چوٹ سے بچنے کے لیے کچھ نہ کچھ استعمال کر چکا تھا۔

دنیا میں شاید بہت کم لوگ ہی ہونگے جو پھسلتے ہوئے کو دیکھ کر اپنے اندر ایک دم مچ اٹھنے والی ہل چل پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور مائی جمیلہ بھی یقیناً اُن لوگوں میں سے نہ تھی۔ اِس لیے اُس لمحے جب کہ مجھے تین دیواروں والے کمرے کی چھت پر پڑے اور باہر کو نکلے بانس اور کپڑے سکھانے کے لیے باندھی گئی تاروں کے پیچھے اُس دن کا رنگ بدلنے والا آسمان نظر آ رہا تھا اور میرے کانوں میں اُس عورت کی ہنسی کی آواز اپہنچی تھی تو مجھے بالکل حیرت نہ ہوئی تھی۔ اور میں نے ایسے موقعوں کی خفت اور لاچارگی کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا تھا اور پھر حیران رہ گیا تھا۔ مائی جمیلہ کہیں جا چکی تھی اور وہ جمیلہ تھی جو مجھ گرے ہوئے پر ہنس رہی تھی۔ تب میں نے پھر یک دم تیزی سے اُٹھ کر جانا چاہا تھا شاید میں جمیلہ کے سامنے زیادہ دیر اِس طرح گرا نہیں رہنا چاہتا تھا مگر اِس کوشش میں میں پھر تھوڑا اُٹھا اور پھر پھسل کر گرا۔ مگر جہاں پھسل کر گرنے والے پر ہنس پڑنا انسانی فطرت ہے وہاں اُس کی طرف سہارے کا ہاتھ بڑھانا

بھی اِسی فطرت میں شامل ہے۔ شاید اِسی لیے مجھے دوسری بار گرا دیکھ کر جمیلہ اور بھی ہنسی لیکن اُس کا ہاتھ میری طرف جیسے اُس سے پوچھے بغیر ہی بڑھ گیا۔ مگر جو وہ نہ جانتی تھی وہ یہ تھا کہ گرے ہوئے کو تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھانے والے کو خود مضبوطی سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔
اور وہ ایک خطرناک پھسلوان مقام تھا۔

جمیلہ جب پھسل کر گری تو سیدھی میرے گرے ہوئے جسم کے اوپر آئی اور گرنے کے انجام پر دوہری ہل چل مچانے والی وہ انسانی فطرت میرے اندر بھی بیدار ہو گئی اور میں اپنے آپ کو ہنسنے اور اُسے تھام لینے سے باز نہ رکھ سکا تھا۔ اور وہ ہم دونوں کی ہنسی، گرے ہوئے ایک دوسرے کو تھامتے جسموں میں دوہری دھمک کی تھاپ دیتی تھی اور صاف بتاتی تھی کہ اب دونوں میں سے کوئی بھی اُٹھ نہیں سکے گا کہ اُٹھنا پھر سے پھسلنا ہے اور پھسلنے سے نجات ایک دوسرے کو تھامے رکھنے میں ہے۔ چند گھڑی پہلے میں وہ جو چکنے کیچڑ میں لوٹ لگاتے کیچوے کے دن کا خواب دیکھتا تھا۔ وہ خواب جیسے میں جی رہا تھا۔ مگر جیسے وہ ایک نہیں دو کیچوے تھے جو چکنی مٹی کی چکناہٹ میں اچانک گُم ہو جانے والی اپنے جسموں کی چکناہٹ کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے بل کھاتے اور لپٹتے تھے اور پھر جب اُسے دوسرے کے جسم پر ایسا ڈھونڈ پاتے تھے کہ جیسے چکنی مٹی کے سخت ڈھیلے تو وہ اُسے دوسرے جسم کی نرم مٹی میں بار بار گہرا دفن کرنے کے لیے اتنے بے تاب ہو جاتے تھے کہ اُن کے بخار زدہ نم آلود جسموں سے سینک کے انجرے اُٹھتے تھے۔ اور پاس بنی گھاٹی پر گرتی دھوپ کے اٹھائے انجروں میں جا ملتے تھے۔

چھتوں کی لپائی کا کام رات گئے مکمل ہوا تھا۔ میں صبح دیر سے اُٹھا تھا۔ جمیلہ بچے مجید کو سکول چھوڑنے جا چکی تھی۔ بابا رمضان تانبے دھونے اور فرش صاف کرنے کے چھوٹے موٹے دھندے کرتا پھرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اِس گھر سے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کا یہ اچھا موقع ہے۔ میں نے وہی لباس پہنا اور صحن میں نکل آیا اور دروازے کی طرف بڑھا اور بابے سے کوئی بات نہ کی مگر اُس نے میری کامیابی کی دعا کی۔
س ش شہر ایک ایسا شہر تھا کہ جیسے کوئی دوسرا شہر تھا۔ گہرے نیلے آسمان کے نیچے

گزرتی سرمئی سڑکوں پر شوخ اور ہلکے پیلے۔ سرخ۔ بھورے رنگ کے مکانوں اور عمارتوں میں سے گزرتی سرمئی سڑکوں پر شوخ اور ہلکے رنگوں کی گاڑیاں دوڑتی تھیں اور فٹ پاتھوں پر سے گزرتے خوبصورت۔ قبول صورت۔ معمولی صورت لوگوں کی آنکھوں میں زندگی پر اپنے اپنے گہرے اطمینان کی چمک لہراتی تھی۔ بدصورتی سے متنفر اُن اچھے لوگوں نے مجھے کئی طرح سے زندہ رہنے کی پیشکش کی تھی۔ ایک جنرل سٹور پر ملازم کی ضرورت تھی میں وہ ملازم ہو سکتا تھا۔ میں ایک پرنٹنگ پریس میں چھوٹے موٹے اشتہاروں کی پروف ریڈنگ کر سکتا تھا۔ میں ایک لائبریری کی ریسپشن پر آنے والوں کی چیزیں سنبھال کر انہیں ٹوکن دے سکتا تھا۔ میں ایک گوشت مارکیٹ میں گاہکوں سے فون پر آرڈر لے کر اُن کے گوشت پہنچانے والا کارکن بن سکتا تھا۔ میں سادہ جسمانی کام کر سکتا تھا۔ اور یہ کام میں نے اُس روز کیا۔ میں ٹرکوں کے اڈے پر چلا گیا تھا اور چند گھنٹے سامان کی ڈھوائی کا کام کیا تھا مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی جو مجھے مل گئی تھی۔

میں چچا قدرت اللہ کی دوکان پر چلا گیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوا تھا مگر مجھے اُسے دیکھ کر دُکھ ہوا تھا کہ بوڑھا لاغر آدمی کیسے اِس عمر میں روزی کیلئے مشقت کر رہا ہے۔ جبکہ اُسے آرام کی ضرورت ہے۔ میں نے دوکان کے عقبی حصے کی کوٹھڑی میں ابھی تک رکھے اپنے تعلیمی کاغذ اکٹھے کیے تھے اور جانے سے پہلے چچا قدرت اللہ کو پاس کے بازار سے گرم میٹھے دودھ کا ایک پیالہ لا کر دیا تھا جسے وہ کچھ سمجھ نہ پانے کے باوجود پی گیا تھا۔

دن ختم ہو رہا تھا۔ رات آ رہی تھی اور اگر میں یہ کہوں کہ اُس لمحے تک مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ اُس رات کے خاتمے کے بعد میں کہاں ہوں گا تو یہ جھوٹ نہیں ہوگا اور رات جو آ رہی تھی ملائم گرم اندھیرے والی رات تھی۔

میں چل پڑا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ وہ شہرے کے کسی عام سے محلے جیسا بازار تھا اور وہ کوئی چھوٹی سی جنرل مرچنٹ کی دکان تھی۔ اور میں وہاں ویسے ہی رُک گیا تھا اور کسی بھی وجہ اور کسی بھی مقصد کے بغیر اُس کے چھوٹے سے شوکیس میں جھانکنے لگ پڑا تھا۔ اور پھر اچانک میری نظر اُس پر پڑی تھی اور میں دیر تک اُسے دیکھتا رہا تھا۔ سوچتا رہا تھا پھر میں نے دوکان دار سے اُسے دیکھنے کی فرمائش کی تھی۔ جو اُس نے پوری کر دی تھی۔ پھر میں نے اُس

کی قیمت پوچھی تھی اور مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میں اُس کی قیمت ادا کر سکتا ہوں۔ میں نے گہرا سانس لیا تھا اور چاروں طرف دیکھا تھا اور پھر دیکھا تھا کہ رات جو آ رہی تھی وہ چکنے ملائم گرم اندھیرے والی رات تھی۔ میں نے قیمت ادا کی تھی اور آہستگی سے اُس گہرے نیلے رنگ کی شیشی کا ڈھکن کھول کر اُسے اپنے قریب لے گیا تھا۔ ایوینگ ان پیرس کی خوشبو میرے اندر اُترتی چلی گئی تھی۔

بے افسانہ

نازش نبردازی نے ابھی افسانہ نگاری کے میدان میں سر نکالنا ہی شروع کیا تھا کہ جبر کے دور کا آغاز ہو گیا۔

پچھلے تین ماہ کے دوران نازش نبردازی نے شہر کی سب سے بڑی ادبی مجلس میں جو تین افسانے پڑھے تھے انہیں اخباری نقادوں نے علی الترتیب۔ عصری شعور کا حامل افسانہ، دیہی وقصباتی زندگی کی طرز زیست کی جڑوں میں اتر کر لکھا گیا افسانہ اور ایک ٹھیک ٹھاک افسانہ قرار دیا تھا۔ دوسرا افسانہ یعنی جو طرز زیست کی جڑوں وغیرہ کے حوالے سے لکھا گیا تھا اور جسے نازش نبردازی نے (نوٹ۔ اس تحریر میں آئندہ جہاں کہیں نازش نبردازی کے نام کی دہرائی تحریری انقباض (ان۔قباض) (ع) مذکر۔ گرفتگی، بستگی، رکاوٹ، قبض) (فیروز اللغات) یا سمعی و بصری اشتقاق (لفظ مذکورہ فیروز اللغات میں بوجوہ درج نہیں اس لیے راقم اس کی لالفظیت یا نالفظیت یا بے معنویت کا ذمہ دار نہیں ہے) کا موجب بنتی نظر آئی تو صرف نازش یا صرف نبردازی سے کام چلایا جائے گا بلکہ بعض اوقات اسم مذکور کی مخففات (مخفف کی تذکیر و تانیث کے بارے میں فیروز اللغات ایک بار پھر خاموش ہے اگرچہ راقم الحروف و سطور کی حقیر رائے میں مخفف سے چونکہ اختصار، کم کیا گیا، چھوٹا کیا گیا، گھٹایا گیا، سکیڑا گیا نوع کی معنویت کے سوتے پھوٹتے ہیں اس لیے اسے مونث ہی ہونا چاہیے) یعنی ن ن اور محض ن کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا جائے گا۔)

اغلب ہے کہ مذکورہ بالا تحریر کا غالب حصہ انتشار معنوی کا شکار ہو کر لایعنیت کی حدود کو چھو چکا ہوگا اور ہوش مند قاری کے ہوش اڑا کر اس کے صبر و تحمل کا امتحان لے رہا ہوگا۔ راقم چونکہ

قاری کے امتحان مذکور میں فیل ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا اس لیے...... جسے نازش نبردازی..... (سے لے کر)... گریز نہیں کیا جائے گا، (تک)... تحریر پر ایک خیالی خط تنسیخ پھیرتا ہے اور قاری سے بھی التماس کرتا ہے کہ وہ ان رد شدہ (ردی، مرتد، تردید، ارتداد) سطور پر ایک بڑا سا کاٹا، لگاوے اور بقیہ تحریر کے لیے عازم خواندگی ہو۔ (وقفہ برائے ارتکاز فکری، انشراح روحانی۔ بالالفاظ دیگر یہ وہ مقام ہے جہاں مصنفین لکھائی سے وقتی طور پر تائب ہو کر تخلیقی بغلیں جھانکنے کا شغل کرتے ہیں۔ جھانکنے کے اس عمل کے دوران بسا اوقات کچھ نہ کچھ ان کے نظر پڑ ہی جاتا ہے اور وہ دوبارہ قلم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس میں کچھ نہ کچھ دیر لگ ہی جاتی ہے (قریب ترین موازنے۔ بیٹری چارج ہونا، انجن اوور ہال ہونا)..... قاری سے درخواست ہے کہ وہ اس دوران ٹھنڈے مفرح قلب مشروبات سے لطف اندوز ہو)........ سلسلہ وہیں سے بحال کیا جاتا ہے جہاں یہ فن تحریر کی فنی خرابیوں کی وجہ سے منقطع ہوا تھا۔

نازش نبردازی کے دوسرے افسانے کو جو کہ دیہی زندگی کے پس منظر میں تھا اور جسے ن ان نے اپنے سابقہ گاؤں کڑیال کلاں کے ولیے موچی کی حیات مستعار سے متاثر ہو کر لکھا تھا اور اسی کے نام نامی سے معنون (عنوان دیا گیا) کیا تھا۔ ایک سنجیدہ نقاد کے نزدیک افسانے میں کہانی کی طرف مراجعت کا ایک واضح اشارہ تھا۔ نقاد مذکور نے نازش کو ایک معروف افسانہ نگار تسلیم کرتے ہوئے لکھا تھا... نازش نبردازی کا افسانہ ولیا موچی، سامعین کے لیے ایک خوش گوار حیرت کا باعث بنا۔ فسانہ نگار نے افسانے کو علامتیت، تجریدیت اور سریلزم کے بنجر میدانوں سے نکال کر روایت حقیقت نگاری کے گھنے جنگل میں لا کھڑا کیا تھا۔۔۔ سنجیدہ نقاد نے البتہ یہ لائنیں پھاڑ کر پھینک دیں تھیں کیونکہ باوجود کافی مغز ماری کے اُسے 'حقیقت نگاری کے گھنے جنگل' کی ترکیب کا کوئی متبادل نہ مل سکا تھا۔ اُدھر علامتیت وغیرہ کے بنجر میدانوں کے مقابلے میں حقیقت نگاری کے لیے کوئی ہرا بھرا استعارہ تحریری توازن کے لیے بہرحال ضروری تھا۔ سنجیدہ نقاد اُس شام اپنی نااہلی پر کافی رنجیدہ ہوا تھا اور اخبار کے ادبی صفحے میں ادبی مجلس کی رپورٹ لکھتے وقت اُس نے نبردازی کے دوسرے افسانے پر صرف اتنا لکھا تھا۔ 'غزل کے بعد معروف افسانہ نگار نازش نبردازی نے افسانہ ولیا موچی پڑھا جو دیہاتی پس منظر میں سماجی حقیقت نگاری کی ایک عمدہ مثال تھا۔'

اُس ادبی مجلس کے بعد البتہ اُسی شام نبردازی کے ایک دوست نے افسانے کے عنوان یعنی ولیا موچی، کو Too direct قرار دیا تھا اور لاتعلق سے انداز میں ن کو کوئی زیادہ بامعنی عنوان رکھنے کا مشورہ دیا تھا ('جب افسانہ چھپنے کے لیے بھیجو تو رکھ لینا')۔ لیکن اُسی رات آخری ویگن سے اپنے قصبے رادوکی پلٹتے ہوئے نازش نبردازی نے سوچا تھا کہ ولیے موچی پر لکھے گئے افسانے کا ولیا موچی، سے بہتر عنوان اور کیا ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی ایک گھنٹے کے سفر کے دوران ن ان نے گیارہ مختلف نا قابل اشاعت عنوان روانی فکر و سفر کی تاب نہ لاتے ہوئے سوچے، 1۔ زمانے میں کیل، 2۔ پایہ پایا، 3۔ گمنام ایڑی، 4۔ بالکل، 5۔ غراو، 6 چرمی گھاتیں، 7۔ اب کون یہاں پانی پینے آئے گا، 8۔ چمڑے کا قلزم، 9۔ مجھ سے بھی تو پوچھو، 10۔ بے کراں، 11۔ باپ پوش۔ ن کی یہ عنوان سازی ابھی اور جاری رہتی لیکن رادوکی آ گیا (رادوکی صوبائی دارالحکومت سے بیس میل جانب شمال کی جانب، تھا بلکہ اب بھی ہے۔)

نازش نبردازی جب دھواں اُڑاتی ویگن سے سیدھا گہری سیاہ رات میں اُترا تھا تو اُسے یوں محسوس ہوا تھا کہ تاریکی میں رادوکی کا غیر تاریخی قصبہ سویا پڑا تھا (تھا، تھا کی تکرار سے بچو)۔ سیاہ رات کی اُس ساعت میں ن کا وہ طرز احساس گہری صداقتوں کا امین تھا کیونکہ رادوکی کے چھوٹے سے قصبے میں اُس وقت دمے کے مریض اکیس بوڑھوں اور کوئی اڑھائی درجن جوان العمر عشاق کے علاوہ باقی سب معصوم لوگ گہری نیند میں ڈوب چکے تھے۔ اسی لیے قصبے کی بیشتر آبادی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ ان غیر معصوم، جاگتے لوگوں میں کھادی چھینجا عرف خالد بھی تھا۔ کھادی ن کے بچپن کے دوستوں میں سے تھا۔ علم و عرفان کی راہ پر بھی دونوں اکٹھے ہی گامزن ہوئے تھے لیکن غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک اس نوجوان نے تیسری جماعت کے نصف اول میں ہی تعلیمی نظام کی گوناگوں خرابیوں کا گہرا ادراک حاصل کر کے اپنی مکمل بیزاری کا اظہار کر دیا تھا اور پھر تعلم (تعل۔م) (ع۔ مذکر۔ پڑھنا، سیکھنا) پر مصر والد کے جسمانی تشدد کا دیوانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اس نے بالآخر اس فرسودہ جماعتیں پاس کرانے والے نظام تعلیم سے مکمل علیحدگی اختیار کر لی۔ کھادی چھینجا اب برسوں سے رادوکی کے لاری اڈے پر دن رات پکوڑے نکالتا تھا اور نکالنے کے بعد انہیں بیچ ڈالتا تھا۔ اس عمل سے اُسے گہرا اطمینان اور سو ڈیڑھ سو روپے حاصل ہوتے تھے۔ وہ بیسن، پیاز، نمک، مرچ اور کوڑے تیل کی دنیا کا بے تاج

بادشاہ تھا۔

(مبادا قاری اِس تحریر کا اصل نفسِ مضمون فراموش کر چکا ہو۔ اِس تحریر کے اولین فقرے کی طرف پھر رجوع کیا جائے۔ شکریہ۔ نازش نبردازی نے افسانہ نگاری کے میدان میں سر نکالنا ہی شروع کیا تھا کہ جبر کے دور کا آغاز ہو گیا..)۔

نازش نبردازی جب اُس رات ولیا موچی نامی افسانے کے متبادل نام ڈھونڈتا راوی کے لاری اڈے پر اترا تھا تو سامنے ہی کھادی پکوڑوں کا آخری پور نکالنے کا عزم کر رہا تھا اور ایک ابلے ہوئے انڈے پر بیسن کی تہہ جما کر اُسے تل دینے کے چکر میں تھا۔ ہاں بھئی کھادی، ن نے ایک دم اُس کے سر پر پہنچ کر اُسے دہلا دیا اور انڈہ اُس کی انگلیوں کی پوروں میں سے پھسلوان ہو کر چلپچی میں گرا اور بیسن کی دلدل میں ڈوب گیا۔ نرم رو واقعات میں اس حادثاتی مداخلت سے متوحش ہو کر کھادی کا اظہار جذبات فی الفور سامنے آیا اور اس نے انڈے کی پیدائش کی ذمہ دار ہستی سے کچھ ناممکن حیاتیاتی تعلقات کے امکان پر روشنی ڈالی اور سخت غصے سے گھوم کر دیکھا اور پھر اُس کا غصہ کافور (کافور۔ سفید رنگ کا ایک خوشبو دار قلمی مادہ Crystaline Solid۔ لکھنے والے قلم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، جسے Cinnamonum Camphora نامی درخت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اِس اعتبار سے حیرت انگیز مادہ ہے کہ ٹھوس حالت سے مائع میں بدلے بغیر ہی ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ مشکوک طبی خواص کا حامل ہے۔ جدید طب کی بجائے قدیم طب میں مستعمل ہے اور حکما اِسے بطور مترّش اور متحرک استعمال کر کے دکھی انسانیت کے دکھوں میں مزید اضافہ کرتے رہے ہیں۔ مشک کافور کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ عوام کے ایک طبقے میں منحوس بھی باور کیا جاتا ہے کیونکہ کفن دفن کے لوازمات کا لازمی حصہ ہے) ہو گیا۔ بلکہ ن کو دیکھ کر اُس نے دانت نکال دیے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہوئے۔۔ ہاں بھئی صاحب تراہ ہی نکال دیا۔ سُنا پھر شہر سے ہو آیا۔ ہو گیا جلسہ پڑھنے لکھنے والوں کا۔ (ن ن نے کھادی کو ادبی مجلس کا کچھ ایسا ہی تصور دیا تھا کہ یہ ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں لوگ کچھ نہ کچھ لکھ کر لاتے ہیں اور پھر پڑھ کر سنا دیتے ہیں۔ ”سیدھا لکھا لکھایا ہی کیوں نہیں دے دیتے ہر کسی کو بھئی جاؤ گھر و گھری جا کر پڑھ لینا۔“ کھادی چھینجا نے ایک دفعہ انتہائی جھنجے لہجے میں نازش نبردازی سے پوچھا تھا اور اُس وقت یہ لابدی (ع۔ لازمی، ضروری، ناگزیر، یقینی)

کھادی کے حساس ذہن میں (پر) سقراطی طریقے سے ادبی مجلس کی تنقیدی سرگرمیوں کے اسرار و رموز منکشف کرتا لیکن جان جوکھوں کی اِس آموزشی کان کنی، کے تصور سے بھی خائف ہوتے ہوئے اُس نے عام فہم بقراطی انداز میں کھادی کو صرف اتنا سمجھایا تھا بس یار کوئی پوچھنے والا ہے نہیں ان پڑھنے لکھنے والوں کو جو دل چاہے کرتے پھرتے ہیں، اور کھادی سب سمجھ گیا۔ ہاں ہو تو جب۔ نازش نے کہا تم سناؤ نکل گیا سودا۔ بک گیا سارا۔

ہزاروں من بک گیا۔ بس یہ آخری پور نکالنا ہے چھ سات آنڈوں کا۔ بارہ ایک کے ٹیم پر چینز گنڈیوں کے لگے ہوئے ہیں دو دو آنڈوں پر۔ گھر بار والے ہیں ناں آنڈے کھا کر یہاں سے گھر جاتے ہیں، کھادی نے ایک سازشی سی بے حیائی سے ہنستے ہوئے نازش نبردازی کی طرف دیکھا تو مگر پھر اس کا ٹھنڈا ٹھنڈا منہ دیکھ کر اداسی سے بولا۔

ویسے صاحب پتہ نہیں لوگوں کو ہو کیا گیا ہے۔ من سوا من پکوڑے نکالتا ہوں۔ رات بارہ ایک تک سب صاف ہو جاتا ہے۔ بھلا بتاؤ یہ بھی کوئی شے ہے کھانے والی۔ کھ جیسی (نوٹ۔ کھادی کو پکوڑے کھانے سے سخت نفرت تھی) مجھے تو لگتا ہے کال پڑنے والا ہے۔ (کال۔ (ہندی۔ مذکر) موت، قضا، اجل، موت کا فرشتہ، ملک الموت، وقت، زمانہ، موسم، رُت، قحط، گرانی، خشک سالی، قلت، کمی، توڑا، سیاہ، کالا) (فیروز اللغات)۔

کھادی کی یہ بات سنتے ہی نازش نبردازی پر تخلیق کا بھاری لمحہ ٹوٹ پڑا تھا اور اس پر مکمل روشن ہو گیا تھا کہ وہ اپنے اگلے افسانے کا خمیر اپنے بچپن کے یار کھادی چھینجا کے تصور انسان اور نظریہ زمان و مکان سے اٹھائے گا۔ ن ن نے اگرچہ ابھی تک صرف تین افسانے ہی لکھے تھے مگر جسم و جان پر تخلیق کے لمحے کی اترائی (نزول) کی علامات سے وہ کماحقہٗ آگاہ تھا۔ گو کہ، اگر وہ انھیں لفظوں میں پیش کرنے کی کوشش کرتا تو درج ذیل لفظیات ولغویات سے آگے نہ بڑھ پاتا۔ تخلیق کا لمحہ ایسا ہوتا ہے کہ جیسے 1۔ اچانک کوئی زناٹے دار تھپڑ پڑے، 2۔ دال روٹی کھاتے کھاتے اچانک کوئی کنکر دانتوں تلے آ جائے، 3۔ تیز ہوا سے کھڑکی اچانک کھل جائے اور کمرے میں بیٹھے شخص کو پتہ چلے کے باہر تو رات ہو چکی ہے یا دن چڑھ چکا ہے، 4۔ جوڑوں میں اچانک ناطاقتی، 5۔ اچانک دل کا بیٹھ جانا اور پھر اچانک ہی اُٹھ کھڑے ہونا، 6۔ چونک کر اچانک کا چکا چوند۔ چھ کی چھ علامات میں مشترک حقیقت 'اچانک'

ن ن کے اندر کہیں ٹھہر کر استقرائی عمل کے تحت اُسے باور کرا چکی تھی کہ تخلیقی عمل کی اصل ایک عظیم الشان 'اچانک' ہے۔ چنانچہ کھادی پر افسانہ لکھنے کا نازش نبردازی کا اچانک تخلیقی تیقّن اٹل تھا۔

مگر (فارسی) (ماسوا، الّا، بجز، لیکن، پر، شاید، البتہ، ہاں، ضرور، بے شک) (فیروز اللغات)۔ یہ تیقّن کبھی حقیقت نہ بن سکا۔ نازش نبردازی حقیقت نگاری کی روایت میں اپنا چوتھا افسانہ کبھی بھی نہ لکھ سکا۔ کیونکہ حقیقت نگاری کی روایت میں چوتھا افسانہ لکھنے سے پہلے ہی جبر کے دور کا آغاز ہوگیا۔

جب جبر (عربی) (مذکر۔ زیادتی، سختی، بے رحمی، زبردستی، ظلم وستم، دباؤ، حساب میں کسرات کا اختصار، معاوضے کے طور پر کچھ زیادہ دینا، ڈنڈ کسر) (فیروز اللغات) کے دور (عربی۔ مذکر) (چرخ، گردش، چکر، کسی چیز کا دورہ کرتے کرتے اپنی ہی ذات پر ٹھہرنا، چال، روش، فنا، حکومت، راج، سلطنت، گردش ساغر، حاشیہ، کنارہ، گھیرا، باری، نوبت، گرداگرد، زمانہ، عرصہ، عہد، انقلاب، تغیر وتبدل (فیروز اللغات) کا آغاز ہوا تو ن اس وقت اپنے مکان کی چھت کی منڈیر کے ساتھ لگا کھڑا چیونٹیوں کی ایک قطار کو دیکھ رہا تھا جو ایک مہین سے سوراخ میں مسلسل گھستی چلی جا رہی تھی۔ اسے نیچے صحن سے اپنے باپ کی آواز آئی تھی جس نے ریڈیو پر سنا تھا کہ جبر کے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ ن نے دوسری منڈیر پر جا کر نیچے دوبارہ پوچھا تھا تو باپ نے تصدیق کی تھی کہ واقعی ایسا ہو چکا ہے اور آنے والے آمر کا نام بھی اتفاق سے عامر ہے۔

نازش نبردازی چیونٹیوں والی منڈیر کی طرف لوٹ آیا تھا اور اگرچہ اس کی سرگرمیوں میں اُس وقت اُس فکری سوال کے سوچ بن جانے کا امکان موجود تھا مگر پھر بھی وہ یہ نہ سوچ سکا کہ تخلیق کے لمحے اور جبر کے دور کے آغاز میں اگرچہ اچانک، مشترک ہے مگر پھر بھی ان دونوں اچانکوں، میں کتنا فرق ہے۔ (فرق صاف ظاہر ہے)۔

ایسا کچھ بھی نبردازی نے نہ سوچا بلکہ سن سا ہو کر کھڑا رہا اور رادوکی کے قصبے کی چھتوں پر اکا دکا ٹیلی ویژن اینٹینوں اور کبوتروں کے اڈوں پر نظریں جمائے رہا۔ برسوں بعد جب ایک دفعہ اس نے اُس لمحے کا سوچا تھا تو اُسے بس یہی یاد آیا تھا کہ منڈیر پر رکھے اُس کے ہاتھ پر چیونٹی نے زور سے کاٹا تھا۔ ہاشم پوسٹ مین کے لڑکے شبیر کے پالتو کبوتر اک دم پھڑ پھڑا کر

ے تھے اور آسمان میں چڑھتے چلے گئے تھے۔ اگلی چھت پر ماسٹر یاسین کی لڑکی غزالہ نے ڈنے کا ایک چکر پھر لگایا تھا اور یقین سے سوچا تھا کہ میں جانتی ہوں کہ تم جانتے ہو کہ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ نازش نبردازی جبر کے لمحے میں بس ہی تھا...... (یعنی اُس وقت، بعد کی بات بعد میں آئے گی۔)

(راقم الحروف بیک وقت تیقّن اور تشکیک کا شکار ہو رہا ہے اور اِس خطرے سے بچنے کے لیے کہ فنِ تحریری کے تضادات کی کھینچا تانی اسے نیوراتی نہ بنا دے، فوری اظہار ذات کرنا چاہتا ہے۔)

تیقّن۔ (قاری نازش نبردازی کے بارے میں انتہائی تجسس کا شکار ہو کر اُس کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا ہے۔)

تشکیک (قاری نازش نبردازی کے بارے میں ابھی تک کچھ یا شاید کچھ بھی نہیں جان سکا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے شاید کچھ نہ کچھ جان ہی پایا ہو۔ باالفاظ دیگر راقم بحیثیت لکھاری شاید بنیادی کردار کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنے میں بُری طرح ناکام رہا ہے۔ الغیاث......)

نتیجہ = ن ن کے بارے میں جملہ معلومہ معلومات فی الفور کسی نہ کسی طرح قاری کو فراہم کردی جائیں۔

نام۔ نازش نبردازی، اصل نام۔ نیامت علی، ولدیت۔ حسن دین، قلمی نام۔ کوئی نہیں، عمر۔ 28 سال (عیسوی)، تعلیم۔ ایم۔اے اردو (پاس)، پیشہ۔ حقیقت نگاری (صرف افسانوں کی صورت میں)، سکونت۔ حالیہ سکونت۔ رادوکی، سابقہ سکونت موضع کڑیال کلاں، سکونت تیرہ نسل پہلے سمرقند، روایت۔ روایت ہے کہ آباؤ اجداد سرخ وسفید تھے۔ اب گندمی ہیں۔ کبھی کبھی سرخی مائل سیاہ بھی ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ لیکن روایت کا یہ حصہ مصدقہ نہیں۔ سفید کپڑے پہننے کے البتہ دلدادہ ہیں۔ (خصوصاً جب سے سفید پوشی کی طرف مائل ہوئے ہیں)۔ سرخ وسفید آباؤ اجداد سمرقند سے جانب جنوب ہجرت کر کے آئے تحقیقی نوٹ۔ اُس زمانے میں بہت کثرت سے لوگ سمرقند سے جانب جنوب ہجرت کرتے تھے۔ عجب تاریخی معمہ ہے۔ محققین و مورخین اگر مناسب سمجھیں تو متوجہ ہوں۔ (بے روزگار ایم۔اے ہسٹری نوجوان بھی رجوع کر

سکتے ہیں)۔ (بہرحال)۔ (تو خیر)۔ (ہاں جی)۔ تو ن ن کے آباؤ اجداد لق و دق صحراؤں۔ سنگلاخ چوٹیوں اور گھنے جنگلوں کو عبور کرتے بالآخر ایک دوپہر پانچ دریاؤں کی سرزمین میں آن نکلے۔ پہلا دریا دیکھا کہ بے تکان بہتا تھا۔ تو ٹھٹھکے اور کافی دیر تک ٹھٹھکے رہے۔ پھر اس عمل کو لاحاصل جان کر سوچنے لگے اور جلد ہی اس نتیجے پر پہنچے کہ کمر ہمت باندھنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ ایک بڑا سا رسہ لے کر قافلے کے ہر ذی روح کی کمر کمال ہمت سے باندھ دی گئی۔ آخری اقدام کے طور پر خچروں کو زور سے گرہ لگائی گئی اور یوں کمر کس کر دریا میں کود پڑے اور پھر ایک روز سب دوسری طرف دریا کے باہر نکل آئے۔ ہوش و حواس بحال ہونے پر سب سے پہلے تو داناؤں نے مال و اسباب کا جائزہ لیا اور گنتی نقد و زر و مرد و زن۔ چرند و پرند (خوردنی) اور حیوان و وحش (باربرداری) متواتر کی تو تیرہ راس بکریاں دو خچر (بے زبان)، تین مرغانِ خوش الحان اور اکیس مرغیاں بیضوی دریا برد ہو کر لقمہ اجل ہوئی قرار پائیں۔ صدمہ بھاری تھا اس لیے فوراً پڑاؤ ڈال دیا گیا اور جب بھیگی اجناس کو دھوپ میں سکھایا جا رہا تھا تو آباؤ اجداد میں سے نسبتاً زیادہ داناؤں نے ماضی قریب میں اٹھائے گئے اپنے دریائی اقدام کی سنگینی اور امکانی ہلاکت خیز مضمرات پر غور کیا تو ایک بار پھر ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ تب وہ جو اُن میں سے سب سے زیادہ دانا تھا اُس نے بعد از وقت ہوش و حواس کھونے پر سب کی نفرین کی اور حوادث سے سبق نچوڑنے کی ترغیب دی کہ طرۂ دانشِ نسلِ انسانی ہے۔ چنانچہ اُسی وقت کمر ہمت نہ باندھنے کی پالیسی کو اجتماعی دانش میں شامل کر لیا گیا۔ (شاید اسی وجہ سے آج بھی ن کے خاندان میں کمر درد (وجع الظہر) کے واقعات کی اوسط ملکی اوسط سے متجاوز (عربی۔ اپنی حد سے گزر جانے والا، تجاوز کرنے والا) (فیروز اللغات) ہے۔ چنانچہ دوسرا دریا اُن مردان و زنان نے کمر ہمت باندھ کر عبور کرنے کی بجائے کسی نہ کسی طرح پار کیا۔ تیسرا دریا جوں توں کر کے پار کیا گیا اور جب چوتھا دریا جیسے تیسے پار کر کے آباؤ اجداد خستہ و درماندہ آگے بڑھے تو پانچواں دریا سامنے تھا (کہ ٹھاٹھیں مارتا تھا)۔ تب اکثر لوگوں نے کہا کہ یہ کیا مصیبت ہے۔ یہ کیسی سرزمین ہے کہ دریا پر دریا آتا چلا جاتا ہے (سچ ہے دریاؤں کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے)۔ آخر بہ امر مجبوری پانچواں دریا پار کرنے کا بھی کوئی لسانی طریقہ ڈھونڈنے کی کوشش بے حد کی گئی مگر اے وائے کہ وہ قدیم زبان پانچواں دریا پار کرنے پر خاموش تھی (غیر ترقی یافتہ زبانوں کا ایک نقصان یہ بھی ہے)۔

اپنی زبان کے یوں اچانک بے زبان ہو جانے پر آبا سراسیمہ ہوئے اور مزید بحث سے جب ہو کر ثمر قند کو فی الفور واپسی کا اعلان کیا گیا۔ مگر بدقسمتی (بعض آرا کے مطابق خوش قسمتی) سے اعلان کی بھنک خچروں میں سے ایک کے کان میں پڑ گئی جو انسانی زبان سمجھتا تھا۔ اس حیوان نے یہ انسانی اعلان دیگر خچروں کے کانوں میں بھی بھنکا دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ خچروں میں عام بغاوت پھیل گئی اور وہ دور اندیش چوپائے رسے تڑا کر گھاس کے میدانوں کو بھاگ گئے۔ چنانچہ پڑاؤ ایک بار پھر ڈال دیا گیا۔ اس کے علاوہ اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔ آباؤ اجداد میں سے ایک نے خچروں کے اس انقلابی اقدام کو جائز قرار دیا اور حیوانات پر انسانوں کی چیرہ دستیوں کے موضوع پر ایک دلسوز تقریر کی (بعض قدیم تذکروں کے مطابق محکمہ انسداد بے رحمی حیوانات کا بانی یہی شخص تھا) اور بعد میں قافلے والوں سے دردمندی (کمری) سے اپیل کی کہ خدا کے لیے اب وہ جلد از جلد کہیں سیٹل ہو جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے قریبی موضع تڑیال کلاں کا انتخاب کیا گیا جو اس وقت بھی تقریباً ایسا ہی ترقی پذیر تھا جیسا آج ہے۔ سرخ و سفید آباؤ اجداد کی تواضع بھنے ہوئے مکئی کے دانوں اور بھیڑ کے کچے دودھ سے کی گئی۔ اس غذائی بے اعتدالی کی وجہ سے کچھ نفوس گرانی معدہ کا شکار ہوئے۔ مگر پھر تین چار ایام میں ٹھیک ٹھاک ہو گئے اور پھر تین چار صدیوں تک ٹھیک ٹھاک ہی رہے۔ (اختتام روایت آباؤ اجداد نازش نیرواڑی)۔

خط بنام راقم از طرف نائب مدیر ادبی مجلہ دروغ بگردنِ راوی۔

راقم صاحب، السلام علیکم

آپ اس قابل تو نہیں ہیں کہ آپ کو سلام کیا جائے لیکن انسان اپنی اچھی عادات کی وجہ سے مجبور ہو جاتا ہے۔ ورنہ کسی کا کیا جاتا ہے۔ بہرحال، قبلہ چھ ماہ پہلے آپ نے مجھے وہ آئیڈیا سنایا تھا کہ جبر کے دور میں ہمارے ادیبوں کا کردار کیا ہوتا ہے اور ایک عام آدمی کا کردار کیا ہوتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی بک بک تھی۔ شامت اعمال سے مجھے آئیڈیا پسند آ گیا اور میں نے مجلے کے لیے اسی پر افسانہ لکھنے کی جناب سے درخواست کی تھی۔ پتہ نہیں آئیڈیا آپ کا تھا بھی کہ نہیں (اب تو مجھے شک ہے)۔ لیکن آپ جناب آئیڈیا کو لے کر سو گئے۔ یاد دہانی کے خطوط

سے متاثر ہونا تو آپ نے سیکھا ہی نہیں۔ چھ مہینے میں تو راقم صاحب لوگ ناول لکھ لیتے ہیں اور آپ سے ابھی تک ایک افسانہ نہیں لکھا گیا۔ آپ تو ایسے Behave کر رہے ہیں جیسے آپ کوئی چوٹی کے ادیب ہیں اور ہم لوگ منتیں کر رہے ہیں کہ حضور کچھ عنایت فرما دیجئے۔ حالت آپ کی یہ ہے کہ ادبی دنیا میں، دانشوروں کے حلقوں میں میرے علاوہ کوئی آپ کا نام تک نہیں جانتا۔ ادیبوں، شاعروں، نقادوں سے آپ کا تعارف کروانا بھی ایک جان جوکھوں کا کام ہے۔ بھئی آخر انسان کیا بتائے کہ یہ کیا ہیں۔ یہ میرے دوست راقم صاحب ہیں،۔ اس سے آگے کچھ بتاتے ہوئے زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ اسی لیے سوچا تھا کہ تم کسی موقر جریدے میں چھپ جاؤ تو انسان کسی کو بتانے والا تو ہو کہ ہاں جی یہ افسانہ لکھتے ہیں۔ مگر تم، آپ ہیں کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ بہرحال اگر میں نے خدا ترسی سے کام لیتے ہوئے تمہیں، آپ کو چھپوانے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا تو آپ بھی مجھ پر ترس کھاتے۔ بہرحال۔ لیکن اب صورت حال سنگین ہو چکی ہے۔ پچھلے دو تین ماہ سے ایڈیٹر صاحب اکثر مجھ سے پوچھتے رہتے تھے کہ تمہارے وہ دوست راقم، کا افسانہ آیا کہ نہیں۔ اور میں ٹال دیتا تھا۔ اب تین دن پہلے جب انہوں نے استفسار کیا تو مجھے بتانا پڑا کہ راقم صاحب کا افسانہ تو نہیں آیا۔ جواباً وہ ہنسنے مسکرانے لگے اور کہا "اچھا ہی ہوا ابھی نہیں لکھا۔ پہلے One Line منگوالو۔"

اب یہ ون لائن سٹوری دراصل کسی بھی افسانے کے لیے ڈیتھ وارنٹ ثابت ہو سکتی ہے۔ میں تو دہل گیا۔ کچھ بھی کہوں آخر تمہارے ساتھ پرانی دوستی پرانے تعلق کا خیال۔۔ لحاظ آ ہی جاتا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ تمہارے کیس میں بات ون لائن تک نہ پہنچے۔ لیکن ایڈیٹر صاحب مصرر ہے۔ میں اب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دراصل جب سے ایڈیٹر صاحب نے ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے لکھنے شروع کیے ہیں، وہ ون لائن کی عظمت کے شدت سے قائل ہو گئے ہیں، خود ان کے ڈراموں کے چھ سکرپٹ لکھے جانے سے بیشتر ہی اسی ون لائن، کی وجہ سے Reject ہو گئے۔ چنانچہ افسانہ تو تم خیر جو بھی لکھو گے سو لکھو گے، ون لائن سٹوری فی الفور بھجوا دو۔ ایڈیٹر صاحب اب پالیسی کے طور پر سب مشکوک افسانہ نگاروں سے پہلے ون لائن طلب کرتے ہیں۔۔۔ اچانک مجھے خیال آیا ہے کہ تمہیں تو سمجھانا پڑے گا کہ ون لائن سٹوری آخر ہوتی کیا ہے کیونکہ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود تم جدید ادبی رجحانات کے بارے میں خاصے

سرے سے شاعر ہی نہیں ہو۔ تم بس۔ ہاں تم صرف ایک انتہائی نائب مدیر ہو۔۔۔ (بعدِ زمانی۔ مکانی وامکانی)..........

معاف کرنا یار خیالی تم نے ہفتے کے اندر اندر خط کا جواب دینے، ون لائن سٹوری بھجوانے اور افسانہ بھی بھجوانے کا کہا تھا لیکن مجھے کچھ تھوڑی دیر ہو گئی۔ اب سمجھو نئے سرے سے خط لکھتا ہوں۔ مجھے یاد پڑتا ہے جب تمہارا ون لائن خط ملا تھا تو میرا دماغ بھنا گیا تھا۔ مگر اب پڑھتا ہوں تو اتنا نہیں بھناتا۔ شاید اِس لیے کہ اِسی عرصے میں جبر کے دور کا...... خیر لعنت بھیجو۔ شاید موسم اچھا ہو گیا ہے۔ بہرحال نئے سرے سے خط لکھنا ہوگا۔ 31 اکتوبر

السلام علیکم۔ مگر 24 مئی کے چلچلاتی گرمیوں میں لکھے ادھورے خط کو ساتھ لگانے کا کیا فائدہ۔ مستحسن ہے کہ اب کہ موسم زِمستان کی آمد آمد ہے۔ پیارے روشن خیالی نائب مدیر مجلہ دروغ بگردن راوی، کو نئے کاغذ پر خط لکھا جائے۔ مذکورہ بالا خطوطی تحریر پھاڑ کر تلف کی جاتی ہے اور ردی کاغذوں کی ٹوکری میں پھینکی جاتی ہے جس میں ردی کاغذوں کے ہم عصر کیلے کے چھلکوں پر کالے مکوڑوں نے دھوم مچائی ہوئی ہے۔ اگرچہ..........

اچھا اب قصہ یہ ہے کہ تمہارے خط کو ایک بار پھر پڑھنا تو پڑے گا۔ مئی میں آیا تھا تو اب اکتوبر ہے یعنی پانچ ماہ گزر چکے ہیں اور یہ پانچ ماہ بھی جبر کے دور میں گزر گئے ہیں۔ اور اُدھر میرا افسانوی کردار جو ہے جو اُس زمانے کا ہے جب کہ ابھی جبر کے دور کا آغاز ہی ہوا تھا۔ مذاق کی بات نہیں حقیقت ہے کہ میں نے وہ جو ہمارے درمیان طے ہوا تھا کہ میں افسانہ لکھوں گا اس موضوع پر کہ جبر کے دور میں ہمارے ادیبوں کا کردار کیا ہوتا ہے تو یار وہ واقعی ہی میں نے کچھ شروع کیا تھا اور ایک انتہائی نئے اور دلچسپ اسلوب میں بات آگے بڑھ رہی تھی۔ لیکن تمہارے وہ ون لائن والے خط نے واقعی ڈیتھ وارنٹ کا کام کیا۔ لیکن وہ کیا بنا جو تم نے کہا تھا۔ یہ ون لائن کیا بتائی تھی تم نے تمہارا خط ڈھونڈنا ہی پڑے گا یار۔ اب مل جائے سہی۔ دعا کرو کہ مل جائے۔

تمہارا خط مل گیا۔ اور نے پڑھ بھی لیا۔ لیکن اے کاش کہ نہ ملا ہوتا۔ لیکن نہیں جی بڑی اتھل پتھل کے بعد یہ مل گیا وہیں پڑا تھا پانچ ماہ سے اباجی کی کتاب رہنمائے عقاقیر یعنی دیسی جڑی بوٹیوں کا کارخانہ کے نیچے پڑا سڑ رہا تھا۔ حیرت ہے پچھلے پانچ ماہ میں تین بار تو ردی نکالی

ہوگی، ہر فالتو چیز تلف ہوگئی تھی۔ گھر میں شک ہے کہ اباجی کا پرانا نکاح نامہ بھی ان کارروائیوں کی نذر ہو گیا لیکن یہ منحوس خط تمہارا وہیں دھرا رہا۔ لیکن میں کسی کو کیا کہوں خود میرا ہی دماغ خراب ہوا تھا کہ پانچ ماہ بعد خط کا جواب دینے کی ترنگ پھر آئی اور سوچا کہ اتنے عرصے بعد لکھ رہا ہوں تو پھر پڑھ لینا چاہیے تو پڑھ لو۔

تو حقیقت اور کافی تلخ حقیقت تو یہ ہے نائب مدیر صاحب کہ تمہارے خط کا جواب تو دی اور اُس سے بھی آگے بنا تھا جو میں نے جلد بازی میں کچھ دیر پہلے پھاڑ کر پھینک دیا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ اگرچہ یہاں چڑیاں نہیں کالے مکوڑے ہیں اور کھیت کی بجائے ردی کی ٹوکری ہے۔ جی چاہتا ہے ہاتھ ڈال کر پرزے نکال لوں لیکن مکوڑے کے چک سے جی ڈرتا ہے۔ بہرحال اپنے آپ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک پرانی اسپینش کہاوت سہارا دیتی ہے کہ انتقام ایسی ڈش ہے کہ جتنی ٹھنڈی کر کے کھاؤ اُتنا ہی مزہ دیتی ہے۔ اس لیے میرے ٹھنڈے ہونے پر بھی زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔

تو میں تمہارے خط کی اشتعال انگیز عبارتوں کو ایک خود پسند دیوانے کی واہی تباہی سمجھ کر حذف کرتا ہوں اور فوراً کہیں سے بھی شروع کرتا ہوں اُسی ون لائن سے ہی شروع کرتا ہوں۔ تو میں نے چونکہ تمہیں اپنے متوقع افسانے کی ون لائن نہیں بھیجی تھی اس لیے تمہارے ایڈیٹر نے مزید انتظار کی بجائے دروغ بگردنِ راوی کی اشاعت کا حکم دے دیا ہوگا۔ بہرحال پرچہ بھجواؤ۔ دیکھیں کیا تیر چلائے ہیں تم نے اور تمہارے اُس مچھندر ایڈیٹر نے۔

لیکن یار نہ نہ کرتے ہوئے بھی میرا ذہن بار بار اُس تمہاری یک سطری کہانی کی طرف جاتا ہے۔ اور ایک سطح پر یہ ایک دوسری اور وہ بھی کافی جدید ادبی تکنیک کے بالکل الٹ ہے جسے آج کل میں استعمال کر رہا ہوں۔ اب تم سے کیا چھپانا۔ میں برین سٹارمنگ کی بات کر رہا ہوں۔ اب اس کا کیا ترجمہ کریں گے۔ کہیں اسے آندھی طوفان میں پھنسے کسی بندے کی چیخ و پکار نہ سمجھ لینا تم سے کچھ بعید نہیں کہ جس طرح تمہارا نیم خواندہ ایڈیٹر تمہارے ذہن پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ تو بات ذہن کی ہی ہے یعنی ذہن میں طوفان بپا کرنا یا شاید طوفان کھڑا کرنا۔ اب سنو ایک پتے کی بات۔ خدا کی قسم تمہیں راز کی بات بتانے والا ہوں۔ جبر کے دور میں یہ

دونوں تکنیکیں بڑے دھانسو طریقے سے چل سکتی ہیں۔ جب یک سطری میں روکاوٹ آئے ذہنی طوفان کھڑا کرو بعد جب ایسا طوفان خطرناک ہو جائے اپنے لیے یا دوسروں کے لیے تو پھر یک سطری پر اتر آؤ۔ کچھ سمجھے ہو کہ نہیں۔ اس سے بڑھ کر میں خط میں واضح نہیں کرنا چاہتا۔ سُنا ہے کہ اب پھٹیچر قسم کے ادبی پرچوں کی ڈاک بھی سنسر ہونے لگی ہے ایسا نہ ہو کہ دروغ بگردن راوی کی بجائے تمہاری یا تمہارے ایڈیٹر کی گردن ناپی جائے گو کہ وہ ہے اسی قابل۔

روشن دین اب یہ بات چل ہی نکلی ہے تو میرا خیال ہے کہ پہلے ہم یہ تو طے کریں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ویسے تو تم نے یہ عنوان یا فقرہ ہزار ہا دفعہ سنا ہوگا یعنی پڑھا ہوگا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، پر دوسرے تیسرے مہینے یا چوتھے پانچویں مہینے اس طرح کا مضمون یا کالم کہیں نہ کہیں آجاتا ہے کسی بڑے دانشور یا تجزیہ نگار کے قلم سے جو اپنے سینے میں درد رکھتا ہے۔ جو مضمون پڑھنے پر لگتا ہے کہ انجائینا کے درد سے مشابہت رکھتا ہے۔ اللہ معاف کرے۔ تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات ایسے ہی چھینکنے والی نہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں کہ 'ہم دونوں کہاں کھڑے ہیں'۔ باقی وہ جو دوسرا 'ہم کہاں کھڑے ہیں' ہے تو اُس پر لعنت بھیجو اُس پر بہت بڑے بڑے کہنے والے موجود ہیں۔ ویسے میں تمہیں دل کی بات بتادوں۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ اصل میں ہمارے اوپر لاگو ہی نہیں ہوتا یہ کھڑے۔ بیٹھے۔ لیٹے کی تقسیم۔ ہم کھڑے بیٹھے، یا لیٹے ہوئے تو۔ سو سکتے ہیں۔ خیر لعنت بھیجو۔ ویسے بھی اِس سوال پر کچھ کہنا خواہ مخواہ آبیل مجھے مار والی بات ہے۔ جیسا میں نے کہا خطوط سنسر ہو رہے ہیں۔

تو صورت حال یہ ہے کہ ایک تو ہم دونوں بمعہ دوسروں کے جبر کے دور سے گزر رہے ہیں۔ اب ج نامی آمر کے عہد میں گزر بسر کر رہے ہیں۔ اور اِس گزر بسر کا سب سے اہم علمی۔ ادبی و ثقافتی پہلو گھسر پھسر ہے۔ گویا جبر کے دور میں ادیب ایک گھسر پھسر ہوتا ہے۔ اب آجاؤ دوسری بات پر کہ ہمارے افسانوی کردار کیا ہوں کیسے ہوں کہ جن کے ذریعے ہم وہی اپنے اُس پیارے سوال کا جواب ڈھونڈیں کہ جبر کے دور میں ہمارے ادیبوں کا کردار کیا ہوتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جیسے ہم ہیں ویسے ہی ہمارے کردار ہوں گے بلکہ ہونے چاہئیں کہ سماجی حقیقت نگاری کا تقاضا یہی ہے۔ لیکن یہاں ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اور تم ذرا سنبھل کر بیٹھو مجھے شک پڑتا ہے میرے منہ سے کوئی بڑی بات نکلنے لگی ہے۔ گھسر پھسر جو منہ سے ہوتی ہے دوسروں کو سنائی نہیں دیتی اس لیے کہ کانوں کے قریب کی جاتی ہے۔ اور غیر کانوں کے شر سے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن لکھی ہوئی گھسر پھسر تو ظاہر ہے سنائی نہیں بلکہ دکھائی اور پڑھائی کے لیے ہوتی ہے۔ تو وہ کیسی ہو کہ دکھائی دے بھی اور نہ بھی دے۔ تو اسی مسئلے کے حل کے لیے میں کوشش کر رہا تھا یعنی جب تمہارا وہ اشتعال انگیز خط آیا اُس سے پہلے۔ میں ہرگز نہیں کہتا کہ اس سنگین مسئلے کے حل کے لیے ادیب لوگوں نے پہلے کوششیں نہیں کی ہوں گی۔ جبر کے دور اور لوگوں پر بھی گزرے ہیں یہ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو کیوں کہ تم نے بی۔اے میں تاریخ اختیاری پڑھی تھی۔ باقی یہ کہ ادیب بھی ہر معاشرے اور زمانے میں پائے جاتے ہیں۔ یہ جاننے کے لیے بی۔اے میں کسی زبان کا ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں تو اس مسئلے کے حل کے لیے ادیب لوگوں نے ایک حل تو یہ نکالا کہ نام ہی نہ دو۔ یعنی جعلی نام سے آمر کے خلاف لکھ کر غائب ہو جاؤ۔ لیکن اس میں خرابی یہ ہے کہ بیباکی کا تمغہ نہیں ملتا اس لیے یہ حل ادبا میں کوئی زیادہ پاپولر نہ ہو سکا۔

دوسرا راستہ جیسا کہ تم جانتے ہو علامتیت کا ہے۔ علامت ادیب اس لیے استعمال کرتا ہے کہ بعد میں مُکر سکے۔ یعنی فرض کرو ایک ادیب زنجیر برابر ہے جبر و استبداد۔ ظلم و ستم اپنے افسانے یا شعر میں استعمال کرتے ہوئے کسی جبر کے دور میں پکڑا جاتا ہے تو وہ صاف مُکر سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ بھئی زنجیر سے میری مراد صرف وہ عام سا آلہ ہے جسے درحقیقت بیضوی سوراخوں کو دھاتی چھلوں میں قابو کرنے کے لیے ایجاد کیا گیا تھا بعد میں بعض تساہل پسند لوگ اسے بھیڑ بکریاں باندھنے کے لیے بھی استعمال کرنے لگے حالانکہ اس مقصد کے لیے رسہ انسان نے کب کا ایجاد کیا ہوا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس طرح کی علامتوں کی مصیبت یہ ہے کہ اِن کے نام نہاد علامتی معانی ہی اِس قدر غلط العام ہو چکے ہیں کہ اصل معانی کی طرف توجہ دینے پر کوئی تیار ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس صورتحال سے بچ نکلنے کا طریقہ کار علامتیت پسندوں نے یہ نکالا کہ ایسی علامتیں استعمال کرو کہ جن کے اصل مدعا کا کسی کو۔۔۔ بلکہ بعض حالات میں تو خود ادیب کو بھی۔۔ علم ہی نہ ہو سکے۔ اس طریقہ کار کی دو قباحتیں جلد ہی سامنے آ گئیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں کا تعلق ابلاغ سے تھا مگر دونوں ایک دوسرے کی ضد تھیں یعنی بے پناہ ابلاغ اور ابلاغ سرے سے مفقود۔ ہوا یہ کہ علامتوں کے خفیہ معانی کی طرف کسی اشارے بازی کی عدم موجودگی میں یار لوگوں نے

علامتوں سے حسبِ توفیق اور حسبِ منشا طرح طرح کے مطلب اخذ کرنے شروع کر دیے جن میں سے چند مطلب بلکہ کافی مطلب ایسے ضرور تھے کہ جن کا سرِعام اظہار جبر کے دور کے اپنے مخصوص تقاضوں اور ترجیحات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا چنانچہ ادارے حرکت میں آنے لگے مگر اُن کے پوری طرح حرکت میں آنے سے پہلے ہی ایسے ناکام علامت فروش ادیب روپوش ہوگئے، چند ایک بدنصیب پکڑے بھی گئے مگر انہیں دوسرے دن ہی چھوڑ دیا گیا۔ کیونکہ اپنے تعزیری و تادیبی وسائل کا بے محابہ فضول استعمال بھی جبر کے دور کی ترجیحات میں شامل نہیں تھا۔ تو یہ پہلی قباحت تھی دوسری یہ ہوئی کہ قارئین کے ایک الگ گروہ نے واویلہ مچایا کہ ایسی تحریریں قطعاً لایعنی۔ اور بے مقصد بکواس ہیں اور جبر کے دور میں جبکہ ادیب کو ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق بلند کرنا چاہیے یہ نام نہاد ادیب ذہن پر بوجھ ڈالنے والے فقرے اور طبیعت مُنغص کرنے والے پیرے اپنی تحریروں میں ڈال کر ہماری پریشانیوں میں اور بھی اضافہ کرتے ہیں۔ ہم اور تو کچھ کرنہیں سکتے لیکن کم از کم اِن کی چونچیں تو بند کر سکتے ہیں۔ خیر یہ لمبی بات ہے اور آئندہ ملاقات پر اِس پر بات ہوگی اور ملاقات یار اب بہت ضروری ہے اور جلد۔

میں اصل بات کی طرف پھر آتا ہوں۔ تو یہ تو طے تھا کہ جبر کے دور میں ہمارے ادیب کے کردار پر افسانہ ضرور لکھنا ہے اور جبر کے دور میں ہی لکھنا ہے۔ (یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ ایک کافی ثقہ رائے یہ بھی ہے کہ جبر کے دور میں ادیب کے کردار یا کسی کے کردار پر بھی افسانہ۔ نظم۔ مضمون وغیرہ یا تو جبر کے دور سے پہلے لکھنا چاہیے یا بعد میں)۔ تو میں وہ تمام طریقے اور چوری چُھپے بات کہہ کر صاف بچ نکلنے کی ناکام اور پٹی ہوئی کوششیں پھر سے استعمال میں لانے کی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے کیا کیا؟ میں نے ایک کردار بنایا جس کا نام نازش نبردازی ہے۔ اور جو افسانہ نگار ہے اور جبر کے دور میں رہتا ہے۔ اُس کے کردار کی وضاحت کے لیے میں وہی برین سٹارمنگ کی تکنیک استعمال کر رہا تھا اور ایک عجیب وغریب تحریری عمل سامنے آ رہا تھا جسے میں افسانہ بھی کہنے پر اصرار نہیں کروں گا بلکہ ایک عجیب 'بے افسانہ' قسم کی چیز تھی۔ پھر تمہارا اشتعال انگیز خط آ گیا لیکن جس سے مجھے 'ون لائن' کی تکنیک کا تحفہ ملا۔ تو اب میں نے کرنا یہ ہے کہ 'بے افسانہ' کو وہیں سے پکڑوں گا جہاں سے یہ سلسلہ منقطع

ہوا تھا اور اب جو اسلوب بنے گا وہ برین سٹارمنگ۔ لاؤڈ تھنکنگ اور ون لائن کے اسالیب سے مرکب ہوگا۔ میری کامیابی کے لئے دُعا کرنا۔ اور بتاؤ کب مل رہے ہیں۔

تمہارا اپنا۔ راقم

ڈیر راقم

چھ ماہ پہلے کے خط کا جواب اب ملنے پر میرا جواب تو کچھ اور ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اب تم آ ہی رہے ہو تو براہ راست تمہاری طبیعت صاف کرنا زیادہ مناسب رہے گا۔ یہ جمعرات چھوڑ کر اگلی جمعرات دوپہر کے کھانے کے بعد آ جاؤ۔ اور ہاں جبر کے دور میں کچھ نہ کچھ کہہ ڈالنے کی جدید ترین ٹیکنیکس پر مبنی جو شاہکار تم لکھ رہے ہو۔ وہ جتنا بھی لکھا گیا ہو۔ ساتھ ضرور لے آنا۔ اُسے دیکھ کر ہی کامیابی کے لیے دعا کے بارے میں کچھ کہہ سکوں گا۔ اور سناؤ پھر کیا حال چال ہے۔ شادی کب کرا رہے ہو۔ میرا تجربہ ہے کہ شادی کے بعد لوگ جبر کے دور کے بارے میں زیادہ پریشان ہونا چھوڑ دیتے ہیں۔

فقط تمہارا دوست۔ روشن خیالی۔

گذشتہ سے پیوستہ۔ روایت آباء واجداد نازش نبردازی۔

تین چار صدیوں بلکہ چار پانچ صدیوں تک ٹھیک ٹھاک رہنے کی محیّر العقول اور انتہائی قابلِ رشک روایت قائم رکھنے پر ن ن کے آباؤ اجداد بالآخر یعنی تقریباً ساڑھے چار سو سال بعد بعض دوسرے بہت کم ٹھیک ٹھاک رہنے والے طبقوں مثلاً مورخین۔ محققین۔ اساتذہ۔ تذکرہ نویسوں وغیرہ کے حاسدانہ تنقیدی اور تخریبی ردعمل کا نشانہ بننے لگے۔ یہ سوال جگہ جگہ یعنی تقریباً چار پانچ جگہ اٹھایا جانے لگا کہ آخر اِن لوگوں کے ہمیشہ ٹھیک ٹھاک رہنے کا راز کیا ہے۔ راز کو افشا کرنے کا فریضہ محققین کو سونپا گیا کہ پہلے وہ تحقیق (تح۔ قیق) (ع) مونث۔ (1) درست۔ ٹھیک۔ صحیح (2) تصدیق (3) ثبوت تسلیم کردہ (4) یقین۔ اعتبار (6) تلاش۔ چھان بین (7) کھوج۔ پتہ (8) دریافت۔ پوچھ گچھ (9) شناخت۔ جانچ (10) معتبر۔ پکی بات (11) تجربہ۔ امتحان۔ (فیروز اللغات)۔ کریں اور اصل بات سامنے لائیں بعد میں پھر ہم جانیں اور ہمارا کام (کام (ف) مذکر۔ (1) تالو۔ حلق۔ دہان۔ مُنہ (2) مُراد۔ مطلب۔ مقصد

(3) خواہش۔ آرزو (4) کاروبار۔ کاج۔ کار (5) (ا) کرتوت۔ کردار۔ فعل (6) (س) شہوت۔ کام
دیو (7) (ا) ہنر۔ پیشہ۔ دستکاری (8) (ا) شغل۔ مصروفیت (9) (ا) بنج۔ بیوپار (10) (ا) مطلب۔
واسطہ۔ غرض (11) (ا) جماع۔ مجامعت (12) روزگار۔ نوکری۔ خدمت (13) (ا) زردوزی۔
کارچوبی۔ نقاشی (14) فرض۔ ڈیوٹی (15) (ا) ٹہل۔ خدمت۔ سیوا (16) (ا) چالاکی۔ ہوشیاری۔
عیاشی۔ (فیروزاللغات) جانے۔

محققین نے اس مقصد کے لیے تجویز کیا کہ کڑیال کلاں کی عمرانی تاریخ کا ازسرِ نو جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ فی الفور جائزہ شروع کیا گیا جو کئی برس جاری رہا اور جس روز ختم ہوا اُس روز یہ بات سامنے آئی کہ نازش نمبردازی کے آباء واجداد جن گوناگوں خوبیوں (کل تعداد بیالیس) کے مالک تھے اُن میں مہمان نوازی کی خوبی سرِفہرست تھی اور ہے۔ اور یہی خوبی درحقیقت اُن کے ہمیشہ ٹھیک ٹھاک رہنے کا راز ہے۔

محققین کے اِس تحقیقی نتیجے پر ن ن نسل سے ناخوش طبقات اور بھی ناخوش ہوئے۔ تحقیقی نتیجے کو غیر واضح۔ مبہم اور پُر اسرار قرار دیا گیا اور پھر محققین سے سخت وضاحت طلب کی گئی کہ وہ ایک طرف مہمان نوازی اور دوسری طرف ہمیشہ ٹھیک ٹھاک رہنے کی کیفیت کے درمیان علت ومعلول کے رشتے کو واضح طور پر Establish کر کے دکھائیں بصورت دیگر مواخذے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ناخوش طبقات میں سے بعض نے تحقیقی نتیجے کو محققین کی شاعرانہ فینٹسی بھی قرار دیا۔ شومیٔ قسمت سے محققین میں سے کم از کم پانچ ایسے ضرور تھے جو تحقیق سے فارغ ہونے کے بعد ــــــ اور ایک تو پوری طرح فارغ ہونے سے پہلے ہی۔ شاعری کا ارتکاب کرتے تھے۔ یہ ایک کھلا راز تھا اس لیے شاعرانہ فینٹسی والے الزام کو کچھ نہ کچھ پذیرائی ضرور ملی۔ محققین پر اِس صورتحال کا مجموعی اثر ایک فکری افراتفری کی صورت میں ظاہر ہوا جو جلد ہی ایک علمی سر پھٹول کی شکل اختیار کر گیا۔ بین التحقیقی الزامات اور جلد از جلد کسی نتیجے تک پہنچنے کی شدید خواہش میں متعلقہ شہادتوں۔ تاریخی حوالہ جات وغیرہ کا مکمل ریکارڈ رکھنے پر سرے سے توجہ ہی نہیں دی گئی تھی۔ یاد رہے اور یہ یاد رکھنا انتہائی ضروری ہے کہ یہ عمرانی علوم میں تحقیقی طریقہ کار کی پیدائش کا زمانہ تھا۔

لیکن ناخوش طبقات محض علمی بہانے بازی کی بنیادوں پر محققین کی گلوخلاصی کرنے پر

پر تیار نہیں تھے چنانچہ وضاحت دوبارہ اور اب کی بار انتہائی سختی سے طلب کی گئی جس پر محققین کو اپنی اپنی پڑ گئی اور ہر کوئی اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق وضاحت کرنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ دراصل اسی واقعہ کے بعد سوشل سائنسز نے اپنی اپنی الگ پہچان کرائی۔ بہرحال اُس موقعے پر سامنے آنے والے وضاحتی جواب مضمونوں میں سے ایک کافی متنازعہ علمی حیثیت اختیار کر گیا۔ ذیل میں اُس مقالے کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

ن ن نسل کا تصورِ مہمان۔

مقالہ نگار پہلے تو یہ اجازت مانگتا ہے کہ چونکہ اُسے مقالے میں بار بار ن ن نسل کے جیسے بے ہنگم الفاظ استعمال کرنے پڑیں گے اس لیے وہ اپنی اور قاری کی آسانی کے لیے آئندہ اُن کی جگہ صرف نونی کا لفظ استعمال کرے گا اور وہ آئندہ ایسا ہی کرتا ہے۔ اگرچہ اس امر کی وضاحت نہیں کرتا کہ اُسے ایسی اجازت کب کہاں اور کس سے ملتی ہے۔

مقالہ نگار اپنے دلائل پیش کرنے سے پہلے بزعم خود ایک بڑی خفیہ مگر حقیقتاً ایک عام سی کارروائی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور اس کے لیے وہ ایک نئی اصطلاح لکجمنل (یعنی ل۔ک۔ج۔م۔ن۔ل) (لفظوں کی جڑوں میں نقب لگانا) وضع کرتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ اس کارروائی (پریکٹس) کے ذریعے کسی بھی صورتحال کی تشریح اپنے مطلب کے مطابق کی جا سکتی ہے۔ طریقۂ واردات (ہمارے الفاظ۔ مقالہ نگار نے صرف طریقہ کا لفظ استعمال کیا ہے) یہ ہے کہ پہلے مرحلے پر تشریح طلب صورت حال کے بیان میں سے مرکزی حیثیت کا لفظ یا الفاظ چھانٹ کر الگ کر لو۔ پھر اُس لفظ کے معانی کی جڑوں میں اُتر کر کسی ایسی جڑ کو تلاش کرو جس کے نیچے تمہارے پسندیدہ اور مفید بر مطلب معانی کا بیج رکھا ہو۔ ایسا بیج ضرور ملے گا کیونکہ تاحال دنیا کی کسی زبان میں ایسا کوئی لفظ دریافت نہیں ہوا جس کے کم از کم دو معانی نہ ہوں۔ بہرحال تیسرے مرحلے میں تم اُس معانی کے بیج کو باہر نکال کر اور ہر طرف ڈنکا بجا کر ہر عام و خاص کو دکھا کر پھر سے بو دو۔ اب کی بار اس سے جو پھول بوٹے نکلیں گے وہ سب تمہارے لیے مشکل کشا ہوں گے اور تمہارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔

مقالہ نگار بقول اُس کے اس مجرد حقیقت کو بیان کرنے کے بعد ضرورت محسوس کرتا

ہے کہ اُس کا اطلاق نونی صورتحال پر کرے۔ چنانچہ وہ سرخی جماتا ہے۔ 'نونیوں کو لکیجمنل کی
ضرورت کیوں پڑتی ہے؟'۔ یہاں پر مقالہ نگار تاریخ میں پیچھے چلا جاتا ہے۔ اور اُس وقت میں جا
ٹھہرتا ہے جب نونی پہلی مرتبہ کڑیال کلاں میں وارد ہوئے تھے۔ مقالے کا یہ حصہ انتہائی طویل
ہے۔ جسے مقالہ نگار بار بار اپنی طوالت پسندی پر معافیاں مانگ کر مزید طویل کرتا ہے۔ اس لیے
اس طویل داستان کے خلاصے کا بھی خلاصہ پیش کرنا مناسب رہے گا۔ اور امید ہے یہ بھی اتنا ہی
موثر ہوگا جتنے کہ اکثر اخلاقی سبق آموز کہانیوں کے نتیجے ہوتے ہیں۔ مثلاً سانچ کو آنچ نہیں۔
غرور کا سر نیچا۔ دشمن کو حقیر نہ جانو۔ فطرت کبھی بدلتی نہیں۔ پہلے آؤ پہلے پاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہوا یہ کہ کڑیال کلاں کے اصلی باشندے سیاہی مائل سفید تھے جبکہ نونی سرخ و سفید
ہونے کے باوجود تعداد میں اُن سے بہت کم تھے چنانچہ پہلا مسئلہ تو انہیں اپنی آبادی میں اضافہ
کرنے کا درپیش تھا۔ کہ کہیں محض تعداد میں کمی کی وجہ سے کڑیالی باشندوں سے مار نہ کھا جائیں۔
چنانچہ دانا اکٹھے ہوئے اور دیر تک فکر کرتے رہے آخر سب اسی بات پر متفق ہوئے کہ ابتدائی طور
پر آبادی میں اضافے کا مروجہ اور آزمودہ طریقہ کار ہی اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن آئندہ
اسے ایک قومی فریضہ سمجھ کر اس پر بھرپور عمل کیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ داناؤں کی طرف سے
گرین سگنل ملنے پر نونی لوگ بدل و جان اُن کے حکم پر عمل پیرا ہوئے اور پھر برس ہا برس تک
اُس مروجہ طریقے کے جملہ ذرائع اور وسائل کا بے دریغ استعمال کرتے رہے۔ لیکن پھر دیکھنے
میں آیا کہ کڑیالیوں کے مقابلے میں اُن کی آبادی میں اضافے کا خواب کسی طرح شرمندہ تعبیر
نہیں ہو رہا۔ شماریاتی زائچوں کے مطابق ایک نونی کے پیدا ہونے کے مقابلے میں تین کڑیالی
پیدا ہو جاتے تھے۔ اسی طرح اطباء نے بھی موقع دیکھ کر ڈرتے ڈرتے صورتحال کے طبی پہلوؤں
کی طرف توجہ دلائی اور وجع المفاصل اور ضعف اعضائے رئیسہ کے کیسز میں خطرناک اضافے کو
بھی 'قومی فریضے' کا لازمی نتیجہ قرار دیا۔ مقالہ نگار یہاں اس بحث و تمحیص کے نازک نکات بھی پیش
کرتا ہے جنہیں بوجوہ یہاں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ الغرض آبادی میں اضافے کی اجتماعی ناکامی کی
ذمے داری Fix کرنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا اور بالآخر روایتی طریقے کی ناکامی کا ذمے دار
داناؤں کو ہی قرار دے دیا گیا اور انہیں دانائی کے کام سے سبکدوش کر کے اُن کی ذمہ داری
لطیفہ گوئی۔ اور تعلیم و تدریس کے شعبوں میں کر دی گئی جہاں وہ اپنے فرائض بطریق

سر انجام دیتے رہے۔

گندم گوں کڑیالی باشندوں پر غالب آنے کا مسئلہ چونکہ جوں کا توں تھا اس لیے اب
کی بار داناؤں کی بجائے سیانوں سے مشاورت کی گئی اور رہنمائی طلب کی گئی۔ اور جلد ہی سب کو
خوش گوار حیرت ہوئی کہ سیانوں کی جماعت کے پاس مذکور مسئلے کا حل پہلے سے موجود تھا۔ یہاں
پر مقالہ نگار تحقیقی تشریح کرتا ہے۔ تفصیل میں جانے پر معافی مانگتا ہے اور بتاتا ہے کہ ایسا اصل
میں اس لیے ہوا کہ سیانے ہر حال میں چپکے چپکے کام کرتے رہتے ہیں اور وقت آنے پر۔ طلب
کیے جانے پر اور مناسب معاوضہ طے ہونے پر حل پیش کر دیتے ہیں۔ یہاں اُس نے دوسری
اقوام اور زمانوں کے سیانوں کے اسی طرزِ عمل کی مثالیں دی ہیں۔ چنانچہ کڑیال کلاں میں بھی ایسا
ہی ہوا۔ سیانوں نے بتایا کہ نونی لوگ فطری طریقے سے کڑیالیوں سے آبادی میں بڑھ نہیں
سکتے۔ اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ اپنی جیسی بنی بنائی آبادی کو اپنی صفوں میں شامل کر لیا جائے۔
یہاں پر کچھ احمقوں نے اعتراض کیا کہ اتنی صفیں کہاں سے لائی جائیں گی۔ اس پر سیانوں کے
لسانی ماہرین نے انہیں صف کا اصل مطلب سمجھا کر خاموش کرا دیا۔ مقالہ نگار اس بظاہر فضول
تفصیل کا ذکر اس لیے ضروری سمجھتا ہے کہ یہی لسانی ماہرین آگے چل کر لکیجمنل کے حوالے
سے بہت اہم کردار ادا کرنے والے تھے۔

اپنی جیسی بنی بنائی نونی آبادی کو اپنے اندر شامل کر لینے کی سیانوں کی ترکیب محض
زبانی جمع خرچ نہیں تھی بلکہ انہوں نے اس پر کامیابی سے عمل کرنے کا مکمل پلان بھی دیا۔ اُن کا
کہنا تھا کہ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ شمال کی طرف سے آنے والے دیگر نونی کنبوں کے لیے
دریاؤں کو پار کرنا سہل بنایا جائے کیونکہ شمال سے جنوب کے سفر میں سب سے بڑی مصیبتیں یہی
کھڑی ہیں۔ بلکہ لیٹی ہیں۔ اپنے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے 'دریا پار کرنا میڈ ایزی'، دریا پار
کرنے کے بیس آسان طریقے (بعض نے کہا پچیس ہی بہرحال)۔ 'آؤ دریا پار کرو'۔ جیسی
دستاویزات قلمی تیار کی جائیں (چھاپہ خانہ ابھی ایجاد نہیں ہوا تھا) اور انہیں دریاؤں کے کناروں
کے ساتھ مخصوص مقامات پر دریائی ماہرین کی نگرانی میں مہیا کیا جائے۔ دوسرے مرحلے پر ان
معلومات کو دعوت ناموں کے ساتھ انتہائی شمال تک پہلے 'اپنوں' تک پہنچایا جائے۔ اور پھر اس
طرح کڑیال کلاں پہنچنے والے نونی لوگوں کا فقید المثال استقبال کیا جائے۔ اور پھر اُن کی مہمان

نوازی اتنی شدت سے جائے کہ اور کہیں جانے کا خیال ہی اُن کے دل سے نکل جائے۔

یہ ترکیب حیران کُن حد تک کامیاب رہی اور ہر دوسرے تیسرے مہینے کوئی نہ کوئی ٹونی جتھہ پانی میں بھیگا ہوا کڑیال کلاں میں پڑاؤ ڈالنے لگا۔ اور پہلے سے موجود ٹونی آبادی کی حیرت انگیز مہمان نوازی کے نتیجے میں اُنکے پڑاؤ مستقل رہائش کی حیثیت اختیار کرنے گے۔ دیکھتے ہی دیکھتے۔ یعنی چند برسوں میں ہی ٹونی آبادی کڑیالی آبادی سے کہیں آگے نکل گئی۔

اب ہوا یہ کہ پہلی دفعہ کڑیالیوں کو وہی مسئلہ درپیش ہوا جو کبھی ٹونیوں کو ہوا تھا اور کڑیال کلاں میں پہلی دفعہ ہی فسادِ خلق کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اور پھر فساد ہو بھی گئے۔ مقالہ نگار یہاں پر فسادات کی بڑی لمبی چوڑی تفصیل بیان کرتا ہے لیکن ہم نہیں کریں گے کیونکہ فسادات تو بس فسادات ہی ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں مقالہ نگار ایک کڑیالی ہیرو کالُو کینٹھیا کا بہت ذکر کرتا ہے جس کا تاریخ میں بہرحال کہیں سراغ نہیں ملتا۔ یاد رہے کہ یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ بہر طور فسادی صورتحال امن پسند ٹونی لوگوں کے لیے جواب غالب تھے کسی طرح قابل قبول نہیں تھی۔ اس لیے اس نئی مشکل کا حل دریافت کرنے کے لیے ایک بار پھر سیانوں سے رجوع کیا گیا۔ اور دیکھو۔ کہ حل بھی ایک مرتبہ پھر اُن کے پاس پہلے سے موجود تھا۔ انہوں نے صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ فسادی کڑیالیوں کو سب سے زیادہ اعتراض ٹونیوں کی مہمان نوازی کی عادت پر ہے اُن کا الزام یہ ہے کہ مہمان نوازی کی آڑ میں وہ اپنوں کو دوسروں کی زمینوں پر بساتے چلے جا رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے اسی الزام میں اُن کے الزام کی مکمل تردید موجود ہے کہا جاتا ہے کہ کالُو کینٹھیے نے پوچھا 'وہ کیسے' تو اُسے آواز آئی 'لفظوں کی جڑوں میں نقب لگاؤ۔ یعنی لکجمنل۔

مقالہ نگار یہاں خود تفصیل میں جانے سے اعتراض کرتا ہے اور فوراً بتاتا ہے کہ کڑیالی ہزار کوشش کے باوجود اس ٹونی مشورے کی اصلیت سمجھنے سے قاصر رہے۔ حالانکہ وہ لفظوں کو بھی جانتے تھے کہ آخر حیوان ناطق تھے۔ پودوں کی جڑیں بھی کھود کر کھاتے رہتے تھے۔ اُن میں سے کچھ نامور نقب زن بھی تھے۔ لیکن سب کچھ مل ملا کر پھر بھی نتیجہ صفر ہی رہتا تھا۔ اس لسانی شکست پر کڑیالیوں کا مورال کافی ڈاؤن ہو گیا اور ایک کمزور لمحے میں اُن میں سے کسی نے کسی

سے پوچھ ہی لیا کہ کُھل کر بتاؤ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ ٹونی تو پہلے ہی منتظر بیٹھے تھے۔ چنانچہ ایک عظیم اجتماع میں ٹونیوں نے کڑیالیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”حضرو۔۔۔

اس لفظ کے سُننے ہی قریب تھا کہ فسادات پھر بھڑک اٹھتے لیکن مقرر نے فوری طور پر اپنی درستی کی اور کہا معزز کڑیالی باشندو۔ آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے لوگوں کو مہمان بنا بنا کر کڑیال کلاں میں آباد کرتے جا رہے ہیں۔ لیکن آپ کا یہ الزام ایک عظیم غلط فہمی پر مبنی ہے جو لفظ مہمان کے اصل معانی سے آپ کی مکمل لاعلمی کا واضح ثبوت ہے۔ اسی لیے ہم نے آپ کو اس لفظ کی جڑوں میں نقب لگانے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن سُننے میں آیا ہے کہ آپ نقب زنوں اور شکرقندی شکرقندی تھمانرے کاشت کرنے والوں سے صلاح مشورہ کرتے رہے کوئی کڑیالی محض لفظوں کے شجرہ نسب کی طرف نہیں گیا۔ اسی سے آپ لوگوں کے ذہنی دیوالیہ پن کا پتہ چلتا ہے۔ کہا جاتا ہے اس موقع پر اسٹیج پر پیچھے بیٹھے ایک ٹونی سیانے نے مقرر کو ٹھوکا کرایا اور اُسے ایسے فقرے نہ استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ مقرر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ قابل عزت کڑیالی خواتین و حضرات اور عظیم سردارو آپ کو پتہ ہونا چاہیے کہ لفظ 'مہمان' سے مراد کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ 'مہمان' لکجمنل کے مطابق دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ یعنی 'مہ' جس کے معنی ہیں بڑا اور 'مان' جس کا مطلب ہے مانند۔ یعنی ہر وہ شخص مہمان ہے جو کسی نہ کسی لحاظ سے کسی بڑے کی مانند ہو۔ یعنی کسی نہ کسی طرح بڑا ہوا۔ گویا مہمان کے لیے بڑائی شرط ہے۔ اور جس کے پاس بڑائی ہے اُسے مہمان بنانا فرض ہے۔ یعنی ایسا کوئی بڑا اگر آ جائے تو اُس کی آؤ بھگت لازمی ہے۔ ایسا کوئی بڑا ٹونی بھی ہو سکتا ہے اور۔۔۔ (یہاں پر مقرر خاموش ہو گیا اور پھر جب اُس کی خاموشی کی وجہ سے انتظار کا سسپنس لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تو وہ پھر بولا) اور ایسا کوئی بڑا۔ اب سُن لو میں ایک بہت بڑا انکشاف کرنے والا ہوں ایسا کوئی بڑا۔ یعنی مہمان کڑیالی بھی ہو سکتا ہے۔

مقالہ نگار بتاتا ہے کہ اس فقرے کو سُننے پر ہجوم میں سے عجیب زن زناہٹ کی آوازیں آنے لگیں جیسے ہزاروں افراد سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ لیکن مقرر نے اپنی بات جاری رکھی۔ تو سُن لو کہ جو کوئی بھی بڑا ہے طاقتور ہے اُس کی اُتنی ہی بڑی مہمان نوازی ہو گی۔ کیا تم اپنے بڑوں کی آؤ بھگت نہیں کرو گے۔ بولو۔ جواب دو۔ کہا جاتا ہے اس سوال پر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ پھر اچانک ایک طرف سے ایک نعرے کی آواز بلند ہوئی، مہمان نوازی، زندہ باد۔ مقالہ

نگار کے خیال کے مطابق اِس پہلا نعرہ لگانے والے کی شناخت کا تعین کبھی نہیں ہو سکا۔ کیا وہ ٹونی تھا یا کڑیالی یا کوئی تیسرا تھا کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن محققین کے لیے یہ ایک زرخیز تحقیقی میدان ضرور ہے بلکہ اس میں نئے علوم کی دریافت کے امکانات موجود ہیں مثلاً نجومیات۔ نعرہ جاتیات۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ بحرحال مختصر یہ کہ اس نعرے کے بعد جیسے کہ عموماً ہوتا ہے کہ جگہ جگہ سے نعرے بلند ہونے لگے اور اِس کے ساتھ ہی 'سمجھ آ گئی ہے' کی ایک لہر جیسی کڑیالیوں میں پھیلتی چلی گئی۔ کیونکہ کڑیالی ہونے کے باوجود وہ چھوٹے بڑے کے فرق کو تو مانتے تھے۔ صرف اتنا نہیں جانتے تھے کہ ہر بڑا مہمان ہوتا ہے اور اُس کی آؤ بھگت کرنا ہر کسی پر لازم ہے۔ اس علم کے حصول کے بعد نعرے بازی کا سلسلہ طول پکڑ گیا۔ مہمان نوازی زندہ باد۔ مہمان زندہ باد۔ آوے ای آوے مہمان آوے ای آوے۔

مقالہ نگار بتاتا ہے کہ کڑیال کلاں میں ٹونی نسل کے تصور مہمان پر اتفاق رائے کے بعد عظیم صلح کا جشن منایا گیا بعد میں سیانوں نے خاموشی سے بڑائی کے دستور کی شقیں وضع کرنے کا کام شروع کر دیا اور ہمیشہ جاری رکھا۔ یہاں پر اختصار کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف شق اول پیش کی جاتی (اور بعض کے مطابق شق آخر بھی) جس کا تعلق بڑے (یعنی مہمان) کی تعریف سے ہے" بڑا (یعنی مہمان) وہ ہے جو ثابت کر سکے کہ تم چھوٹے ہو اور جس کے پاس اپنی بڑائی یعنی تمہاری چھوٹائی ثابت کرنے کے سب عقلی ذرائع بھی موجود ہوں۔ مزید براں اگر کبھی وہ ثابت کرنے میں ناکام رہے تو بعض دیگر خصوصی اور عملی نوعیت کے اقدامات کے ذریعے تمہیں اس حد تک چھوٹا کر دے کہ کسی کے پاس شک کی گنجائش ہی نہ رہے۔" اس شق کی ذیلی شق الف کے مطابق "پس یہ لازم ہے کہ تم خود بھی بڑے (یعنی مہمان) کو اپنی (یعنی تمہاری) چھوٹائی ثابت کرنے کے ذرائع مہیا کرتے رہو تاکہ 'خصوصی اور عملی نوعیت' کے اقدامات کی نوبت ہی نہ آئے۔"

اِس دستور کو جسے دستورِ مہمان نوازی کا نام دیا گیا نئے حالات کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ جامع اور فول پروف بنایا جاتا رہا۔ مقالہ نگار کے مطابق اس دستور پر مدتوں کامیابی سے عمل ہوتا رہا لیکن پھر بھی بعض پیدائشی ڈھیٹ قسم کے لوگ کبھی تصور مہمان پر اور کبھی دستور مہمان نوازی کی شقوں پر خواہ مخواہ اعتراض کرنے والے پیدا ہوتے رہتے تھے۔ اور بعض

اوقات تو اچھی خاصی بیزاری پیدا کرتے تھے۔ آفرین ہے کہ اُن سے نپٹنے کا حل بھی سیانوں کے پاس پہلے سے ہی موجود تھا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ایسے لوگوں کو نہ صرف یہ کہ جو وہ کہتے ہیں کہنے دو۔ بلکہ انہیں کچھ بھی کہنے کا بھرپور موقع دو۔ اور پھر اُن کے کیے کو اتنی عزت بخشو کہ وہ خود حیران رہ جائیں پھر ان میں سے بعض کو انعام واکرام سے نوازو۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اُن کی بھڑاس نکل جائے گی بلکہ لازم ہے کہ آئندہ وہ ہمیشہ بھڑاس ہی نکالتے رہیں گے۔ مقالہ نگار یہاں رائے ظاہر کرتا ہے کہ غالباً انہیں بھڑاسیوں میں سے کہیں اُن لوگوں نے جنم لیا جو ادیب۔ شاعر۔ وغیرہ کہلائے۔ اور اُن کے واویلے کو ادب کہا جانے لگا۔ لیکن مقالہ نگار تحقیقی احتیاط پسندی کی اعلیٰ اقدار کے مطابق اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتا بلکہ محض شک کا اظہار کرتا ہے اور دیگر محققین کو دعوتِ فکروعمل دیتا ہے اور رخصت ہونے کی اجازت طلب کرتا ہے۔

روایت کے بقیہ حصے کے مطابق ن ن نسل کے ہمیشہ ٹھیک ٹھاک رہنے شاداں وفرحاں رہنے پر ناراض رہنے والے لوگوں نے مذکورہ بالا مقالے بعنوان 'ن ن نسل کا تصور مہمان' کو مکمل طور پر رد کر دیا۔ اور دلیل یہ دی کہ یہ مقالہ بھی دراصل انہیں 'بھڑاسی' تحریروں کے زمرے میں آتا ہے جن کی طرف خود مقالہ نگار نے آخر میں ڈرتے ڈرتے اشارہ کیا ہے۔ مقالہ اِس نوٹ کے ساتھ واپس بھیجا گیا کہ مقالہ نگار کو کوئی معقول بات کہنے کا آخری موقعہ دیا جاتا ہے۔ لیکن مقالہ مقالہ نگار کو واپس وصول نہ کرایا جا سکا کیونکہ اُس عرصے کے دوران جب کہ اُس کی تحریر کا تنقیدی جائزہ لیا جا رہا تھا وہ کہیں اور نقل مکانی کر گیا (غالباً کچھ بھانپتے ہوئے)۔ ناراض لوگ سخت تلملائے۔ مقالہ نگار کی تلاش میں ہرکارے دوڑائے گئے۔ ایلچی جگہ جگہ مقالے کی واپسی وصولی ڈلوانے کے لیے غیر متعلقہ لوگوں سے جھڑکیاں کھاتے رہے۔ کھوجی مقالہ نگار کے قدموں کے نشان ماپتے دریا کے کنارے جا پہنچے اور متفقہ کھوجی نتیجہ سامنے لائے کہ دراصل مقالہ نگار دریا بُرد ہو گیا ہے۔ ناراض لوگوں نے اس نتیجے کو 'کام سے جان چھڑانے' کی کوشش قرار دیا۔ اُن کی ناراضگی میں اور بھی اضافہ ہو گیا اور کھوجیوں کو سزا کے طور پر دریا میں پھینکوا دیا گیا لیکن سبھی تیراک تھے ایک آدھ کوس نیچے نہا دھو کر باہر نکل آئے۔

ناراض لوگوں کے سامنے اب ایک عظیم سوال تھا کہ اب وہ کیا کریں۔۔۔

(اچانک اختتام۔ روایت آباؤ اجداد نازش نبردازی)۔

بعد کی کچھ ضعیف روایات اس روایت کے اچانک خاتمے کے حوالے سے ہیں جو کہ روایت کے نفس مضمون سے زیادہ اہم مضمون سمجھا جاتا ہے۔ کچھ انتہائی ضعیف روایات میں سے دو قابل ذکر ہیں۔

انتہائی ضعیف روایت نمبر 1۔ ن ن آباء کی روایت کا اچانک خاتمہ اس لیے ہوا کہ تاریخ میں تسلسل ڈھونڈنے کا رواج ختم ہو گیا۔ اور تاریخ اچانک نامعلوم سمتوں میں چھلانگ لگانے لگی۔

انتہائی ضعیف روایت نمبر 2۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔

نازش نبردازی اپنے آباء واجداد کی اس روایت کی تفصیلات سے قطعاً نابلد تھا۔ لیکن چونکہ افسانہ نگاری کے میدان میں سر نکالنے سے پہلے ہی اُس نے احتیاطاً ایک آدھ ایسے مصنف کو بھی پڑھ لیا تھا جس کے خیال کے مطابق انسانوں کے داغدار ماضی کا سب کچا چھٹا کبھی بندے کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور اُس کے ہر کام دھندے میں اکثر کام خراب کرتا رہتا ہے۔ اس عام سی بات کو ایسے مصنفوں نے 'اجتماعی لاشعور' اور 'نسلی شعور' جیسے ڈرانے والے نام دیے ہوئے تھے۔ نازش نبردازی بھی چونکہ ان ڈرنے والوں میں شامل تھا اس لیے یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اپنی خاندانی روایت کی ہر تفصیل اُس کے نہ جانتے ہوئے بھی اُس کے افسانوں کے ہر لفظ سطر اور پیرے پر اثر انداز ہوتی تھی۔ اور یقیناً اسی لیے جبر کے دور کا آغاز ہو جانے کے باوجود ن نے سماجی حقیقت نگاری پر مبنی اپنا چوتھا افسانہ بھی لکھ ڈالا۔ اگر چہ اس کی ایک غیر اہم وجہ یہ بھی تھی کہ آمر کے آنے کے بعد ادبی مجلس والوں نے کچھ عرصہ تو اپنے اجلاس معطل رکھے اور مختلف جگہوں میں بیٹھ کر 'انتظار کرو اور دیکھو' (Wait and See) کرتے رہے۔ اور جب انہیں ایسا کچھ خاص دکھائی نہ دیا تو انہوں نے مزید آزمائش کے لیے کسی ڈسپوزایبل افسانہ نگار سے سماجی حقیقت نگاری پر مبنی افسانہ پڑھوانے کا فیصلہ کیا۔ کہ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ نازش نبردازی تمام شرائط پر پورا اترتا تھا۔

عین جبر کے دور میں ن ن کے سماجی حقیقت نگاری پر مبنی چوتھے افسانے کا عنوان

'مجھے میرے مہمانوں سے بچاؤ' تھا۔ اور اگر چہ ن نے لفظ مہمان کو کسی طرح بھی بطور علامت استعمال نہیں کیا تھا۔ لیکن اس لفظ کی ماہیت لفظی کھل کر بیان کی تھی۔ ہیرو لسانیات کا پروفیسر تھا اور سسٹم سے بغاوت کا پارٹ ٹائم کام بھی کرتا تھا۔ کہانی سیدھی سادی تھی مگر پھر بھی اُس میں کئی موڑ آتے تھے جیسا کہ ہر کہانی میں آتے ہیں۔ انجام یہ تھا کہ پروفیسر سسٹم سے پارٹ ٹائم بغاوت کی بجائے لفظوں کے سسٹم سے فل ٹائم بغاوت کر دیتا ہے۔ لفظوں سے ڈرنے لگتا ہے۔ اور آخر میں اُس کی مناسب دیکھ بھال کے لیے اُس کی رہائش کا بندوبست ایک پاگل خانے میں کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس واضح حقیقت نگاری پر مبنی افسانے پر بھی سب سے پہلے فضول علامتیت کا الزام لگا۔ جسے خیر اچھا ہوا کہ تنقید کرنے والے کے ہی ایک دشمن نے رد کر دیا۔ پھر ایک معمر سامع نے جو ادبی تاریخ کے حوالوں کے بغیر کبھی رائے نہیں دیتا تھا افسانے کے عنوان کو ایک معروف جواب مضمون کے عنوان کی نقل قرار دیا اور افسانہ نگار کی تخلیقی اُپج پر گہرے شکوک وشبہات کا اظہار کیا۔ جلد ہی اس تنقیدی رائے کو اس قدر آگے بڑھایا پیچھے ہٹایا گیا کہ شکوک وشبہات بالکل رفع ہو گئے اور صاحب صدر نے بحث سمیٹتے ہوئے افسانے کو ایک بے موقع نیم مزاحیہ ناکام تحریر قرار دیا۔ نازش نبردازی تنقید کے دوران چپ کا بیٹھا خون کے گھونٹ پیتا رہا اور بعد میں اُس نے یہ عمل چائے کے گھونٹ کے ساتھ بھی جاری رکھا مگر آخر میں اپنے غم وغصے کے اظہار کے لیے اُس نے ادبی مجلس کے سیکریٹری کو آیندہ کی بار صحیح معنوں میں ایک علامتی افسانہ پیش کرنے کی دھمکی دی۔ جسے بخوشی قبول کر لیا گیا۔

جبر کے دور میں نازش کا پہلا علامتی افسانہ اُس وقت لکھا گیا جب رادوکی میں تربوزوں کا موسم جوبن پر تھا۔ اور قصبے کی ہر گلی بازار اور باہر بڑی سڑک پر بھی ہر طرف تربوزوں کے عظیم الشان مخروطی ڈھیر اتنی کثرت سے نظر آتے تھے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ اس بستی کی اصل مخلوق انسان ہیں یا تربوز۔ ن ن بھی ایک دن اپنے دوست کھادی جھینجا کی پکوڑوں کی دوکان کے سامنے سٹول پر بیٹھا اسی طرح کے مسائل پر غور کر رہا تھا اور بیچ بیچ میں کوئی منحنی (م ن ح ن ی) سا مختصر ناقابل فروخت قسم کا پکوڑا بھی منہ میں ڈال لیتا تھا کہ کھادی کا زیادہ نقصان بھی نہ ہو کہ تخلیق کا بھاری لمحہ ایک بار پھر ایک 'اچانک' کی صورت میں اُس پر ٹوٹ پڑا۔ انسان اور تربوز کے بظاہر ناممکن رشتے کے بارے میں سوچتے سوچتے اچانک اُسے یاد آیا کہ ایک دفعہ

کسی سیاسی گفتگو کے دوران کسی شخص نے تربوز کو ایک خاص قسم کے انسانوں کے ظاہر و باطن کو ظاہر کرنے کے لیے علامت کے طور پر استعمال کیا تھا۔ وہ ایسے انسانوں کی بات کر رہا تھا جو بظاہر روایتی مذہبی بنے پھرتے ہیں یعنی سبز نظر آتے ہیں لیکن اندر سے یعنی حقیقت میں اشتراکی نظریات رکھتے ہیں یعنی سرخ ہوتے ہیں نازش اس صورتحال سے متاثر ہو ہی رہا ہے کہ اُس کی نظر قریب ہی ایک تربوز فروش پر پڑی جو ایک تربوز کو بار بار چیرہ دینے کے بعد تربوز کا ایک ٹکڑا جسے عام زبان میں ٹا کی کہتے ہیں باہر نکال چکا تھا اور گاہک کو اُس کی بے پناہ سرخی کی طرف متوجہ کر کے تربوز کے عمومی اعلیٰ معیار کا قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور ایک بار پھر ن ن پر 'اچانک' وارد ہوا اب یہ ایک علامتی افسانے کے عنوان کی شکل میں تھا۔ 'تربوز کی چیرہ دستیاں' اُس نے زیرِ لب کہا اور مسکرایا۔

'تم نے کچھ کہا باؤ؟' کھادی نے پوچھا۔ 'نہیں کچھ نہیں' نازش نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا اب وہ وقت آ گیا تھا کہ قلم اور کاغذ کی پوری حفاظتی مدد اُسے درکار تھی ورنہ سب کچھ ہوا ہو سکتا تھا اور جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی پلٹ سکتا تھا۔

نبردازی جب قلم لیے کاغذ کا سامنا کرنے بیٹھا تو اُس پر فوراً ہی (اور یہ بھی ایک بار پھر) واضح ہو گیا کہ 'اچانک' کے زیرِ اثر یہ سوچنا کہ اصل کام تو ہو گیا ہے بس اب بیٹھ کر لکھ ڈالنا ہے اکثر (بلکہ ہمیشہ) ایک دھوکا ثابت ہوتا ہے۔ کہانی / افسانہ بنانا مکمل طور پر ایک ٹھوکا ٹھا کی کا کام ہے۔ بس غیب کی مدد شاملِ حال رہے تو پیچ۔ نٹ۔ بولٹ۔ قابلے، قبضے۔ کیل۔ اور دوسرا سودا ایک دوسرے کے ساتھ فِٹ بیٹھتا جاتا ہے۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخری کیل ٹھوکنے پر تم الماری کی کہانی بنا رہے ہو لیکن اس میں سے تابوت نکل آئے۔ ن ن نے یہ سب کچھ اچھی طرح جانتے ہوئے اپنا اصل سودا یعنی تربوز پکڑا۔ اس کے نٹ بولٹ یعنی باہر کی سبزی اور اندر کی سرخی کو الگ الگ کیا۔ وہ دوبارہ سے اس نٹ بولٹ کو جوڑنے لگا تو اُس کی حیرت (اور خوف) کی انتہا نہ رہی کہ اب وہ نٹ بولٹ ایک دوسرے کے لیے بدل چکے تھے۔ اور یہیں سے پھر کام آگے چل پڑا اور نازش نے ایک نیا بولٹ بنا لیا۔ جو پہلے والے نٹ میں فٹ آیا تھا۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیوں کہ کام بن رہا تھا۔ اور کوئی ساڑھے دس دن بعد بالکل بن گیا۔ 'تربوز کی چیرہ دستیاں' کے عنوان سے نازش نبردازی نے جو علامتی افسانہ لکھا اُس کی ون لائین کچھ اس طرح تھی۔

نیامت علی ایک نوجوان جو بظاہر روایتی مذہبی ہے لیکن دراصل اشتراکی معاشیات پر یقین رکھتا ہیں۔ کچھ ایسے لوگوں کے گروپ میں پھنس جاتا ہے جو بظاہر انقلابی اشتراکی ہیں لیکن دل ہی دل میں روایتی مذہبی ہیں۔ موخرالذکر لوگ نیامت کے دوست بھی بن جاتے ہیں لیکن اُس کے خیالات جاننے کے بعد اکثر اُسے تربوز تربوز کہہ کر چھیڑتے ہیں۔ نیامت حساس نوجوان ہے اور یہ صورتحال اُس کے لے سوہان روح بن جاتی ہے۔ کیونکہ تربوز کا موسم آن پہنچتا ہے اور اُس کے بظاہر اشتراکی دوست اُسے آئے دن تربوز پارٹیوں پر بلانے لگتے ہیں۔ نیامت کا دل بھیانک انتقام کے جذبے سے بھر جاتا ہے لیکن اس جذبے کے اظہار کی کوئی صورت نظر نہ آنے پر وہ گہری مایوسی میں چلا جاتا ہے۔ لیکن پھر ایک رات خواب میں اُس کا مسئلہ حیرت انگیز طور پر حل ہو جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے نام نہاد اشتراکی دوستوں کے سروں پر ایسے بڑے بڑے تربوز پھینک رہا ہے جن کی جلد سرخ ہے۔ لیکن جب وہ اُس کے دوستوں کے سروں پر ٹوٹتے ہیں تو اندر سے سبز گودا نکلتا ہے۔ اس عمل کو سرانجام دینے پر اُس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ اور پھر اُس مسرت و انبساط سے جو صرف انتقام لینے پر ملتا ہے اُس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ جاگنے پر چند لمحے تو یہ تاثر برقرار رہتا ہے لیکن پھر 'اوخو یہ تو خواب تھا' کہ ساتھ ہی پہلے سے بھی زیادہ شدید مایوسی نیامت کو گھیر لیتی ہے۔ اس انتہائی خوش کُن خواب کے بعد وہ ساری رات سو نہیں سکتا۔ لیکن بے خوابی کے دوران ہی اچانک، (پھر اچانک) اُسے خیال آتا ہے کہ اُس کا خواب محض خواب نہیں ہے بلکہ اُس میں تو اُس کے لیے۔ اُس کے مسئلے کے حل کے لیے ایک واضح اشارہ موجود ہے۔ ٹھیک ہے باہر سے سرخ اندر سے سبز تربوز حقیقت میں نہیں پائے جاتے لیکن دنیا میں ان شرائط پر پورا اترنے والا کوئی پھل یا سبزی تو ہوگی۔ بس اُسے صرف ایسے پھل یا سبزی کو ڈھونڈنا ہے۔ یہ خوابناک انکشاف اُسے زندگی میں ایک نیا ولولہ دے دیتا ہے۔ اور وہ ایسے کسی پھل (یا سبزی) کی تلاش میں فروٹ مارکیٹوں اور سبزی منڈیوں میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے برس ہا برس کی تلاش کے باوجود وہ اپنے خوابوں کے پھل (یا سبزی) کو ڈھونڈنے میں ناکام رہتا ہے۔ لیکن ایسی جستجو کے دوران پھلوں اور سبزیوں کے بارے میں اُس کا علم اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اُسے پھل فروٹ اور سبزیوں کی ایک دوکان کھولنی پڑتی ہے۔ دوکان بہت چل پڑتی ہے اور وہ سوچتا ہے کہ کاش وہ یہ کام پہلے ہی کر لیتا۔

نازش نبردازی نے جبر کے دور میں اپنا پہلا علامتی افسانہ 'تربوز کی چیرہ دستیاں' ادبی مجلس میں پیش کیا تو اُسے بے پناہ داد دی گئی اور حاضرین میں سے بعض کا تو ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ نازش پہلے تو ایک کھسیانے سے عالم حیرت میں چلا گیا کہ یااللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اُس کی علامت کو کوئی سمجھ ہی نہیں رہا۔ لیکن جب داد میں کوئی کمی نہ آئی تو اُسے قبول کرتے ہی بنی۔ نقادوں نے نازش نبردازی کی تحریروں کو مذاحیہ ادب میں ایک شاندار اضافہ قرار دیا۔ بات کافی دور تک گئی نازش کے سابقہ افسانوں کو بھی کامیابی سے اصل میں مذاحیہ ثابت کیا گیا۔ صاحب صدر نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا کہ یہ غنیمت کی بات ہے کہ جبر کے دور میں جب کہ ہر کوئی ہر طرف روتا دھوتا پھرتا ہے کوئی تو ہے جو ہنسا رہا ہے۔ اس پر حاضرین ایک مرتبہ پھر ہنس پڑے۔

تمام تر داد و تحسین وصول کرنے کے باوجود ن کو کوئی خوشی نہ ہوئی۔ رات رادو کی واپسی پر بس سے اُترنے پر اُسے ایسا لگا کہ تربوز کا ایک بڑا سا چھلکا اُس کے رستے میں پڑا ہے۔ اُس نے کس کر چھلکے کو ڈھڈا مارا تو وہ زمین میں گڑا پتھر نکلا۔ غالباً اسی ہنگامی عمل کے بعد جسم و جان پر طاری ہونے والی کیفیات نے نازش کو اپنی ادبی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ فیصلہ دو حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلا حصہ آیندہ جبر کے دور میں کم از کم کبھی افسانہ بلکہ کسی قسم کی بھی کوئی نثر نہ لکھنے کا تھا۔ اُسے پکا یقین ہو گیا کہ جبر کے دور میں ابلاغ کے ساتھ کچھ عجیب الٹ پھیر ہو جاتا ہے۔ سنجیدہ بات کرو تو ہاسا پڑ جاتا ہے اور مزاحیہ بات کرو تو لوگ رنجیدہ ہو جاتے ہیں دوسرا حصہ فوری طور پر شاعری شروع کرنے کا تھا۔ فیصلے کے اِس حصے کے آگے پھر تین حصے تھے۔ اول یہ کہ کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھنا کیونکہ شاعری کی صلاحیت بہر حال موجود نہیں۔ دوم یہ کہ پوری سنجیدگی سے انتہائی ہونق اور عجیب الخلقت قسم کی چیزیں لکھ کر انہیں شاعری کے طور پر پیش کرنا ہے۔ سوم۔ نقادوں کے غم و غصے اور دشنام طرازی پر بالکل دل بُرا نہیں کرنا کیونکہ جس طرح کی چیزیں ذہن میں آ رہی ہیں وہ اگر لکھی گئیں تو انہیں پڑھنے یا سُننے والا کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ان فیصلوں کے بعد نازش نبردازی نے اپنا یعنی جو کچھ بھی اسے اپنی لکھنے پڑھنے کی میز پر نظر آیا۔ افسانوی ساز و سامان (عظیم افسانہ نگاروں کے مجموعے ایک آئیڈیاز والی کاپی۔ تین ادبی رسالے۔ دو پرانے اخبار جن میں نازش کے ___ ادبی مجلس میں پیش کیے گے افسانوں کی تعریف اور 'بد تعریف' چھپی تھی۔ ایک پیپر ویٹ۔ کالی اور لال بال پوائنٹ پنسلیں۔ ایک چھنا نک

موتیہ پچلی۔ روشن خیالی کا ایک خط)۔ سب کچھ سمیٹ کر الماری میں بند کر دیا۔ اور پھر میز کے اوپر جھاڑن پھیر کر اُسے صاف شفاف کر کے ویسے ہی صاف شفاف ذہن کے ساتھ اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ لیکن پھر اک دم اُس پر ایک عجیب سی گبھراہٹ طاری ہوئی اور وہ اٹھ گیا۔ ابھی رات کے گیارہ بجے ہیں کھادی ابھی اپنے اڈے پر ہی ہوگا اُس نے سوچا۔

کھادی اُسے دیکھ کر حسب معمول بہت خوش ہوا۔ لیکن پھر غور سے اُسے دیکھتے ہوئے کچھ تشویش سے کہنے لگا۔

'کیا ہوا باؤ لگتا ہے تمہیں کہیں سے 'پھنڈ' پڑی ہے۔

ن کھادی کی رائے پر اظہار خیال کرنے کی بجائے اپنے پسندیدہ سٹول پر بیٹھ گیا اور زمین میں گڑے بانس سے لٹکے بجلی کے بلب کے گرد زنز ناتے، مہین کیڑوں کے بادل کو دیکھنے لگا۔ کھادی نے بینگن کے قتلے کاٹنے کے دوران نازش کی نظروں کا تعاقب کیا۔ 'کیڑوں کا جلسہ دیکھ رہے ہو؟'۔ اُس نے ہنس کر پوچھا۔ اور نازش نے بُری طرح چونک کر کھادی کی طرف دیکھا۔ 'کیڑوں کا جلسہ' اُس نے حیرت سے سوچا 'یہ تو سیدھا سیدھا کسی نظم کا عنوان یا کم از کم وہ کیا کہتے ہیں مصرعہ۔ یا آزاد نظم۔ نہیں نثری نظم کا ٹکڑا لگتا ہے۔ 'یار یہ تو اچھا ہے'۔ نازش نے بلند آواز میں اپنے آپ کو کہا لیکن کھادی سمجھا کہ وہ بینگن کے قتلے کی تعریف کر رہا ہے۔

'ابھی نکال کر دیتا ہوں پُر۔ کوئی گانا شانا سنو گے؟' کھادی نے پوچھا اور قریب ہی رکھے چار بڑی اینٹوں کے سائز کے ٹرانسٹر کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ٹرانسٹر کا پلاسٹک کا جسم کھادی کی انگلیوں کی دست بُرد کی وجہ سے مکمل طور پر تیل میں چپڑا ہوا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اسے بھی پکوڑوں کے ساتھ ہی تل کر باہر نکالا گیا ہے۔ کھادی نے تلے ہوئے ریڈیو کی ناب گھمائی تو اُس کی انگلیاں اُس کے اوپر پھسل گئیں پھر اُس نے ردی کاغذ کے ٹکڑے سے ناب کو جکڑ کر پھر گھمایا تو کڑک آواز کے بعد اناؤنسر کی آواز سنائی دی۔

'اپنا خیال رکھیں'۔

'کھادی ہنس پڑا "یار باؤ ایک بات بتاؤ۔ یہ اب کیا کہنے لگے ہیں ریڈیو پر اپنا خیال رکھیں نہ ہر کوئی اتنا خیال رکھتا ہے۔ انہیں کیا تکلیف ہے۔ ہم کوئی پاگل ہیں۔ اپنا خیال نہیں رکھیں گے' تو اُن کا رکھیں گے"۔

'کیا پتہ'؟ ن ہنسا اور اِس کے ساتھ ہی ریڈیو کی آواز بیٹھ گئی۔ کھادی نے ایک ہوائی گالی دی اور کہا' لگ گیا غوطہ۔

'کیا ہوا'

'خرابی پڑی ہوئی ہے۔ تین چار دن سے۔ آواز بیٹھ جاتی ہے۔ پھر آ جاتی ہے۔ پھر چلی جاتی ہے۔ مجیدے لوہار کو دکھانا ہے۔ ریڈیو ٹیپ کا بھی سیانا ہے۔

اور پھر آواز ابھری ''بلیٹن'' اور آواز پھر غائب ہو گئی۔ پھر اُبھری۔ سب سے بڑا اجتماع۔۔ پھر غائب ہو گئی۔ شمولیت کا اعلان۔۔ پھر غائب۔ پھر اُبھری۔۔ مناسب اقدامات۔۔ پھر غائب۔۔ نافذ کی جائے۔۔۔

کھادی نے قہقہہ لگایا ''ہے ناں غوطے پے غوطہ کھا رہا۔ بڑی اوازاری ہے۔ بند ہی کردوں'' اُس نے ناب کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ نازش نے شور مچا دیا۔

'نہ۔نہ۔نہ۔ بالکل نہ۔ چلنے دو۔ یہ۔یہ۔ یہ تو میرا مسئلہ حل ہو گیا۔ اِدھر، اُدھر۔ میں کاغذ۔ پینسل۔۔۔ میں۔ لاؤ۔ یار۔ جلدی۔۔۔

کھادی بھی بوکھلا گیا' کیا ہوا۔ کیا ہوا۔ خیر تو ہے۔ یااللہ خیر۔ باؤ۔۔ باؤ۔

نازش نے اپنے اعصاب پر قابو پایا، کچھ نہیں۔' کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہے بس ریڈیو چلنے دو۔ یہ تین چار ردی کاغذ مجھے دے دو۔ اور۔ وہ کچی پنسل جو پڑی ہے اور بس بولنا نہیں۔ کام کروانا۔۔۔ مجھے اپنا کام کرنے دو۔۔۔'

''اوخو۔ پر کیا کام''؟ کھادی نے جھنجھلا کر پوچھا۔

'شی' ن ن نے انگلی ہونٹوں پر رکھی اور پھر ردی کاغذوں پر ڈیڑھ انچ کی پینسل سے کھادی جھینپے کے تلے ہوئے غوطے کھاتے ریڈیو سے آتی اُبھرتی ڈوبتی آوازوں میں سے پہچان میں آنے والی شناخت ہونے والی عبارتوں کو چُن چُن کر لکھنا شروع کر دیا۔

''جوش و جذبہ سے منائی = سنگ بنیاد = پُر امن اور صحت مند فضا میں = کمر کس کر باندھ کر = غیر یقینی صورتحال ختم = آزادانہ اور منصفانہ = افہام و تفہیم = کامیابی سے چل رہا ہے = اعتماد نے مجھے حوصلہ دیا = قبلہ درست کیا = درست رستے کا یقین = حق ہی نہیں قومی اور اخلاقی فرض بھی = بعد میں ورثا کے حوالے کر دیں گے = سُرخروئی اور بالادستی =''

ن ردی کاغذ تہہ کر کے اُٹھا تو کھادی نے بھی اپنا کام سمیٹنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے چولہے کے نیچے جلتی لکڑیاں باہر کھینچ کر اُن پر پانی ڈالا اور پھر مشکوک انداز میں ن سے پوچھنے لگا۔

'بچ بند کر دوں۔۔۔۔ ہیں؟'

'ہاں۔۔۔'

'پر یہ تم کر۔۔۔ کارروائی کیا ڈال رہے ہو۔'

'ہاں۔ بس کارروائی ہی سمجھو۔'

'ریڈیئے کا۔ پرچہ کاٹ رہے ہو۔' کھادی نے بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

نازش نے بھرپور قہقہہ لگایا 'ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔' اُس نے دل میں سوچا یہ بھی اچھا ہے۔ پرچہ۔ کارروائی اور پرچہ۔ 'ویسے کھادی یار تم بڑی شے ہو۔' اُس نے پورے خلوص سے کہا اور کھادی نے دانت نکال دیے۔

'کھیہ تے سواہ' کھادی نے اظہار عجز کیا پھر ٹرانسسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا جس پر اب ایک مقبول عام قوالی غوطے کھا کھا کر ایک ایسی کمپوزیشن بنا رہی تھی جسے سُن کر نازش اور کھادی ہنستے ہنستے دُہرے ہو گئے۔

'لگتا ہے قوال کو پھینٹی پڑ رہی ہے میں ابھی لے جاتا ہوں مجیدے لوہار کے پاس ٹھیک کرانے۔۔ یہ کوئی بات ہے۔' اور ن کے منہ سے پھر چیخ جیسی آواز نکلی۔

'نہ۔نہ۔نہیں۔ بالکل نہیں۔ اسے بالکل نہیں چھیڑنا۔ بالکل ٹھیک نہیں کرانا'۔

اب کھادی نے بہت زیادہ تشویش سے نازش نیردازی کی طرف دیکھا۔

'باؤ۔۔تم۔۔ میرا مطلب ہے۔ تمہارے ساتھ کوئی ہرج مرج تو نہیں ہو گیا'۔۔

'کیا مطلب'؟

'مطلب ہے کوئی۔۔ لین پٹڑی کی کہانی تو نہیں ہو گئی تمہارے ساتھ'۔۔

'شاید۔ پر تم فکر نہ کرو۔۔ میں کوئی آٹھ دس دن آیا کروں گا۔ اسی ٹائم۔۔ اسی طرح اسے چلا کر پرچہ کاٹوں گا'۔۔

'جم جم آؤ۔ پر' کھادی نے بے اطمینانی سے کہا۔

اور پھر اس طرح آٹھ دس دن میں نازش نبردازی نے فضائے بسیط (بسیط ع) مذکر۔ بچھا ہوا۔ (2) کشادہ۔ وسیع (3) عروض کی ایک بحر جو مستفعلن فاعلن کو آٹھ بار دہرانے سے بنتی ہے۔ (4) بالائی۔ اوپری۔ (5) مفرد۔ غیر و بک شے (فیروز الغات) میں کیڑوں پتنگوں کی طرح بکھرے کوئی ڈیڑھ (ڈیڑ۔ تھ) (ہ) مذکر۔ ایک اور آدھا۔ یک نیم 1/2 ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا یا چنّا (1) اپنی چھوٹی سی مسجد الگ بنانا (2) شرکت پسند نہ کرنا (3) کسی کی رائے سے متفق نہ ہونا۔ تھوڑا سا کام کر کے دل کا حوصلہ نکالنا۔ ڈیڑھ بکائن میاں باغ میں (ا) مثل تھوڑی سی پونجی پر اترانا۔ ڈیڑھ پا۔ یا۔ ڈیڑھ پاؤ (ہ) مذکر آدھ پاؤ اوپر پاؤ سیر۔ (3) سیر ڈیڑھ پاؤ۔ چون چوبارے رسوائی (ہ) مثل ذرا سا کام اور بہت بڑا اہتمام۔ ڈیڑھ چلو لہو پینا۔ (ہ) دیکھو۔ ڈھائی چلّو لہو پینا۔ ڈھائی چلو لہو پینا (ہ) حالت غضب میں کسی کو مار کر غصہ فرو کرنے کے لیے لہو پینا) ___ دو ہزار لفظوں کو کانوں سے اُچک اُچک کر اکٹھا کیا۔ پھر اُس نے اُن میں سے قابل شناخت عبارتی ٹکڑوں کو لائینوں میں پھیلا کر پھر ترتیب دے کر اُن کے بنڈل بنائے۔ اور ہر بنڈل کو ساتھ ساتھ رکھ کر انہیں دیکھا۔ لیکن بنڈلوں کے علاوہ اور کوئی خاص بات مثلاً شاعری۔ جبر کے دور میں شاعری۔ تنقیدی شاعری۔ مزاحمتی شاعری وغیرہ وغیرہ کچھ بھی کہیں نظر نہ آنے پر اُس نے بنڈلوں کو پیچھے ہٹ کر دیکھا جیسے مصور لوگ تصویر بناتے وقت اُسے پیچھے ہٹ ہٹ کر دیکھتے ہیں پھر اُس نے بنڈلوں کو اتنے قریب سے دیکھا کہ جیسے گھڑی ساز گھڑی درست کرتے وقت گھڑی کے اندر دیکھتے ہیں۔ پہلی دفعہ ن کیا دیکھتا ہے کہ کاغذوں کا ایک فولڈر ہے جو اُس کے اپنے فولڈر سے حیرت انگیز حد تک مشابہت رکھتا ہے اور میز کی پچھلی دیوار کے ساتھ ترچھا لگا کھڑا ہے۔ اس پر اُسے حیرت ہوئی کہ یہ گر کیوں نہیں جاتا۔ دوسری دفعہ یعنی گھڑی ساز کی طرح اُسے سفید زمین پر کالے لائین دار دھبے دکھائی دیئے اور اِس پر اُسے پھر حیرت ہوئی کہ اُسے آج تک علم ہی نہیں ہو سکا کہ وہ تو ضعف بصارت کا شکار ہو چکا ہے۔

بار بار حیرت پر یک دم ن کو کچھ حوصلہ سا ہوا۔ اُسے یاد آیا کہ کہیں اُس نے سُنا تھا کہ حیرت سے کسی چیز کا آغاز ہوتا ہے لیکن کس چیز کا اُسے یاد نہ آیا۔ ہاں یہ خیال ضرور آیا کہ یہ بات کسی مشہور شخص نے کہی تھی۔ مگر وہ شخص کون تھا یہ بھی اُسے یاد نہ آیا۔ اِس پر اُسے پھر حیرت ہوئی کہ کہیں اُس کی یادداشت بھی تو جواب نہیں دے رہی۔ اُس پر خوف کی ایک لہر اُس کے جسم

میں دوڑ گئی مگر اگلے ہی لمحے اُسے پھر حیرت ہوئی کہ وہ کس عجیب طریقے سے محض مفروضوں پر حیران ہو رہا ہے۔ اور پھر اُسے یقین ہو گیا کہ اُس کے ساتھ کچھ ہو رہا ہے۔ اور کچھ بھی ہونے سے بچنے کا شافی علاج اُس کے پاس موجود تھا یعنی پانی (دیکھو روایت آباء و اجداد نازش نبردازی)۔ (ایک بار پھر دیکھو۔ نظریہ اجتماعی لاشعور از کارل ژنگ)۔ چنانچہ نازش نبردازی کے پاؤں آپ ہی آپ رادوکی کے شمال میں واقع دریا کی طرف اٹھنے لگے۔ لیکن پاؤں ابھی دو فرلانگ سے زیادہ نہ اٹھے تھے کہ سامنے ایک سُوا آ گیا جو ایک نہر سے نکل کر کھیتوں کو پانی دینے جا رہا تھا۔ یہیں ایک مقام تھا جو جھال رٹو ڈوگر کہلاتا تھا اور مقامی نوجوانوں کی غسل اور پیراکی کی ضروریات پورا کرتا تھا۔ اِس مقام کو دیکھتے ہی نازش کا انفرادی اور ذاتی شعور کھٹاک سے حرکت میں آ گیا۔ اُس نے سوچا کہ یہ سُوا بھی تو آخر نہر سے نکل کر بہتا آتا ہے جیسے کہیں نہ کہیں دریا نے اِدھر بھیجا ہے اس لیے کچھ عجب نہیں کہ دریا کی اجتماعی دانش پروری کی کوئی رمق یہاں تک بھی آن پہنچی ہو۔

یہاں پر نازش نے مزید غور و فکر کرنے کی بجائے کچھ دوسرے لوگوں کے سُنے سنائے اجتماعی لاشعوری فارمولے پر عمل کیا جس کے مطابق "اگر سوچ میں پڑ جائے گا تو بندہ چلا جائے گا" کی دھمکی یا وارننگ دے کر بندگان خدا کو سوچ بچار سے باز رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت کم بندے حکم عدولی کی جرأت کرتے ہیں۔ اور جو کرتے ہیں انہیں جلد از جلد کیفر کردار تک پہنچانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ن نے فی الفور جھال رٹو ڈوگر میں چھلانگ لگائی۔ ڈیڑھ دو منٹ زیر آب رہا اور پھر باہر نکل کر ایک کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھ کر جب اُس نے اپنے گیلے بالوں کو جھٹکنے کے لیے مجبوراً سر کو بھی جھٹکے دیے تو سارا مسئلہ حل ہو گیا کہ اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے ___ بات یہ سامنے آئی کہ اصل میں سارا قصور لفظوں کے بنڈلوں میں چھپی ہوئی باندھی ہوئی ترتیبوں کا تھا جو جبر کے دور کی ترجیحات سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ ہوا اصل میں یہ تھا کہ جب وہ کھادی چھینجا کے تلے ہوئے ریڈیو میں سے برآمد ہونے والے فضائے بسیط میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح اڑتے پھرتے لفظوں سے عبارتی ٹکڑے اکٹھے کر کے انہیں بنڈلوں میں باندھنے لگا تھا تو لاشعوری طور پر (نازشی/ذاتی لاشعور) اُس نے ہر بنڈل کو ایسی رسیوں سے باندھ دیا۔ جن کا استعمال ان دنوں بندوں کو باندھنے کے لیے بھی

کافی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ نازش نبر دازی کوئی انوکھی شرارتی شاعری تخلیق کرنے اور لوگوں کو الو بنانے کی ترنگ میں خود الو بن گیا تھا اور لفظوں اور بندوں کے درمیان فرق کی تمیز کرنا بھول گیا تھا۔ یعنی خطائے زمرہ بندی (category mistake) کی عام فہم غلطی کا مرتکب ہوا تھا۔ لیکن اب جبکہ غلطی پکڑی جا چکی تھی تو اُسے پتہ تھا کہ اُس نے کیا کرنا ہے۔ گھر پہنچ کر اُس نے سب بنڈل کھول دیئے پھر ہر عبارتی ٹکڑے کے کاغذی ٹکڑے قینچی سے کاٹے اور اُن ٹکڑوں کو ایک بڑے خاکی لفافے میں ڈال کر انہیں ہاتھ ڈال کر زیادہ سے زیادہ بے ترتیب کیا جس طرح قرعہ فال۔ کمیٹی نکالنے والے متعلقہ لوگوں کو یقین دلانے کے لیے کرتے ہیں کہ کوئی ہیرہ پھیری نہیں کی جا رہی یہ قسمت کا کھیل ہے۔ پھر اُس نے شاعری کے بارے میں اپنے واحد علم کہ اس میں ملتی جلتی آوازوں والے الفاظ یا عبارتوں کی دہرائی کی جاتی ہے کو استعمال کرتے ہوئے ایک شعر نما عبارت کا انتخاب کیا اور پھر اُسے وقفوں وقفوں سے دہرا کر درمیانی خلا میں قرعہ اندازی کے ذریعے لفظوں/عبارتی ٹکڑوں کی ڈھیریاں لگاتا گیا۔ اس طرح جو چیز بنی وہ کچھ یوں تھی۔

کیا دے گیا کیا لے گیا
لو۔ پھر بازی لے گیا

سب سے بڑا اجتماع۔ اظہار تشویش۔ مناسب اقدامات۔ یقین دہانی۔ نتیجہ خیز بات چیت۔ شمولیت کا اعلان۔ نافذ کیا جائے۔ عریانی و فحاشی۔ ٹکٹکی پر باندھ کر جوش و جذبے سے منائی۔ سنگ بنیاد رکھا۔ پُر امن اور صحت مند فضا میں منعقد۔ غیر یقینی صورتحال ختم۔ آزادانہ اور منصفانہ۔ افہام و تفہیم۔ کامیابی سے چل۔ قبلہ درست کرنے کی ضرورت۔ میرے اعتماد نے مجھے حوصلہ۔ حق ہی نہیں قومی اور اخلاقی فرض بھی۔ فرض سے کوتاہی۔ اخلاقی گناہ۔ دباؤ میں آئے بغیر۔ سرخروئی اور بالادستی۔

کیا دے گیا کیا لے گیا
لو۔ پھر بازی لے گیا

ہم کہاں کھڑے ہیں۔ گردوپیش کی تبدیلیاں۔ ٹکٹکی پر باندھ کر۔ مثبت نتائج کے حق میں۔ چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔ اختیارات میں توازن۔ بنیادی کردار ادا۔ اٹھا لیا جائے گا۔ کافی

لچک ہے۔ سڑکیں سنسان ہو گئیں۔ نظریے کے مطابق ڈھل۔ انتظامات شروع۔ جواز اور موجب بنا۔ جو جذبہ کارفرما۔ انتظامات جلد از جلد مکمل۔ شرمندہ تعبیر۔ ترجیح دی ہے بہانہ نہیں بنایا۔ لازم و ملزوم۔ سورج زمین کے گرد گھومتا۔ ہمت اور توفیق سرخروئی اور بالادستی۔ عریانی و فحاشی۔

کیا دے گیا کیا لے گیا
لو۔ پھر بازی لے گیا

تباہی کے گڑھے۔ وقار بلند ہوا۔ یکجہتی اور باہمی اتحاد۔ مربوط پروگرام۔ تسلی بخش طور پر عمل۔ فخر کرتے ہیں۔ حقوق کی ضمانت۔ بہت لچک اور وسعت۔ ہر قسم کے حالات میں رہنمائی۔ دروازے کھلے ہیں۔ طول دینے کی کوشش نہیں کی خدوخال کی نشان کی۔ غیر ملکی اکابرین۔ قلعی کھل گئی۔ بعد میں ورثا کے حوالے کر دیں گے۔ غیر معمولی حالات کے پیش نظر۔ اطلاع پیشگی مل گئی۔ پرجوش خیر مقدم۔ تصدیق کر دی۔ گہوار بنا دیں۔ تمام تر توانائیاں۔ تدبر بصیرت اور جرأت۔

کیا دے گیا کیا لے گیا
لو۔ پھر بازی لے گیا

خدوخال نمایاں کرنے۔ اقدام قرار دیا ہے۔ واضح خطوط۔ کی نشان دہی کی۔ بھاری اکثریت۔ تائید میں۔ تاریخی حیثیت۔ جذبہ پروان چڑھے گا۔ دور رس نتائج کا حامل۔ مستحسن اقدام۔ اپنی رائے محفوظ رکھی۔ ٹکٹکی سے اُتارا گیا۔ تو یہ اقدام قرار دیا۔ مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ روز روز کی تبدیلی اچھی نہیں۔ عریانی و فحاشی۔ مثبت نتائج۔ بروقت اور جرأت مندانہ اقدام۔ راہ ہموار کرنے کا موجب ثابت۔ قابل ستائش۔ منبع اور سرچشمہ۔ کا اجرا خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

کیا دے گیا کیا لے گیا
لو۔ پھر بازی لے گیا

شرط عائد کی جائے۔ توازن و تناسب پیدا۔ تضاد بلکہ محاذ آرائی۔ غیر یقینی صورتحال سے دوچار۔ ٹکٹکی سے باندھا گیا۔ تشویش ناک اور دھماکہ خیز صورتحال۔ سلامتی اور بقا کا تقاضہ۔ یکسو ہو کر ترقی اور استحکام کی منزل۔ عریانی و فحاشی۔ تسلسل بھی برقرار۔ قانونی اور آئینی خلا۔ بحالی

کو یقیناً آسان بنا۔ عزم و اعتماد کے ساتھ جدوجہد۔ آخری فیصلہ بہرحال۔ سے رجوع کیا گیا۔ اصل مالک اور وارث۔ دور کا پیش خیمہ۔ مدافعتی نظام تباہ ہو۔ جان لیوا ثابت۔ پرکھنے کا ایک ہی مسلمہ طریقہ

کیا دے گیا کیا لے گیا
لو۔ پھر بازی لے گیا

جتنا نازک دور اب ہے۔ ناپاک عزائم۔ سنسر سے پاس شدہ۔ فیصلے کا دن۔ بے بنیاد قیاس آرائیاں۔ مصالحتی فارمولا پیش۔ چوکس کر دیا۔ اصلیت سے آگاہ کرنے کی ضرورت۔ ترقی و ترویج۔ عملی اقدامات۔ خودسوزی کی کوشش۔ یقین دلاتے ہیں۔ بھرپور حصہ لیں۔ پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے۔ عمل کو تحفظ فراہم کرنے کا ضامن۔ ٹکٹکی پر باندھنے سے پہلے۔ مثبت نتائج۔ مناسب وقت آنے پر۔ حق و باطل کا معرکہ۔ تکمیل کا عمل جاری رکھنے کی ضرورت۔ تکمیل کے لیے ناگزیر۔ جذبے سے سرشار۔ ناقابل تسخیر قلعہ۔

کیا دے گیا کیا لے گیا
لو۔ پھر بازی لے گیا

ہم کہاں۔ ہمارے۔ کھڑے ہیں ذرائع سے اس بات کی تصدیق۔ روزہ طوفانی دورہ۔ کروڑوں دلوں کی آواز۔ بارے میں وضاحت۔ حق دینے کی تجویز۔ یقین دہانیاں اور ان کا حاصل۔ عدیم المثال۔ مستقل علاج نہیں۔ آلو کے کاشت کار بھائی متوجہ۔ قیام امن کی کوششوں۔ مفت سعادت۔ ادیبوں کو اپنا کردار۔ عظیم الشان نیلام عام۔ عریانی فحاشی کے ساتھ ایک شام۔ ٹکٹکی سے اتارنے کے بعد۔ مذموم عزائم۔ مسترد کر دیا۔ اتفاق ہے یا نہیں۔ دعووں کی قطعی تردید کرتے۔ کالعدم ہیں۔ اہتمام کرنا ہوگا۔ قائم و دائم رہے۔

کیا دے گیا کیا لے گیا
لو۔ پھر بازی لے گیا

گنجائش رکھی تھی۔ معتبر ذرائع سے معلوم۔ بروقت کارروائی کر کے۔ والہانہ پن دیکھتے ہوئے۔ ٹکٹکی پہلے سے موجود تھی۔ بعد میں ورثا کے حوالے کر دی گئیں۔ پہلے بھی ناکام اور تلخ تجربے سے۔ فرق مراتب ملحوظ۔ منسوخ۔ دھمکی۔ غیر مشروط بحالی۔ واضح اعلان کیا۔ صحیح معنوں

میں۔ گرانی میں گزرے۔ مخالفت برائے مخالفت۔ سبوتاژ کرنے کی سازش۔ عریانی و فحاشی۔ گراں قدر کوششوں۔ جوق در جوق آنے کی تجدید کا دن۔ رائج کیا جائے۔ نقشہ تبدیل کر۔ دل کی گہرائیوں سے۔ عظیم نصب العین۔ ہاں کر دی۔ کے حصول کا یادگار دن۔

کیا دے گیا کیا لے گیا
لو۔ پھر بازی لے گیا

انتہائی نازک دور سے گزر اس حقیقت سے بھی یقیناً بے خبر۔ فکر و عمل میں کوئی تضاد۔ حاضری دی۔ کوئی بے ضابطگی۔ منظر پیش کرتی تھیں۔ مناسب وقت آنے پر۔ آپ نے سب کچھ خود دیکھ لیا۔ مثبت نتائج کے حصول تک۔ مزید کچھ کہنے کی گنجائش۔ پرواہ نہیں کوئی کیا سمجھتا۔ جوش و خروش میں کوئی فرق۔ اصولی طور پر فیصلہ۔ ٹکٹکی پر باندھ دیا گیا۔ اصولی طور پر فیصلہ کر لیا گیا۔ مضحکہ خیز الزام۔ اپنا اپنا نقطہ نظر ہے۔ یہ وثوق سے کہا تھا۔ میرے مشاہدے میں ایسی کوئی بات۔ حیثیت اب مسلم۔ مکمل نظم و ضبط کا ثبوت۔ دنیا پر ظاہر کر۔ نام کی قوت و برکت سے۔

کیا دے گیا کیا لے گیا
لو۔ پھر بازی لے گیا

مخالفین کی ریشہ دوانیاں۔ عوام کے عزم و ہمت۔ رجوع کرنے کو ترجیح دی۔ قابل تحسین ہے۔ نے بھی سب کچھ دیکھ لیا۔ تسلسل دینے کے لیے۔ عریانی و فحاشی۔ پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا ازالہ۔ صبر و تحمل قابل تحسین۔ ٹکٹکی ٹوٹ گئی۔ سرگرمیوں پر کوئی قدغن عائید۔ مخصوص عینک سے۔ غلبہ کا الزام بھی عائید۔ پیشہ ورانہ غیر جانبداری کے تقاضوں کے پیش نظر۔ بدیہی طور پر ایک تکلیف دہ اور تشویش انگیز صورتحال۔ بے چینی کا اظہار کیے بغیر۔ یہاں سے ہم کس طرف بڑھنے کا ارادہ۔ نہیں کہا جا سکتا اس کا انجام۔ نتیجہ بھی بہت بڑی وجہ نزاع۔

کیا دے گیا کیا لے گیا
لو۔ پھر بازی لے گیا

خلیج وسیع تر ہو۔ ادنیٰ معیار سے بھی فروتر۔ مفاہمت کا رستہ اختیار۔ تعاون کی ضرورت کا احساس۔ موقف کو پذیرائی بخشنے کے امکانات۔ ٹکٹکی سے اتارتے وقت۔ حقیقت کا جامہ۔ مناسب وقت آنے پر۔ پہنانے کی کوشش۔ عریانی و فحاشی۔ قطع نظر، بالفعل اور عملاً۔ حوصلہ

انگیز اور امید افزا۔ اذہان اور اخلاق پر بُرا اثر پڑنے کا امکان۔ معمول پر آ جائیں۔ پابندی کی سفارش۔ کی طرح ڈالی گئی۔ کے لیے لمحہ فکریہ۔ طبقات میں بے چینی۔ محمد جاوید والدہ کی حالت بہت نازک۔ نتائج و عواقب اور آیندہ کے لیے چند تجاویز۔ حسب عادت مبالغہ آرائیاں۔ مسلط کرنے کا حق کسی۔

کیا دے گیا کیا لے گیا
لو۔ پھر بازی لے گیا

عبارتوں۔ لفظوں کی قرعہ اندازی کے ذریعے بننے والی اس شاعری کو ادبی مجلس میں پیش کرنے سے پہلے نازش نبردازی نے ایک بلکہ دو تین چالاکی کے کام کیے۔ اولاً اُس نے مجلس کی ہفتہ وار نشستوں میں پیش کی جانے والی ہر طرح کی شاعری کو بُری طرح لتاڑنا شروع کر دیا۔ اور ساتھ ہمیشہ یہ پیغام دینا شروع کیا کہ وقت آ گیا ہے کہ اِن فرسودہ اصناف کو یک سر رد کر دیا جائے کیونکہ اِن میں سے کوئی بھی جبر کے دور کے تجربے کو پکڑ (اور پھر چھوڑ) نہیں سکتی۔ دوم۔ اُس نے مجلس کے اندر اور باہر لاطینی امریکہ۔ افریقہ اور مشرق بعید کے بعض ممالک سے تعلق رکھنے والے قطعاً فرضی شعرا کا تذکرہ کرنا شروع کر دیا کہ کس طرح انہوں نے شاعری کی ایسی نئی اصناف دریافت کی ہیں کہ جنہیں کام میں لا کر وہ عصری شعور کی عکاسی کرتے ہیں اور جبر کی قوتوں کی انتہائی شدید مزاحمت کرتے ہیں لیکن ایسے کمال سے کہ بعد میں انہیں پکڑنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ ماسوائے اِس کے کہ کوئی دل جلا (معاصر شاعر) مخبری کر دے یا وہ خود ہی بعض کمزور لمحوں میں (جن کا نزول عموماً شعرا پر رات کے پہلے پہر بعض مخصوص مشروبات کے استعمال کے بعد (بعض پر استعمال سے پہلے ہی) ہوتا ہے۔ (دیکھو خُمریات)۔ اعتراف گناہ کر لیں۔ سوم۔ اُبھرتے ہوئے شعرا۔ ادبا۔ اور ناقدین میں تجسس کی لہر دوڑانے کے بعد ن نے اپنے بعض رازداں دوستوں کے ذریعے یہ افواہ پھیلا دی کہ نازش نبردازی جلد ہی ایسی شاعری کو مقامی حالات میں دریافت کرنے کا مظاہرہ کرے گا۔

مظاہرے کا وقت جوں جوں قریب آ رہا تھا نازش کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ تو اِس 'شاعرانہ Piece' کے عنوان کا تھا۔ عنوان اُس کے ذہن میں بہت

آتے تھے لیکن ایک سے ایک بڑھ کر غیر شاعرانہ اور غیر شریفانہ۔ مثلاً 'تلے ہوئے ریڈیو کا آخری سے پہلا نوحہ۔ ایک دن جھال رٹو ڈوگر میں ڈوبنے کے بعد۔ صنعت پکوڑہ سازی میں عریانی و فحاشی کے نئے خدشات و امکانات (اس عنوان کو ن نے فوراً آیندہ کبھی کی مضمون نگاری میں استعمال کے لیے محفوظ کر لیا)۔ غوطہ زن آوازوں کا تخیلاتی دنگل۔ لفظی کیڑوں مکوڑوں کی چند غیر شاعرانہ صف بندیاں۔ ان عنوانات کے ساتھ ایک اور مسئلہ یہ بھی تھا کہ اِن کی بے پناہ معنویت اُن کے اپنے سیاق و سباق کے تذکرے کی محتاج تھی جو کہ بوجوہ ممکن نہیں تھا۔ (بد) عنوانی تذبذب اور اضطراب کی یہ کیفیت مسلسل قائم رہی۔ حتیٰ کہ ادبی مجلس کے لیے گھر سے نکلنے اور راودکی سے شہر کے لیے بس پکڑنے کا وقت آ گیا۔ اور تب ن نے سوچا کہ بہت ہو گئی۔ اُس نے شاپ کے قریب ہی پکوڑے نکالتے کھادی سے پینسل لی اور جو کچھ بھی فوری طور پر ذہن میں آیا اُسے Piece کے اوپر عنوان کے طور پر لکھ دیا۔ پھر اُس نے عنوان کو دوبارہ دیکھا تو اُسے ایک گونا اطمینان ہوا اور حیرت بھی کہ اِسی قسم کا عنوان تو اُسے درکار تھا یعنی ___ گہری نیم تاریکی میں کیڑے مار شاعری کی قرعہ اندازی۔ لیکن پنسل کھادی کو واپس کرنے کے بعد جب اُس نے عنوان کو سہ بارہ دیکھا تو ایک گونا اطمینان کی بجائے دو تین گنا بے اطمینانی اُس پر حملہ آور ہونے کو بڑھی اور حیرت بھی دوبالا ہو گئی ن نے تیزی سے Piece تہ کر کے سفری تھیلے میں ڈال لیا۔ کھادی جو اُس کی ذہنی و جسمانی کیفیات کا پرانا نباض تھا ہنس کر بولا۔

'لگتا ہے باؤ آج پھر تمہیں کہیں سے 'پھنڈ' پڑی ہے۔'

آ۔ ابھی تو نہیں۔ لیکن 'Let's Hope'۔ نازش نے کہا اور بس پر سوار ہو گیا۔ عین ممکن تھا کہ نازش نبردازی کی یہ امید ادبی مجلس میں اپنی تحریر کا عنوان پڑھتے ہی بر آتی اور جس عمل کی طرف کھادی نے اشارہ کیا تھا اُس کی علمی و ادبی شکل نازش کو دکھانے کا اہتمام اُسی وقت کر لیا جاتا۔ لیکن اُس پہلے حملے کو اُس نے نہ صرف کامیابی سے پسپا کیا بلکہ اُسے اپنی قوت بنا لیا۔ ہوا یہ کہ عنوان 'گہری نیم تاریکی میں کیڑے مار شاعری کی قرعہ اندازی' کا عنوان سنتے ہی ایک صاحب نے جو پہلی نشستوں پر قریب ہی بیٹھے تھے۔ ''گہری نیم تاریکی' کو اُچک لیا۔ یاد رہے یہ صاحب سقہ (نظام سقہ؟) ادیبوں کی مطبوعات میں زبان و بیان۔ 'صرف و نحو' قواعد اور عام سادہ قسم کی فاش اور بقول اُن کے فحش غلطیاں نکالنے کی خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ اور حال ہی میں

دیوان غالب میں ایک غلطی کی نشان دہی کرنے اور کچھ عرصہ روپوش رہنے کے بعد منظر عام پر آئے تھے۔

'یہ گہری نیم تاریکی' کیا بلا ہے بھائی۔ یا تو نیم تاریکی ہوگی یا گہری تاریکی ہوگی۔ یہ تو آدھیپوری والی بات ہوگئی۔ حد ہے یعنی۔۔۔۔'' انہوں نے یک دم کڑک کر کہا۔

'لیکن آدھی پوری تو ہوتی ہے سر۔ ہاں بعض لوگ آدھی پوڑی کہہ لیتے ہیں' ایک صاحب نے کہا جس پر پیچھے بیٹھے کچھ لوگ ہنس پڑے۔

'ہاں جیسے آدھا نان۔ جسے عدنان بھی کہتے ہیں' کسی اور نے لقمہ لگایا اور کافی لوگ ہنس پڑے۔ نازش کو خطرہ ہوا کہ کہیں اُس کی شاعری پر بھی مزاح کا الزام نہ لگ جائے۔ پھر اُس کے اندر سے آواز آئی لگتا ہے تو لگے کچھ بھی ہو۔ لیکن پھر اُس نے فوری طور پر اپنا شدید ردعمل ظاہر کرنے کا فیصلہ کیا صاحب صدر آپ کی اجازت سے'؟ نازش نے دائیں بیٹھے صاحب صدر سے التجا کی۔ صاحب صدر درجہ دوم کے ملکی سطح پر معروف ادیب تھے اور غلطی مار خدائی فوجدار پروف ریڈر صاحب کے کئی بار کے ڈسے ہوئے تھے۔ انہوں نے فی الفور اجازت دے دی۔

'جناب والا گزارش یہ ہے' نازش نے کہنا شروع کیا 'کہ گو مجھے مداخلت کا حق نہیں شاید۔ لیکن شاید یہ حق ہے بھی۔ کیونکہ ابھی میں نے۔۔آ۔۔آ۔۔ وہ کیا کہیں گے یعنی۔ ابھی میں تو میں نے اپنی تحریر۔۔ میں اسے تحریر ہی کہوں گا کیونکہ ہو سکتا ہے بعد میں اِسے شاعری تسلیم کرنے میں کچھ لوگوں کو مشکلات پیش آئیں۔۔'

'ابھی سے ڈر ہے'۔ ایک ہلکی سی آواز آئی۔

'تو میں نے ابھی تو اپنی شاعرانہ تحریر پیش ہی نہیں کہ کہ تنقید کا آغاز بھی ہو گیا۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں'۔

'ہرگز مناسب نہیں'۔ صاحب صدر نے کنکھیوں سے اُن صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ یااللہ تیرا شکر ہے آج اِس منحوس کی طبیعت صاف کرنے کا موقع تو نے فراہم کر دیا۔ سچ ہے تو ہی آسانیاں فراہم کرنے والا ہے'۔ اس خاموش مناجات کے بعد انہوں نے گلا صاف کیا پھر پانی کا ایک گھونٹ لیا اور اپنا بیان شروع کیا 'جناب دراصل ہو یہ رہا ہے۔ کہ ہمارے ہاں کچھ لوگوں نے ادب عالیہ کو اغلاط نامہ ثابت کرنے کا کام

ٹھیکے پر لے لیا ہے۔ یہ لوگ جیسا کہ سب ٹھیکے دار ہوتے ہیں خود ہر قسم کی تخلیقی صلاحیتوں بلکہ میں تو کہوں گا تنقیدی صلاحیتوں سے بھی عاری ہیں۔ یہ لوگ مریضانہ سوچ کے مالک ہیں اور اس کی ایک واضح مثال میں یہ دوں گا۔ کبھی آپ نے انہیں دیکھا ہے یہ لوگ الفاظ کی تذکیر و تانیث میں کس شدت سے دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ شدت نارمل نہیں ہے۔ یہ کجروی کی ایک شکل ہے'۔

غلطی مار صاحب کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا 'آپ میری توہین کر رہے ہیں'۔ وہ گرجے اور صاحب نے چونک کر انہیں پہلی بار دیکھنے کی کامیاب ایکٹنگ کی۔

'جی۔ آپ نے کچھ فرمایا'

'آپ میری توہین کر رہے ہیں'۔

'میں نے کوئی توہین نہیں کی۔ میں نے ایک جنرل بات کی ہے'۔

'جنرل کہیے۔ انگریزی میں بھی نااہلی ثابت ہے ہنہ'

اس پر حاضرین مجلس میں ایک غلغلہ سا اٹھا۔ اور صاحب صدر کی بجائے لوگ مجلس کے سیکرٹری کو مخاطب کرنے لگے۔

'سیکرٹری صاحب۔ اگر اِس ادبی مجلس کو ذاتیات کا اکھاڑہ بنایا جائے گا تو کم از کم ہم آئندہ یہاں نہیں آئیں گے''۔ ہم سے اُن کی مراد وہ خود اور اُن کے دائیں بائیں بیٹھے اُن کے دو دوست تھے اور تینوں ادب ایک سنجیدہ کام ہے' کہ مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ کچھ حمایتی آوازیں اُٹھیں اور سیکرٹری صاحب نے صاحب صدر کے کان میں طویل کھسر پھسر شروع کر دی جس کا خاطر خواہ اثر صاحب صدر اور حاضرین دونوں پر ہوا۔ حاضرین خاموش ہو گئے اور صاحب صدر پُرسکون نظر آنے لگے اگرچہ 'غلطی نکال' صاحب کا اضطراب ابھی قائم نظر آتا تھا۔ پھر انہوں نے بھی اپنے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے سامنے رکھے پانی کے گلاس کو اٹھایا اور غٹ غٹ آدھا ہی پیا ہوگا کہ یک دم خیال آیا کہ یہ تو وہی پانی ہے جسے صاحب صدر پہلے ہی جُوٹھا کر چکے ہیں۔ انتہائی بدمزگی سے گلاس کو واپس میز پر پٹخا اور زیرِ لب بڑبڑائے 'گلاس۔ پانی بھی غلط۔ پانی بھی۔ صحیح نہیں'۔ اور سیکرٹری نے نازش کو اشارہ کیا کہ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر وہ پڑھنا شروع کرے۔ اور نازش نے یک لخت پڑھنا شروع کر دیا۔

کیا دے گیا کیا لے گیا
لو۔ پھر بازی لے گیا

ان الفاظ کو سُننے پر حاضرین میں سے ایک غیر متعین سی بھن اُٹھی جسے بھناہٹ رمی جسے ن نے کسی قسم کی قبولیت سمجھا اور مشاعروں کی دیرینہ روایات کے مطابق الفاظ پھر پڑھے یعنی جسے مقرر کیا جاتا ہے۔ نازش نبردازی کو یقین تھا کہ جب اُس نے اپنے Piece کا وہ واحد شعری حصہ تیسری بار پڑھنا شروع کیا یعنی 'کیا دے گیا کیا لے گیا' تو اُسے کہیں سے آتی ایک انتہائی فحش سرگوشی سنائی دی جو قطعاً غیر متعلق اور قدرے نامناسب انسانی امور کے بارے میں تھی۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ لیکن اس مرحلے پر نازش کی خاموشی صرف اُس سرگوشی کو نظر انداز کرنے کی کوشش ہی نہ تھی بلکہ اُس بندے کی خاموشی بھی تھی جو کسی خطرناک عملی مذاق کو 'عملی' کرنے سے ایک لمحہ پہلے ایک بار پھر سوچتا ہے" دیکھ لے۔ اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ جانتا ہے۔ اب بھی آخری موقع ہے بچ نکل۔ بھاگ جا۔" ن کے لیے بچ نکلنے کا آخری موقعہ بس اب یہ تھا کہ وہ بہانہ بنا سکتا تھا کہ بد قسمتی سے جو چیز اُس نے اصل میں پیش کرنی تھی وہ گھر بھول آیا ہے اور چونکہ وہ راوی کا رہنے والا ہے اس لیے تیزی سے بھاگ کر جا کر اصل چیز لا بھی نہیں سکتا۔ اس پر ظاہر ہے لوگ لعن طعن کرتے اپنے وقت کی بربادی کا گلہ کرتے اور کچھ بہت خوش ہوتے کہ اچھا ذلیل ہوا ہے۔ لیکن کم از کم وہ اُس فساد سے تو بچ جائے گا۔ جواب یقینی ہے کہ اُسی وقت شروع ہو جائے گا جب وہ قرعہ اندازی کے ذریعے منتخب الفاظ کا پہلا بنڈل کھولے گا۔ دے گیا لے گیا تو چلو پھر بھی کسی حد تک شاعری ہے اور اُس پر لوگ زیادہ سے زیادہ اُسی قسم کا ردعلم ظاہر کریں گے جیسا اُس سرگوشی میں کیا گیا لیکن عبارتی ٹکڑوں کی قرعہ اندازی! خدایا میں اِس وقت کہاں ہوں۔ جھال رٹو ڈوگر کے ٹھنڈے میٹھے پانی میں ڈوبا پکوڑا۔ لاطینی امریکہ۔ کھادی چھینجا بد بخت سب اُسی کی شرارت ہے۔ نازش نبردازی کو محسوس ہوا کہ وہ زمان و مکان میں تتر بتر ہو رہا ہے۔ اتنے میں آواز آئی 'ارشاد' اور وہ دہل گیا کیونکہ ذہنی ٹھنڈے پسینے آنے کی کیفیت کے باوجود وہ سمجھ گیا کہ اِس آواز کے ذریعے ارشاد نامی کسی شخص کو بلایا نہیں جا رہا بلکہ شاعرانہ زبان میں اُسے حکم دیا جا رہا تھا کہ اب بک بھی جو بکنا ہے۔ •

اتنے میں باہر سے رعد کی کڑک سنائی دی اور طوفان بادو باراں کا آغاز ہو گیا اس پر حاضرین کچھ زیادہ حیران تو نہ ہوئے کیونکہ سب ہی جانتے تھے کہ وہ جبر کے دور میں ساون بھادوں کا موسم تھا لیکن درپیش صورتحال سے اُن کی توجہ چند لمحوں کے لیے ہٹی ضرور اور اسی کیفیت میں ایک صاحب نے کہا۔

'صاحب صدر۔ ان صاحب نے جو لینا دینا ہے۔ وہ میرا مطلب ہے پیش کریں۔ بارش شروع ہو گئی ہے۔ تھوڑی دیر میں سڑکیں دریا بن جائیں گی، گھروں کو بھی جانا ہے۔'

نازش نبردازی نے یہی لفظ سُنا یعنی دریا (دَر۔ یَا) (ف) مذکر۔ بحر۔ ندی۔ پانی کی وہ دھار جو پہاڑ یا جھیل سے نکل کر خشکی پر کسی دوسرے (دریا یا سمندر میں جا ملے فیروزالغات) (دریا برآمد۔ دریا بُرد۔ دریا بُرد ہو جانا۔ دریا پر جانا اور پیاسے آنا۔ دریا چڑھنا۔ دریا دل۔ دریا دلی۔ دریا کوزے میں بند کرنا۔ دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر۔ دریائی۔ دریائی آدمی۔ دریائی گھوڑا۔ دریائی۔ نارجیل دریائے شور۔ (از فیروزِ لغات)___ تو اُسے اپنے آباء واجداد کی روحیں دکھائی دیں جن میں گھوڑوں کی روحیں بھی شامل تھی اور وہ سب مل ملا کر چیختی چلاتی ہنہناتی ایک طوفانی دریا پار کر رہی تھیں۔ اور نازش اب ایک مختلف انسان تھا۔

کیا دے گیا کیا لے گیا۔

لو۔ پھر بازی لے گیا۔ اُس نے کسی بادل کی طرح ہی کڑک کر کہا اور پھر لفظوں کے پہلے بنڈل میں سے عبارتی ٹکڑے بارش کے قطروں کی طرح برسانے لگا۔

سب سے بڑا اجتماع۔ اظہار تشویش۔ غیر یقینی صورت ختم۔ نتیجہ خیز بات چیت۔ عریانی و فحاشی۔ ٹکٹکی پر باندھ کر۔ جوش و جذبے سے منائی۔ سنگ بنیاد رکھا۔ پُرامن اور صحت مند فضا میں منعقد۔ خودسوزی کی کوشش ناکام۔۔ دوبارہ موقعہ دیا جائے گا۔۔۔۔۔

نازش نبردازی کے دریائی اجتماعی لاشعور کے شعور ہو جانے کا کرشمہ تھا (دیکھو روایت آباء واجداد نازش نبردازی) یا بارش کے نتیجے میں سڑکوں پر بہہ نکلنے والی دریائی رکاوٹوں کا کہ سامعین حاضرین کی حاضری Piece کے آخر تک برقرار رہی اور وقفوں وقفوں سے کیا دے گیا کیا لے گیا۔ لو۔ پھر بازی لے گیا۔ کی دہائی دیتا نازش اپنے بنڈلوں کے سب عبارتی ٹکڑے حاضرین کے کانوں پر برسانے میں کامیاب ہو گیا۔ واہیات ادبی کاوشوں پر ناک بھوں چڑھا کر

(دل میں گالیاں دے کر) ایک ایک کر کے اُٹھ جانے کا مروجہ طریقہ کار اور کامیاب ادبی ردِعمل موسمی حالات کی وجہ سے ناکام ہو چکا تھا۔ چنانچہ حاضرین انتہائی اضطراب کے عالم میں اُٹھ اُٹھ کر کھڑکیوں کی طرف جاتے تھے دھواں دھار بارش برستی دیکھتے تھے مگر پلٹتے تھے تو دھواں دھار برستے لفظوں کی لپیٹ میں آ جاتے تھے۔۔۔ ٹکٹکی پر باندھ کر۔ بعد میں ورثا کے حوالے کر دی گئیں۔ نافذ کر دیا جائے گا۔ اصولوں پر کوئی سمجھوتا۔ کروڑوں دلوں کی آواز۔ طول دینے کا کوئی موقع۔ تقدیر کا فیصلہ کون۔ اطلاع پہلے ہی مل گئی۔ باوثوق ذرائع۔ قبلہ سیدھا کرنے کی۔ مناسب وقت آنے پر۔ مثبت نتائج۔

اور یہی نازش کے آخری الفاظ بھی تھے۔ اُس نے کاغذات تہہ کر کے واپس اپنے سفری بیگ میں رکھ لیے اور بے ضرر سا منہ بنا کر اپنے آپ کو تنقید کے لیے مہیا کرنے والی نظروں سے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ کھڑکیوں میں سے باہر جھانک کر بارش رُکنے کا انتظار کرنے والے بھی خاموشی سُن کر واپس کرسیوں پر آنے لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے کرسیاں پھر بھر گئیں۔ اور نازش کیا دیکھتا ہے کہ قطار اندر قطار 'سرخ سرخ' آنکھوں کی جوڑیاں ہیں جو نواع و اقسام کے درندہ صفت بلکہ باقاعدہ درندوں کے چہروں میں لگی اُسے گھور رہی ہیں۔ لگڑ بگھے۔ بھیڑیے۔ شیر۔ چیتے۔ ریچھ۔ جنگلی بلے۔ مگر مچھ۔ لومڑ۔ سانپ وغیرہ وغیرہ۔ اس ایک لمحے میں جس کے بعد وہ پھر سے شاعر۔ ادیب۔ افسانہ نگار۔ نقاد۔ مضمون نگار۔ نظر آنے لگے۔ نازش نے شک کیا کہ کانوں اور آنکھوں کے بعد اب اُس کا دماغ بھی جواب دینے لگا ہے اور وہ مرض، التباس کا شکار ہو رہا ہے۔

لیکن دنیا اب شک سے یقین کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور وہ ایک آواز آئی جو اُن صاحب کی تھی جو ادبی مجلس میں کوئی بھی چیز پیش ہونے کے بعد پہلا وار کرنے کی شہرت رکھتے تھے اور ہر کوئی کچھ کہنے سے پہلے منتظر ہوتا تھا کہ وہ بولیں اور بول چکیں تو وہ بولیں۔ اور وہ بولے۔

'جناب والا۔ ابھی اِن صاحب نے جو کچھ یہاں کیا ہے۔ ہمارے ساتھ کیا ہے بلکہ میں تو کہوں گا کرایا۔ کروایا گیا۔ اُس کے آخر میں جب یہ کر چکے تھے تو دو آوازیں مجھے آئیں۔ مناسب وقت آنے پر۔ اور مثبت نتائج۔ صاحب صدر مثبت نتائج کی یقین دہانی تو میں نہیں کرا

سکتا۔ لیکن جناب والا مناسب وقت ضرور آ گیا ہے۔ کس چیز کا؟ وہ تو میں بعد میں عرض کروں گا پہلے میں اپنا شک رفع کرنا چاہتا ہوں، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آج کونسی تاریخ ہے۔

اس عجیب و غریب سوال پر حاضرین ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے چند ایک ہنسے اور چند دوسروں نے مختلف تاریخیں بتائیں۔ ابھی کسی تاریخ پر اتفاق رائے ہونا باقی تھا کہ ایک دوسرے صاحب گرجے اور اُن کا گرجنا بھی ادبی مجلس کی روایت کے مطابق تھا کہ وہ ہمیشہ پہلا وار کرنے والے پر جوابی وار کرتے تھے اور اکثر بہت شدید کرتے تھے۔

'صاحب صدر۔ یہ ڈرامے بازی بند کرائی جائے۔ پہلے ہی بہت ڈرامے بازی ہو چکی ہے۔ کیا انھیں نہیں پتہ آج کیا تاریخ ہے۔ آخر یہ آج کی تاریخ سے کیا نکالنا چاہتے ہیں۔ صاحب صدر ہر تاریخ ہی دوسری تاریخ جیسی ہے اس لیے کہ تاریخ مردہ ہو چکی ہے۔ ہم جس دور۔ مجھے کہنے کی اجازت دیجیے (اجازت ہے۔ اجازت ہے کی آوازیں سنی گئیں) جبر کے جس دور سے گزر رہے ہیں۔ اُس میں وقت تھم گیا ہے۔ ساعتیں بے وقعت بلکہ بے وقت ہو گئی ہیں۔ لمحے بانجھ ہو گئے ہیں۔ گھڑیاں گم ہو رہی ہیں (چند روز پہلے ہی ان صاحب کی قیمتی گھڑی گم ہو گئی تھی)۔ حساس لوگوں کے لیے زندگی ایک جیتا جاگتا جہنم بن چکی ہے۔ اس وقت جب کہ ہر طرف کوڑے لگ رہے ہیں۔ پھانسیاں دی جا رہی ہیں۔ آزادیاں سلب کی جا رہی ہیں۔ جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ صاحب صدر (یہاں اُن صاحب نے اپنے قریب بیٹھے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو بار بار اُن کے کان میں کچھ کہنے کی کوشش کرتا تھا) مجھے خاموش رہنے کا مشورہ دیا جا رہا ہے کہا جا رہا ہے کہ ایجنسی کے لوگ بیٹھے ہیں مارے جاؤ گے۔ لیکن میں خاموش نہیں رہوں گا۔ تو صاحب صدر ایک طرف ہماری جان کو خطرہ ہے ادب۔ ثقافت پر عریانی اور فحاشی کا الزام لگایا جا رہا ہے اور ہمیں واپس دھکیلا جا رہا ہے۔ کہاں واپس دھکیلا جا رہا ہے۔ (یہاں نازش کو پھر شک پڑا کہ اُس نے ویسی ہی فحش سرگوشی پھر سنی ہے۔ لیکن پہلے وار پر جوابی وار کرنے والے صاحب ابھی پُر جوش بول رہے تھے۔ وہ تیزی سے واپس متوجہ ہوا)۔

''تو جناب والا جہاں یہ ڈرامہ چل رہا ہے وہاں یہ صاحب 'آج کی تاریخ کیا ہے' کا کیا ڈرامہ کرنا چاہتے ہیں۔ کیا۔۔ آ۔۔ کیا کی آ پر ضرورت سے زیادہ زور ڈالنے پر وہ صاحب کھانسیوں کا شکار ہوئے تو صاحب صدر کو صدارتی مداخلت کا موقع مل گیا۔

'آ۔۔ میرا خیال ہے ہمیں اب جو تحریر پیش کی گئی ہے اُس پر گہری توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ میرا خیال ہے اب تک کی پر جوش بحث سے ایک بات تو واضح ہو گئی ہے کہ پیش کردہ تحریر درحقیقت ڈرامے کی ایک شکل ہے۔ اگرچہ ادبی مجلس میں ڈرامہ پڑھ کر سنانے کی کوئی ایسی روایت نہیں لیکن میں انتظامیہ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے ایک نئی روایت شروع کی۔ باقی میں اپنے عاجزانہ خیالات کا اظہار آخر میں کروں گا۔ جی جناب۔

پہلے وار والے پھر بولے۔'میرا سوال اب بھی قائم ہے۔ آج کیا تاریخ ہے؟' اور پھر باقاعدہ بحث کا آغاز ہو گیا۔ اور کئی لوگ ٹوٹ پڑے۔

'صاحب صدر درحقیقت پوچھا یہ نہیں جا رہا کہ آج کیا تاریخ ہے بلکہ آج کی تاریخ کیا ہے؟ تاریخ صرف ماضی کا معاملہ نہیں بلکہ حال اور مستقبل کا معاملہ بھی ہے۔ یعنی آج ہم تاریخ کے کس نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ اب یہی صاحب صدر یہی تاریخ اور ڈرامے میں تعلق قائم ہوتا ہے واضح ہوتا ہے یعنی۔ جیسا آپ نے خود فرمایا۔

پہلے وار والے کافی خوش نظر آنے لگے'میں دراصل پوچھنا چاہتا تھا کہ کہیں آج ماہ اپریل کی پہلی تاریخ تو نہیں۔ لیکن اب چونکہ بحث بہت عمدہ خطوط پر چل نکلی ہے اس لیے میں مزید استفسار نہیں کروں گا۔ ایک اور صاحب بولے جو اپنی بات کا آغاز 'انہیں کی بات آگے بڑھاتے ہوئے' یا 'یہاں کہا گیا' جیسے الفاظ سے کرتے تھے۔'جناب والا آپ کی اجازت سے کچھ گزارش کرنا چاہوں گا۔ یہاں کیا گیا کچھ تاریخ اور ڈرامے کے تعلق کے بارے میں۔ تو حقیقت یہ ہے کہ جہاں ڈرامے کی ایک تاریخ ہے وہاں تاریخ کا بھی ایک ڈرامہ ہے۔ انہیں کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے صاحب صدر گھمبیر صورتحال اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب تاریخ کے ڈرامے کو ڈرامے کی تاریخ میں کوئی مقام دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ ایک سنگین ادبی غلطی ہے جناب والا کیونکہ اس کے نتیجے میں ادبی اصناف اپنی پہچان کھونے لگتی ہیں۔ نثر نظم بننے لگتی ہے۔ اور نظم نثر۔ افسانے پر غزل کا گمان ہوتا اور شاعری ڈرامہ بازی بن جاتی ہے۔ اور یہی آج اس تحریر میں۔۔۔'

"صاحب صدر اِن سے کہیں ذرا مختصر کہیں۔ کریں۔۔"

"آ۔۔ ذرا۔۔ مُخ۔۔"

'کہہ دیا بھائی۔ کر دیا۔ اِس سے آگے آپ بات کو کہیں لے جا سکتے ہیں تو لے جائیں۔ ویسے میرا چیلنج ہے بات ختم ہو چکی ہے۔'

'صاحب بات ختم نہیں ہوئی۔ بات ڈرامے کی ہو رہی ہے اور یہ بات اُس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک کہ کرداروں کی نشان دہی نہ کی جائے۔ اُن کی ذہنی ساخت اُن کے موضوعی محرکات پر بات نہ کی جائے۔ پھر آگے بات پلاٹ۔ تصادم اور کلائمکس کی ہوگی۔ مگر ابھی تو کرداروں کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔۔" صاحب صدر نے اتفاق کیا۔

"میں عرض کرتا ہوں کہ کردار بالکل سامنے ہیں۔ اگر اِن کو نظر نہ آئے ہوں تو الگ بات ہے۔ آپ۔ میں اب اُس لائین کی طرف اشارہ کروں گا۔ جو ڈرامے میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔"کیا دے گیا۔ کیا لے گیا۔" لو۔ پھر بازی لے گیا۔ کرداروں کی نشان دہی یہیں ہوتی ہے۔ پہلا کردار۔'کیا' ہے جو کچھ دیتا ہے۔ دوسرا کردار 'کیا' کا ہم نام یعنی پھر 'کیا' ہے۔ آپ اسے سہولت کے لیے 'کیا' نمبر 1۔ اور 'کیا' نمبر 2 کہہ لیں۔ یہ 'کیا' نمبر 2۔ کچھ لیتا ہے یہی ڈرامائی تصادم کی صورتحال ہے صاحب صدر۔ لیکن ہیرو یا مرکزی کردار کہہ لیں۔ وہ 'لو' ہے یعنی اُس کا نام 'لو' ہے۔ آخر میں 'لو' نامی نوجوان ہی کامیاب ہوتا ہے اور 'بازی' کو جو کہ ظاہر ہے ایک نسوانی کردار ہے اپنے ہمراہ لے جاتا ہے۔ تو ڈرامہ بظاہر روائتی کرداری جماعت بندی کے اصولوں کی نفی نہیں کرتا لیکن مکالمات میں۔ اور یہاں صاحب صدر میں ڈرامہ نگار کی اُپج کی داد دوں گا۔ کہ انھوں نے روائتی مکالموں کی بجائے۔ انتہائی مختصر لفظی مکالمے کا استعمال کیا ہے۔ یہ ڈرامہ بہت کامیاب رہا ہے اور ایک نیا اسلوب ساتھ لے کر آیا ہے۔ اور جو پیغام ہمیں اس سے ملتا ہے وہ یہ ہے کہ جب کہ شر کے نمائندوں کی حیثیت سے 'کیا' نمبر 1 اور 'کیا' نمبر 2 بُرائی کی لین دین میں مصروف ہیں وہ بُرائی کیا ہے۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مجسم خیر 'لو' 'بازی' نامی خاتون کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ دونوں باقاعدہ قانونی طور پر رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں اور یوں حق کا بول بالا ہوتا ہے۔"

اتنے میں پچھلی کرسیوں میں پھر بے چینی کی ایک لہر دوڑی اور پھر حاضرین پہلے کھڑکیوں اور پھر دروازے کا رُخ کرنے لگے۔ اتنے میں ایک شخص نے مجلس کے سیکرٹری کے

کان میں کچھ کھسر پھسر کی اور سیکرٹری نے کھسر پھسر آگے صاحب صدر کے کان میں منتقل کرنے کے لیے اشارے سے اُن کا کان قریب منگوایا مگر پہلی کوشش میں ابلاغ ممکن نہ ہوا تو صاحب صدر نے اپنی ٹوپی اتار کر کان پھر آواز کے لیے مہیا کیا۔ صورت حال کی تمام گھمبیرتا کے باوجود نازش کے ذہن میں سوال اُبھرا کہ اگر ان کا یہ کان اب سرگوشی کے لیے کام نہیں کر رہا تو محفل کے آغاز میں کیسے کر گیا۔ لیکن پھر اُس نے سرگوشی سُننے نہ سُننے کو شخصی آزادیوں کے کھاتے میں ڈال کر معاملہ ٹھپ کر دیا اور شخص بھی وہ صاحب صدر ہے۔ اُدھر سیکرٹری حیران ہوا کہ کھسر پھسر کو سُن لینے کی بجائے وہ پھر اپنے دائیں ہاتھ کو ڈگڈگی بجانے کے انداز میں ہلا رہے ہیں اور یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اب بھی وہ سُن نہیں سکے۔ لیکن پھر وہ خود ہی ہنس پڑے۔ 'معاف کیجئے گا مجھے بالکل یاد نہیں رہا تھا' اس کے ساتھ ہی انہوں نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی جوڑ کر چٹکی سی بنائی اور کوئی ڈیڑھ انچ لمبا روئی کا پھونگا کان سے باہر نکال لیا۔ فضا میں سپرٹ اور عطر گلاب کی خوشبو پھیل گئی ___ سرگوشی اس بار کامیاب رہی اور صاحب صدر بھر پور اتفاق رائے کے انداز میں سر ہلاتے رہے۔ اور پھر اپنی رائے کے 'کھسر پھسری' اظہار کی باری لینے کے لیے انہوں نے جواباً سیکرٹری کے کان کی طرف رجوع کیا۔ سیکرٹری ہنس پڑے اور فوراً پھر صاحب صدر کے کان کی خواہش ظاہر کی۔ جو پوری کی گئی۔ یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا اور اسی دوران ادبی مجلس کے حاضرین کی کثیر تعداد رخصت ہوگئی۔ اب کی بار صاحب صدر نے سیکرٹری صاحب کی رائے سے اتنا شدید اتفاق رائے کیا کہ روئی کا پھونگا اُن کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔ پھر سیکرٹری۔ نازش۔ صاحب صدر خود اور پہلے دوسرے وار والے۔ کرسیوں کے نیچے پھونگا ڈھونڈنے لگے۔ جو بالآخر نازش نے پڑا دیکھ لیا لیکن کراہت کے سبب خود اٹھانے کی بجائے صاحب صدر کی توجہ اُدھر مبذول کرا دی۔ انھوں نے شکریے کے ساتھ اٹھا کر اُسے واپس کان میں ٹھونسا اور اعلان کیا۔

''ہاں۔ وہ یاد آیا۔ معزز حاضرین آج کا اجلاس ختم سمجھیں'' ادبی مجلس کی ایک اور روایت کے مطابق مجالس کے بعد ادبی تخلیق پیش کرنے والے اور تخلیق پر داد دینے والے تخلیق کار سے جوابی داد لینے کے لیے ایک قریبی چائے کے کھوکھے پر اکٹھے ہوتے تھے۔ اُس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ نازش نبرد ازی سے داد پر داد کے امیدوار تین تھے نازش نے فیصلہ کیا کہ تینوں کو بھگتانے کی بجائے وہ صرف اُس حقیقتاً قابل تعریف نقاد کو داد دے گا جو اُس کی تحریر کی اصل روح

تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ویسے بھی اُسے راوی کے لیے بس بھی پکڑنی ہے جو خراب موسم میں زیادہ رات گئے اکثر نہیں بھی ملتی چنانچہ اُس نے چائے کے دوران اُسے مخاطب کیا۔

''حسن دین صاحب حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ آج موجود نہ ہوتے تو میرا عاجزانہ ڈرامہ صفر ابلاغ کا شکار ہو جاتا۔ لیکن جس طرح آپ نے کرداروں کی نشان دہی کی اور اُن کے درمیان موجود اصل Conflict کو جیسے آپ سامنے لائے وہ کچھ آپ کا ہی حصہ ہے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر آپ نے جس طرح 'کیا'۔'کیا'۔'لو' اور 'بازی' کے درمیان مکالمات کے نئے اسلوب کو نہ صرف سمجھ لیا بلکہ اُسے حاضرین کو سمجھا بھی دیا۔ جناب کمال ہے۔''

'شرمندہ کرتے ہیں۔ کمال تو آپ کا ہے۔ ہم تو صرف سمجھنے والے ہیں۔ قاری ہیں۔ خالق تو آپ ہیں۔ فن ڈرامہ نگاری میں ایک بالکل نئے انداز کی داغ بیل تو آپ نے ڈالی ہے۔'

نازش نے کچھ عاجزانہ سی آوازیں حلق سے نکالیں۔ ''پھر بھی جناب اگر تحریر لوگوں کے سروں کے اوپر سے ہی گزر جائے تو کیا فائدہ۔ اگر سر آپ جیسے گہری نظر اور بے پناہ علم رکھنے والے ناقدین نہ ہوں تو ادیب بس اپنی تحریروں کو لیے بیٹھے رہیں۔''

'آ۔۔۔ اب میں کیا عرض کروں جناب۔ لیکن خالص ادب اور خالص تنقید کے درمیان ایک نئے رشتے کی طرف جناب اشارہ کر رہے ہیں آپ۔ یہ بات ابھی آگے چلے گی۔ میرا خیال ہے چائے کا ایک دور اور ہو جائے۔'

چائے کا پھر آرڈر دیا گیا لیکن نازش نے دل ہی دل میں دعا کی کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن اُسے وہاں سے نجات ملے تا کہ وہ وقت پر راوی کی بس پکڑ سکے۔ اچانک ایک چندھیا دینے والی روشنی کے ساتھ ایک زبردست کڑاکے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر ہر طرف شور مچ گیا کہ جس عمارت میں تھوڑی دیر پہلے ادبی مجلس کا اجلاس ہو رہا تھا اُس پر بجلی گری ہے۔ لوگ اُدھر بھاگنے لگے تو نازش نے سوچا بس اب موقع ہے کہ وہ لاری اڈے کی طرف بھاگے اُس نے گہری نظر والے اور 'کیا'، 'کیا' پہچاننے والے نقاد کے ساتھ ساتھ تھوڑی دور بھاگتے ہوئے اپنی مجبوری بیان کی۔

'کوئی بات نہیں نازش صاحب۔ آپ نکلیں۔ مجھے لگتا ہے سیکرٹری صاحب اور صاحب صدر ابھی وہیں تھے۔ لیکن کوئی بات نہیں کل اخباروں میں آ جائے گا۔ راوی کی اخبار تو

پہنچے ہوں گے۔'

'جی۔ پہلا ایڈیشن پہنچتا ہے۔'

'ڈاک ایڈیشن' وہ رک گئے۔

'جی'

'پھر تو اُس میں سیکرٹری صاحب اور صاحب صدر کے الم ناک انجام کی خبر نہیں ہوگی۔'

یہ تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا'۔

'جی مسئلہ تو ہے'

'اچھا۔ ایسا کریں۔ لاری اڈے پہنچنے سے پہلے اپنے پسندیدہ اخبار کے دفتر پہنچ جائیں۔ وہاں سے آخری ایڈیشن لے کر ہی جائیں'۔

'جی میں ایسا ہی کروں گا' نازش نے انھیں یقین دلایا اور وہ صاحب پھر بھاگ اٹھے۔

تب نازش کو یاد آیا کہ وہ اپنا سفری بیگ تو کھوکھے پر ہی بھول آیا ہے۔ بھاگم بھاگ واپس پہنچا تو بیگ غائب۔ ہاتھ ٹھنڈے ہو گئے پھر پاؤں بھی ٹھنڈے ہونے ہی والے تھے کہ دائیں طرف اندھیرے میں سے ایک ہاتھ بیگ تھامے نمودار ہوا۔ ہاتھ کے ساتھ ایک بازو اور پھر ایک طویل قامت سیاہ فام بندہ منسلک تھا۔

'آپ غالباً اپنا بیگ ڈھونڈ رہے ہیں'۔ اُس نے کہا۔

'جج۔ جی'۔ نازش نے سہم کر کہا۔

'میرا نام یعقوب دلاور ہے' اُس نے بیگ تھموانے کے بعد تعارف کروایا 'میں ٹیلی ویژن میں ڈرامہ پروڈیوسر ہوں'۔ (جاری)

خط بنام روشن خیالی نائب مدیر ادبی مجلّہ دروغ بگردنِ راوی' از طرف راقم۔

ہاں خیالی السلام وعلیکم۔

تم حیران تو ہوگے اور بیزار بھی (اگرچہ یہ کوئی نئی بات نہیں) کہ یہ پھر آ گیا۔ ابھی ہفتہ پہلے ہی تو ملاقات ہوئی ہے۔ اتنی جلدی خط داغ دینے کی کیا مصیبت آئی ہے۔

تو حقیقت یہ ہے روشن دین کہ مصیبت ہی آئی ہے۔ اور اُسی تحریر کے حوالے سے پھر

آئی ہے جو ہمارے درمیان بقول تمہارے 'بھرپور ڈسکس' ہوئی تھی یعنی 'نازش نبرد آزمی نے افسانہ نگاری کے میدان میں سر نکالنا ہی شروع کیا تھا'۔۔۔ سے لے کر۔۔ 'میں ٹیلی ویژن میں ڈرامہ پروڈیوسر ہوں' تک۔ تمھیں یاد ہوگا کہ تمہارے سات ضرب دس کے دفتر میں بیٹھ کر جو دفتر سے زیادہ ٹیلی فون بوتھ لگتا تھا___ ہم نے تحریر کو قابل اشاعت بنانے کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کیا تھا۔ اب مجھے۔۔۔ جبکہ تم سے اور اُس میٹنگ سے مکانی اور زمانی بُعد میں اضافہ ہوا ہے تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ سارے فساد کی جڑ یہ تمہارا قابل اشاعت بنانے کا چکر ہی ہے'۔ خیر اس پر میں بعد میں آؤں گا۔

تم نے تحریر کی پہلی خواندگی (یعنی سُنائی پڑھائی۔ کہ میں پڑھتا گیا اور تم سُنتے گئے جیسا کہ ادبی مجلس میں بھی ہوتا ہے) پر اُس میں سے ایک سو چھتیس غلطیاں نکالی تھیں۔ ہاں ہاں تمھیں اندازہ نہیں ہوگا لیکن میں ایک ہاتھ میز کے نیچے کر کے انگلیوں پر گن رہا تھا۔ بعد میں میں نے اُن میں سے ایک سو بتیس نکال کر تمھیں واپس کیں اور تم شرمندہ بھی ہوئے اور یہ وہ عمل ہے جو کبھی تمہاری ترجیحات میں شامل نہیں رہا۔ بہرحال تمھیں تعداد یاد نہ بھی ہو لیکن میں نے ثابت کیا تھا کہ وہ ایک سو بتیس غلطیاں دراصل 'جبر کے دور میں ہمارے ادیب کا کردار کیا ہوتا ہے' کہ نازک موضوع پر لکھی میری تحریر۔ (لیکن یہ تحریر تحریر کی کیا رٹ لگی ہے۔ افسانہ ہاں میں اُسے افسانہ ہی کہوں گا۔) افسانے پر تمہارے چھ بنیادی اعتراضات کی ہی مختلف بھونڈی شکلیں تھیں یعنی اعتراضات سے بھی زیادہ بھونڈی۔ اور وہ اعتراضات جو تھے وہ بھی میں نے ایک ایک کر کے تمھارے سامنے پیش کر دیے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے یہ اُس وقت ہوا تھا یعنی اُس کے بعد ہوا تھا۔ جب میری نظر ایک بار پھر تمھارے ٹیلی فون بوتھ نما دفتر میں ایک طرف رکھے دو ٹائروں پر پڑی تھی اور فطری تجسس سے مجبور ہو کر آخر تم سے پوچھ ہی لیا تھا کہ ہم دونوں کے علاوہ وہ دونوں ٹائر وہاں کیا کر رہے ہیں۔ اس پر تم نے اپنی طرف سے بڑی پُر مزاح بات کہی کہ یہ دنوں اصل میں زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ پھر خود ہی اپنی بات پر ہنس کر تم نے غالباً ہزارویں مرتبہ پھر مجھ سے پوچھا کہ میں شادی کب کر رہا ہوں۔ (پتہ نہیں میری شادی کی میرے بجائے تمھیں کیا آگ لگی ہوئی ہے۔) میں نے تمہاری توجہ اس صورتحال کی طرف مبذول کرائی کہ فی زمانہ دو پہیوں والی گاڑی کا استعمال شروع کرنا خوامخواہ محروم طبقات میں جا گھسنے کے

مترادف ہے چار پہیوں (اور وہ بھی بڑے ٹائروں والی) گاڑی کی بات کرو۔ تم نے مکمل اتفاق کیا لیکن پھر یہ واضح نہ ہوتا تھا کہ چار پہیوں والی گاڑی کا شادی کی صورتحال پر کیسے اطلاق کیا جائے گا۔ یہیں پر تمھارا ذہن پراگندگی کا شکار ہوا اور تم کافی دیر تک کچھ ایسے ممنوعہ موضوعات پر اظہار خیال کرتے رہے جن کا خاتمہ بعض 'عدم احتیاطیوں' کی صورت میں ٹکٹکی پر بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے بھی خدا جانے کیوں تمھیں تمھاری خرافات سے باز رکھنے کی کوشش نہ کی غالباً میں اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ جبر کے دور نے تمہارے ذہن کو آخر اِس مخصوص بلکہ مخصوصہ حوالے سے ہی کیوں متاثر کیا ہے۔ اور کچھ وجوہات میرے ذہن میں آئی بھی تھیں جو اُس وقت تو میں نے پیش نہیں کی تھیں لیکن اب کر دیتا ہوں تاریخ بتاتی ہے کہ جبر کے ادوار میں آبادی میں اضافے کی شرح بجائے کم ہونے کے بڑھ جاتی ہے اور اس عمل میں اکثر تمھارے جیسے افراد ہی ملوث پائے جاتے ہیں۔ میرا ایک نیم سائنسی مفروضہ یہ بھی ہے کہ جبر کے دور میں لوگوں کے جسمانی وزن میں اضافے کی شرح بھی بڑھ جاتی ہے۔ بسیار خوری جبر کے خلاف ایک کامیاب غیر ادبی مزاحمتی کارروائی ہے۔

یہ ایک دلچسپ موضوع۔۔۔ لیکن لاحول ولا قوۃ میں پھر بے کار کی بحث میں الجھ گیا۔ میں نے دیکھا ہے کہ کچھ لوگ اپنی عدم موجودگی میں بھی دوسروں کا وقت برباد کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں اور تم اُن میں سرفہرست ہو۔

پتہ نہیں بات کہاں سے پٹڑی سے اُتری تھی۔ ہاں۔ اُس ٹائروں کی عریانی و فحاشی کے سیشن کے بعد جس کے بعد تم نے تیسری دفعہ پھر مجھ سے چائے منگوائی تھی اور بہانہ وہی تھا کہ ہزار کا کھلا چائے لانے والے چھوٹے کے پاس نہیں۔ لیکن اللہ مجھے معاف کرے کیونکہ میں ابھی تمھیں اتنا گھٹیا نہیں سمجھتا مجھے یہ شک ضرور پڑا تھا کہ تم نے چھوٹے کو آنکھ ماری ہے اور وہ شیطان معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے اس کی وجہ اُس سے بُری ہو جو میں سمجھ رہا ہوں۔ شک شیطان کا آزمودہ ہتھیار ہے جس کی کامیابی پر شیطان کو کبھی شک نہیں ہوا۔ اس سے بچنا چاہیے خصوصاً دوستوں کے حوالے سے جن پر بہرحال چائے کے ہزاروں کپ قربان کیے جاسکتے ہیں۔ (انڈ ھیلے لکھنے لگا تھا)۔

تو خیر۔ اس چائے کے بعد ہم پھر افسانے کو 'قابل اشاعت' بنانے کی طرف متوجہ

ہوئے تھے اور میں نے صاف صاف بتایا تھا کہ دراصل تمھیں صرف چھ اعتراضات ہیں اور جو کسی لگی لپٹی کے بغیر یہ ہیں۔

1- یہ کس قسم کی بکواس ہے؟
2- تم (یعنی راقم) اِس تحریر کے ذریعے کس کو بیوقوف بنانا چاہتے ہو؟
3- یہ تحریر لکھنے والے کی کس قسم کی ذہنی بیماری کی نشان دہی کرتی ہے؟
4- اگر یہ تحریر جبر کے دور میں جوں کی توں چھپ جائے تو کس قسم کے ادبی۔ ثقافتی۔ اور غیر سائنسی ردِعمل کا خدشہ ہے؟
5- اگر اس تحریر کو چھاپنے سے اجتناب کیا جائے تو ادب۔ معاشرہ اور خود ادیب کس قسم کی محرومی کا شکار ہوگا؟
6- تمہارا (یعنی میرا) اصل مسئلہ کیا ہے؟

تمھیں یاد ہوگا اگر یاد نہیں بھی تو بھی یاد کرنے کی کوشش کرو کہ میں نے تمھارے ان چھ کے چھ اعتراضات کے معقول سے لے کر منہ توڑ تک جوابات دے دیے تھے۔ جو کچھ اس طرح تھے۔

1- بکواس صرف بکواس ہوتی ہے اس کی قسمیں آج تک دریافت نہیں ہوسکیں حالانکہ تمھارے جیسے کچھ لوگوں نے ہر عہد میں (بشمول جبر کے دور) اس کی قسمیں ڈھونڈ نکالنے کی سرتوڑ کوششیں کیں لیکن بعد میں اُن کی کوششیں اور اُن کا حاصل بذاتِ خود بکواس قرار پایا۔ اس لیے یہ سوال یا اعتراض اصل میں کیا ہے تم خود سوچ لو۔

2- بیوقوف اُسے ہی بنانا چاہیے جو بیوقوف بننے کا اہل ہو۔ اور راقم کی حقیر رائے میں بنی نوع انسان میں اس اہلیت کی کبھی کمی نہیں رہی۔ چنانچہ بیوقوف بنانے کی خواہش میں 'کس تس' کی تخصیص بیوقوف بننے سے پہلے ہی بے وقوفی کی بات کرنے کے مترادف ہے (جو کچھ تمھارا ہی حصہ ہے) یوں بھی ادب پیارے خیالی صاحب انسانیت کو مخاطب کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے تم سمجھ ہی گئے ہوگے۔

3- تحریر یعنی جس طرح کی تحریر کی تم بات کر رہے ہو بذاتِ خود ایک ذہنی بیماری ہے اور یہ اپنے سے آگے مزید کسی ذہنی بیماری کی نشان دہی نہیں کرتی ہاں البتہ اس کی

موجودگی میں کچھ اہم جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہونے کا خدشہ ضرور بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً تپ دق۔ مرجع المفاصل۔ السر۔ دائمی قبض یا اسہال (دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کیا جائے۔) کثرت بول بمعہ قلت نوم۔ فشارخون بالائی۔ ہارٹ بائی پاس (ادب میں دن بدن پاپولر ہوتا جا رہا ہے۔ بظاہر امراض قلب کا علاج گروانا جاتا ہے۔ لیکن اب بذاتِ خود ایک منفرد مرض کی حیثیت اختیار کر چکا ہے)۔ سن سٹروک (صرف موسم سرما میں)۔ سادہ چوٹیں ضربیں اور رگڑیں (خصوصاً ٹھوکریں کھانے کے ایام میں)۔ اس کے علاوہ 'تحریز' کی ذہنی بیماری سے کچھ اخلاقی بلکہ غیر اخلاقی امراض بھی پیدا ہوتے ہیں مثلاً حسد۔ کینہ۔ اُدھار۔ کم ظرفی۔ سگریٹ نوشی بذریعہ غیر ملکیتی ڈبیا جات۔ چھچھورا پن۔ احساس برتری یعنی کم تری۔۔۔ صفائی ناپسندی وغیرہ وغیرہ۔۔۔ لیکن پیارے روشن خیالی اس بارے میں میری زبان نہ ہی کھلواؤ۔ ویسے بھی تم سے بہتر کون جانتا ہے۔

4- تم نے پوچھا ہے کہ اِس تحریر کے چھپنے کی صورت میں کیا غیر سائنسی ردّعمل (یعنی ادبی ردّعمل) ہوگا۔ تو پہلے سائنسی ردّعمل تو جان لو۔ اس کے لیے۔۔۔ ویسے تو آٹھویں جماعت کا طالب علم بھی جانتا ہے۔ لیکن تمھیں پھر بھی بتا دیتا ہوں کہ نیوٹن نامی ایک سائنس دان کے بنائے تیسرے کُلیے کی طرف رجوع کرو۔ کیونکہ یہ عمل۔ ردّعمل کا سارا کھڑاک اُسی کا پھیلایا ہوا ہے اُس سے پہلے صرف عمل ہوتا تھا۔ اور اُسی پر انسان عمل کرتے تھے۔ اور یہ بات اب بھی صحیح ہے ورنہ کہا جاتا۔ ردّعمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔۔۔ چنانچہ عمل پر عمل کرو۔ یعنی اس افسانے کو جوں کا توں چھپنے دو۔

5- یہی سوال اصل میں فساد کی جڑ ہے اور یہ خط لکھنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ میں جس طرح تم نے اِس سوال کا سہارا لے کر اُس دن میرے ساتھ جو اصل میں ہاتھ کیا اُسے بے نقاب کروں۔ چنانچہ اِس کی طرف میں بعد میں آؤں گا۔ (5-جاری رہے گا)

6- میرا اصل مسئلہ کیا ہے؟ کم از کم وہ نہیں جس کی طرف تم اکثر اشارے کرتے رہتے

ہو۔ یعنی شادی میرا مسئلہ نہیں۔

بقیہ جواب سوال نمبر 5۔۔۔ ہاں جی اب آؤ تم اصل بات کی طرف۔ مذکورہ پانچواں جواب پا کر تم لاجواب تو ہوئے لیکن پھر میں نے دیکھا کہ تم پر کچھ رقت سی طاری ہوگئی ہے اس پر بچی بات ہے مجھے کچھ خفت سی ہوئی کہ آخر ایک دوست کو اتنے منہ توڑ جواب دینے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ لیکن پھر تم نے وضاحت کی کہ تمھیں دراصل اس تحریر کے نہ چھپنے کے بعد اپنے عزیز دوست یعنی 'میں' یعنی راقم پر طاری ہونے والے محرومی کے احساس پر رونا آ رہا ہے۔

یہ تمہارا ایک کامیاب آغاز تھا کیونکہ اک دم سے میرا دل انسانیت کی لازوال قدروں سے لبریز ہوگیا اور تمہارے بارے میں جو غیر مناسب جذبات اکثر دل میں جاگزیں رہتے تھے (اور اب پھر ہیں) اُن پر اپنے آپ کو لعنت ملامت کی۔ اور ابھی میرے ساتھ یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ تم نے ایک پُرسوز تقریر شروع کر دی جس کا عنوان ہونا چاہیے تھا 'نہ چھپنے والے شاعروں ادیبوں کا عبرت ناک انجام!'

اُس دلخراش (بعد میں حلق خراش۔ جس طرح مسلسل بولنے پر تمھیں کھانسیاں آنے لگی تھیں) بیان کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔ تم نے بار بار مجھے مخاطب کیا۔۔۔ مثلاً۔ دیکھو راقم کچھ شاعر ادیب تمھارے جیسے ہی تھے، لکھ لکھ کر رکھ چھوڑتے تھے کوئی درجن ڈیڑھ درجن دوستوں یاروں کو اِدھر اُدھر سنا کر ہاتھ کا لکھا ہوا پڑھا کر واہ واہ کرا لیتے تھے اور خوش ہو جاتے تھے۔ پتہ اُس وقت چلا جب ایک دن سب چالیس چالیس سال کے ہوگئے لیکن ایک لفظ نے بھی چھاپہ خانے کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ اُن ڈیڑھ درجن جاننے والوں کے علاوہ جن میں سے بھی اب چار پانچ ہی رہ گے تھے باقی کوئی انھیں جانتا تک نہیں تھا۔ سب کو اپنی پڑگئی اور عالمِ 'پسوڑی' میں اپنی تحریریں اٹھا اٹھا کر مؤقر اور غیر مؤقر ادبی جریدوں کے مدیران کے پاس لے جانے لگے۔ لیکن اس عرصے میں زمانہ قیامت کی چال چلنے کے علاوہ کافی آگے بھی چل چکا تھا۔ وہی مدیران جو عمر میں اُن کے دوستوں جیسے تھے کہنے لگے "یار یہ بڑی پرانی چیزیں ہیں۔ اب انھیں کون پوچھتا ہے۔ بیس پچیس سال پہلے چھپوا لیتے تو چھپوا لیتے، اب مشکل ہے۔ چائے پیو گے یا ٹھنڈا۔"

چائے ٹھنڈے پر لعنت بھیجتے وہ باہر آئے تو پتہ چلا کہ ادبی دنیا اندھیر ہو چکی ہے لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔۔۔ قیامت ٹوٹ چکی تھی۔

اب ذرا ایک منٹ رکو خیالی روشنی والے روشن دین صاحب جب تم نے یہ بات کی تھی تو میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا لیکن میں نے اُس وقت اُس کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا کیونکہ میں اظہار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے ادبی مستقبل سے مجھے ڈرانے میں تم اتنے کامیاب ہو چکے تھے کہ اپنے بھیانک انجام کو سامنے دیکھ کر میری گھگھی بندھنے والی تھی۔ لیکن اب چونکہ بفضل تعالیٰ گھگھی پھر کھل چکی ہے اس لیے میں نے جو کچھ اُس وقت سوچا تھا وہ مختصراً تمھیں بتا ضرور دیتا ہوں۔ کیونکہ یہ علمی مسئلہ ہے اور میں اِسے ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔ یہ جو تم جیسے لوگ 'دنیا اندھر ہو جانے' یا 'قیامت ٹوٹ پڑنے' کے بعد کہتے ہو۔ ''لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔'' اس سے تم کیا کہنا چاہتے ہو یعنی ناں کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے، سوانح عمریاں ہمیں بتاتی ہیں، پولیس ریکارڈ ہمیں بتاتے ہیں کہ 'دنیا اندھیر ہونے کے بعد' 'قیامت ٹوٹنے کے بعد' ہی تو سب کچھ ہوتا ہے۔ کیا ہوتا ہے کیونکر ہوتا ہے یہ ایک سنجیدہ موضوع ہے۔ جو ایک جوابِ مضمون کا متقاضی ہے (ویسے یار کوئی سوال مضمون بھی ہوتا ہے کیا؟) جس کے ذریعے اس باطل نظر کے 'لیکن اب کیا ہو سکتا تھا' کا قلع قمع کیا جائے۔ (خیالی یار ایک خیال آیا مجھے کہ مضمون بھی تو لکھے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی تو ایک میدان ہے۔) خیر۔ تو جناب حقیقت یہ ہے کہ وہ شاعر ادیب ادبی دنیا اندھیر ہونے کے بعد بھی بہت کچھ کر سکتے تھے اور جس کا آغاز یقیناً بے ادبی دنیا سے ہوتا۔ لیکن میں واپس اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

تو تم نے بتایا کہ وہ تمہارے کبھی نہ چھپ سکنے والے شاعر ادیب جو تھے اُن میں سے کچھ تو رو دھو کر اپنے اصل پیشوں مثلاً آڑھت۔ پروفیسری۔ کلرکی۔ وثیقہ نویسی۔ طب وغیرہ وغیرہ کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن چند بدنصیب جو 'لکھنے لکھانے' کو ہی اپنا اصل پیشہ سمجھے بیٹھے تھے پھر اپنے اپنے بھیانک انجاموں کی طرف مائل ہونے لگے۔ اکثر نے خودکشی کی ناکام کوششیں کیں۔ عین وقت پر دوستوں نے پستول ہاتھ سے چھین لیا۔ نیند کی گولیوں کی جگہ وٹامن کی شیشی رکھ دی۔ بلندی سے کودنے سے ذرا پہلے زبردستی پیراشوٹ ہاتھ میں تھما دیا گیا۔ بعض نے منشیات میں پناہ ڈھونڈی چرس گانجہ پینے لگے یا اینٹی نارکانکس بورڈ میں ملازم ہو گئے۔ باقی جو بچے وہ پاگل ہو گئے یعنی انھیں کہا جانے لگا کہ 'یہ پاگل ہو گئے ہیں'۔ حالانکہ کیا انھوں نے صرف یہ کہ جدید ادبی رجحانات کے مطابق پھر سے لکھنے اور لکھنے سے بھی پہلے چھپنے کی دیوانہ وار کوششیں

کرنے لگے۔ دو تین نے پیسے ڈال کر لیبل۔ شادی کارڈ اور جلسہ عام قسم کے اشتہار چھاپنے کی سیکنڈ ہینڈ مشین لگا لی۔ لیکن سب سے کامیاب وہ رہا جس نے اپنا ہی ایک ادبی رسالہ چالو کر دیا۔ اور اپنی تحریروں کی اشاعت کے حوالے سے مکمل طور پر خود کفیل ہو گیا۔ تمھارا کہنا تھا کہ یہ مجلّہ اب مؤقر ہے اور کامیابی سے چھپ رہا ہے لیکن میرے ہزار پوچھنے پر بھی تم نے اُس کا نام نہ بتایا بس یہی کہا کہ یہ ایک راز ہے۔ (اس پر مجھے شک ہوا کہ یہ کہیں تمھارے والا ہی تو نہیں ہے۔)

'بہر حال۔ تو یہ خوفناک پس منظر بنانے کے بعد تم نے مجھ سے یہ اپیل کی ''تو کیا تم یہ چاہتے ہو راقم کہ مجھے بھی اپنے عزیز ترین دوست۔ یعنی میں۔۔۔ کا ایسا ہی دن دیکھنا پڑے؟''

پھر تم نے خود ہی اپنے سوال کے جواب میں ''نہیں۔ کبھی نہیں'' کہا اور میرے منہ سے بھی ''نہیں۔ نہیں'' نکل گیا۔ سچی بات ہے کہ میں تو دہل گیا تھا کیونکہ جن کا قصہ تم نے سنایا وہ تو بڑے نصیبوں والے تھے کہ انھیں ایسے جان نثار دوست ملے۔ لیکن مجھے تو تم عین وقت پر پستول چھیننے کی بجائے کہو گے دیکھو ٹھیک طرح لوڈ بھی ہوا ہے یا نہیں۔ نیند کی گولیوں کی شیشی اگر آدھی ہوئی تو پوری بھر کر رکھو گے اور بلندی سے کودنے سے ذرا پہلے پیراشوٹ تھمانے کی بجائے میری جیب میں دس کلو کا وٹہ ڈال دو گے کہ کہیں تخیل کی بلند پروازی کا سہارا لیتے ہوئے ہی بچ نہ نکلے اور دس کلو کا وٹہ سیدھا نیچے لے جائے۔ یہ سب منظر نامے آنکھوں کے سامنے دیکھ کر میرے منہ سے چیخ نما۔ ''نہیں۔ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا'' نکل گیا۔

اس کے ساتھ ہی تمھارے منہ پر ایک اظہارِ تشکر کی جیسی مسکراہٹ پھیل گئی جو اب میں سمجھ گیا ہوں کہ عیاری کی مسکراہٹ تھی۔

''نہیں۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے'' تم نے کہا۔

'مگر کیسے' میں نے چیخ کر پوچھا۔

''ہم۔ یعنی تم۔ یعنی راقم۔ تم چھپو گے اور ضرور چھپو گے اور اسی تحریر کے ذریعے چھپو گے جو تم لاتے ہو۔''

''مگر کیسے'' میں (احمق) نے پھر پوچھا۔

اس کے بعد تم نے خاموشی اختیار کی اور مجھے ایک اور ہاف سیٹ چائے منگوانے کو

کہا۔ منگوائی۔ اور تم نے بڑی اپنی طرف سے میری ضیافت کرنے کے لیے میز کی دراز میں سے ایک ردی کاغذ کا بنا پُڑا سا نکالا۔ اور پھر ان میں سے تین بسکٹ نما چیزیں نکال کر پرچ میں ڈال کر میرے سامنے رکھیں اور ''ساری مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ یہ تو تھے'' کہا۔ مگر میں تمھاری طرف سے اُس وقت دل موم ہونے کے باوجود اُن ختائی نما بسکٹوں کو نہ کھا سکا۔ خیر تم نے خود ہی چائے کے ساتھ ڈکار لیے اور کہا۔

'یار راقم بات یہ ہے کہ تمہاری اس تحریر کو Rehash کرنا پڑے گا'

پہلے تو میں سمجھا کہ یہ انگریزی کا مشکل لفظ تم نے کہیں اِدھر اُدھر سے سنا ہے اور اس کے معنی اصل میں جانتے نہیں۔ لیکن نہیں جی تم کافی رٹا لگا کر آئے تھے۔ پورا منصوبہ تم نے تیار کیا ہوا تھا۔

''آ۔ دیکھو۔ اس سے یہ مراد ہے کہ ہمیں اس میں سے۔۔ بلکہ ہمیں کیا تمھیں۔ تمھیں اس میں سے جسے تم افسانہ کہنے پر بضد ہو اس میں سے بہت کچھ کاٹنا ہوگا۔ اُسے نکال پھینکنے کے بعد جو کچھ باقی بچے گا اُسے ازسرنو مربوط کر کے لکھنا ہوگا۔ لیکن ازسرنو بھی پچاس صفحے نہ لکھ لانا کیونکہ یار۔ بہرحال ہم نے 'جبر کے دور میں ادیبوں (ہمارے) کے کردار پر مختصر افسانہ لکھنا تھا۔ کوئی ناولٹ یا ناول نہیں لکھنا تھا۔ اس کے بعد تم نے بی۔اے اردو ٹمیسٹ پیپر میں سے رٹی ہوئی چیزیں سنا کر مجھے بے حد متاثر کیا۔ اور پھر آخر میں وہ تباہ کن سوال اور اُس کا جواب سیاہ وسفید میں سامنے آیا کہ 'کیا کچھ کاٹا جائے' اور کیا، کچھ رکھا جائے____؟'

موخرالذکر سوال کا جواب تو تم نے فوری طور پر دے دیا۔۔'جو باقی بچے گا اُس میں سے جو رکھنے کے قابل ہوا۔ لیکن کیا کاٹا جائے گا کا جواب دینے کے لیے تم نے پھر میرا مسودا اپنی طرف کھینچا اور ایک نظر دیکھنے کے بعد دراز کھول کر اس میں کچھ ڈھونڈنے لگے۔ مجھے شک پڑا کہ قینچی ڈھونڈ رہے ہو۔ لیکن پھر تم نے بتایا کہ قلم ڈھونڈ رہے ہو۔ جو نہ ملا۔ یعنی انتہا ہے کہ ادبی مجلّے کے نائب مدیر کے کمرے میں قلم تو نہیں ملتا ٹائرمل جاتے ہیں۔ قلم اتفاق سے میرے پاس بھی نہ تھا۔ چنانچہ تم نے فیصلہ دیا ''کوئی بات نہیں ڈسکس کر لیتے ہیں۔'' ڈسکس کیا گیا اور چونکہ میں اپنے اشاعتی مستقبل کی باگ ڈور تمھارے ہاتھوں میں تھما ہی چکا تھا اس لیے تمھارا ہر مشورہ۔ فیصلہ بلکہ حکم میرے لیے قابل قبول تھا (کیسے میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے)۔ اور تم نے

بظاہر انتہائی سمسی زبان میں یہ مشورے دیے۔

''___ دیکھو راقم پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ جو تم لکھ کر لائے ہو اسی کو تم نے اپنے سامنے رکھنا ہے لیکن پہلے نہا دھو کر اپنے آپ کو بقائمی ہوش وحواس کر کے اور اللہ کو حاضر ناظر جان کر اسے پڑھنا ہے لیکن اس طرح کہ ہر لفظ۔ ہر فقرے۔ ہر پیرے پر رُک کر اپنے آپ سے انتہائی ایمان داری سے۔ میں پھر دہراتا ہوں انتہائی ایمان داری سے اپنے آپ سے یعنی اپنے ضمیر سے سوال کرنا ہے کہ اگر یہ لفظ۔ فقرہ یا پیرہ نہ ہوتا تو کیا اس افسانے پر کوئی فرق پڑتا۔ ممکن ہے بعض اوقات تمھیں یہ سوال دو دو تین تین مرتبہ کرنے پڑیں۔ کیونکہ ایک تو سبھی جانتے ہیں کہ ضمیر نیند کا رسیا ہے دوسرے پھر ادیب کا ضمیر اور اوپر سے پھر جبر کا دور (تم میرے اوپر چوٹ کر رہے تھے لیکن میں اُس وقت نہ سمجھ سکا۔ لیکن اب تھوڑی دیر بعد تمھیں بتاتا ہوں۔) اس لیے بار بار یہ سوال اپنے آپ سے پوچھو اور اگر جواب نفی میں آئے تو وہیں اُس لفظ۔ فقرے یا پیرے پر کاٹا پھیر دو۔

میں نے پوچھا۔ ''ویسے تمھیں کوئی ایسی چیز نظر آئی ہے۔ بتا دو میری رہنمائی کے لیے۔ مجھے آسانی رہے گی'' (ایسا مجھے شوق چڑھا ہوا تھا اپنا افسانہ چھپوانے کا۔)

تم نے منہ سے کچھ آ۔ غاں۔ آوں۔ غاوں کی آوازیں نکالیں اور پھر کہا ''آ صاف ظاہر ہے کہ لکھتے وقت کچھ لفظ جن کے معنی تمھیں نہیں آتے تھے لیکن تم انھیں استعمال بھی کرنا چاہتے تھے تو تم نے اُن کے معانی لغت میں دیکھے لیکن ساتھ وہ سب معانی بمعہ حوالہ لغت اپنے افسانے میں بھی درج کر دیے گویا تم قاری کو بھی اپنے جتنا ہی جاہل سمجھتے ہو۔ ایک تو یہ کاٹو۔ دوسرے یہ کیا ہے جو تم بار بار کسی چار چھ سو سالہ پرانی روایت کا قصہ لے کر بیٹھ جاتے ہو۔ یہ مجلّے کی پالیسی کے خلاف ہے۔ ہم جدید روایات کے امین ہیں اور دس بیس سال سے زیادہ پرانی کوئی روایات ہمارے لیے قابل قبول نہیں۔ تو یہ ہوا۔ اور ہاں مجھے اس تحریر کو پڑھنے کے دوران بار بار شک ہوا راقم۔۔۔ کہ تمھارے اندر کوئی نیم مردہ سا مزاح نگار بھی 'پھرکنیاں' کھا رہا ہے۔ لو۔ یہ عجیب ہوا کہ جب تم سنا رہے تھے اور پھر میں نے خود بھی پڑھا تو بار بار شک ہوا کہ ۲ ں حاجت ہو رہی ہے لیکن پھر حیرت ہوئی کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ انتہائی سنجیدہ موضوع پر افسانہ ہے ،،ر بار بار ہنسی کیوں دباؤ ڈال رہی ہے۔ سبجیکٹ رونے والا ہے اور ادھر 'ہاسے' نکل رہے

ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے تم ہی کبھی سمجھا دو تو سمجھاؤ۔ لیکن ابھی نہیں۔ پہلے اسے Rehash کر لو۔ بہرحال یہ نکالو سب۔ اس افسانے کا مزاج بہرحال گھمبیر ہوگا۔ یہ ہنستا روتا اکٹھا انتہائی قابل گرفت ہے۔ پھر تم نے اسی لفظ گرفت کو پکڑ لیا اور اس کا دائرہ وسیع کرتے گئے۔۔۔ "اور یہ تمہارے ہیرو کا نام نازش نبردازی۔۔ یہ کیا ہے۔ انتہائی قابل گرفت ہے۔" تم نے 'نیامت امانق' تجویز کیا۔ آخر میں تم نے فرمایا۔

"دیکھو میری جان اگلے ہفتے پرچے کی پلیٹیں لگنی شروع ہو جائیں گی۔ سو بات کی ایک بات اس افسانے میں جو کچھ بھی سیاسی۔ علمی۔ ادبی۔ مذہبی۔ نیم مذہبی۔ روحانی۔ جسمانی۔ ثقافتی۔ روایتی۔ قانونی طور پر قابل گرفت ہے قابل اعتراض ہے اس کو کاٹ دو۔ باقی جو بچے اُس کو جیسی بھی شکل دے دو۔ مگر اگلے دس دن تک مجھے رجسٹری کرا دو۔ آ جاؤ تو بہت ہی اچھا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں تمہارا افسانہ ایک مختصر سے تمھارے تعارف کے ساتھ چھاپوں۔

'اور یہ جو سب کاٹنے کا عمل ہوگا۔ یہ ضمیر کی آواز کے مطابق ہوگا' میں نے رخصت ہوتے وقت پوچھ لیا۔

'سو فیصد۔ سو فیصد' تم نے انتہائی اعتماد سے کہا۔

بس یہ آخر ڈائیلاگ ہی تھا تمہارے ساتھ میرا جو میرے افسانے کو تباہی سے بچا گیا جو تباہی تم نے میری اِس آواں گارد تحریر کا قلع قمع کرنے کے لیے پلان کی ہوئی تھی۔ (آواں گارد جانتے ہو کیا ہوتا ہے۔ نہیں پتہ ناں۔ نہیں بتاؤں گا کیا ہوتا ہے۔ مگر اتنا بتا دیتا ہوں کہ یہ چیز بھی اب ادھر آ چکی ہے اور تمہارے جیسے جاواں گارد کے لیے تباہی ثابت ہوگی۔)

لمبے سفر کے بعد گھر پہنچا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ تھکن بھی شدید تھی لیکن چھپنے کی اتنی شدید ہوس تم نے بھڑکا دی تھی کہ اگلی صبح کا بھی انتظار نہ کیا اور رات بارہ بجے ہی مسودہ لے کر تمھارے رہنما اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ہر قابل گرفت چیز کو کاٹنا پیٹنا شروع کر دیا۔ اِس عمل کے دوران نیند غالب آتی تھی اور کبھی بیداری اور کبھی کوئی اور چیز اور مجھے لگتا تھا کہ کوئی غلط کام مجھ سے سرزد ہو رہا ہے۔ بہرحال یہ عمل صبح ساڑھے چار بجے مکمل ہوا۔ سو گیا اور اگلی صبح بارہ بجے بیدار ہوا۔ پھر تمھارے مشورے کے مطابق نہا دھو کر بقائمی ہوش و حواس ہو کر اگلا کام

کرنے کا ارادہ کیا یعنی مسودے میں سے جو کچھ باقی بچا تھا اُسے مربوط کرنے کا۔

اللہ کو حاضر ناضر جان کر مسودے پر نظر ڈالی تو ایک بار تو زنانے نکل گئے، لگتا تھا کہ کچھ بھی باقی نہیں بچا پھر بار بار دیکھا تو پتہ چلا کہ نہیں چالیس صفحات کے مسودے میں سے قابل اعتراض حصے نکال کر بھی ڈیڑھ صفحات بچ گئے ہیں۔ تمھاری وہ بات یاد آئی 'افسانہ کم از کم ایک صفحے سے لے کر زیادہ سے زیادہ بارہ صفحات تک ہونا چاہیئے۔ دل کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ جو باقی بچا ہے وہ ابھی بھی افسانہ ہے اور کم از کم چھپ تو جائے گا۔ دل میں خیال آنے کی دیر تھی کہ ایک آواز آئی۔ "میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے چھپنے پر"۔

میں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا تو کوئی بھی نہ تھا۔ کوئی نیند جھپکی خواب کا چکر بھی نہیں تھا کیونکہ میں اب ذہنی اور روحانی بلکہ جسمانی طور پر بھی مکمل الرٹ تھا شاید اسی لیے میں نے سمجھدار لوگوں کی طرح اُس آواز کو وہم گردان کر رد کر دیا اور فیصلہ کیا کہ اِن ڈیڑھ صفحات کو تازہ کاغذ پر اتار کر کچھ آگے پیچھے درمیان لگا کر تمھیں بھجوا دیتا ہوں اور ساتھ شدید مطالبہ کرتا ہوں کہ اگلے شمارے میں ہر صورت چھپ جانا چاہیے۔ لیکن جناب کاغذ قلم پکڑا ہی تھا کہ پھر آواز آئی۔

'خبردار'۔ اب یہ آواز سر کے اندر سے اور دونوں کنپٹیوں کے درمیانی کسی مقام سے آتی محسوس ہوئی۔ اور مجھے یاد آیا کہ میں نے کہیں جدید سائنسی تحقیق پڑھی تھی کہ اس مقام کا تعلق انسان کی خیر و شر میں امتیاز کرنے کی صلاحیتوں سے ہوتا ہے (اچھے بُرے دوستوں میں امتیاز بھی دماغ کا یہی حصہ کرتا ہے) قبلہ روشن خیالی صاحب آپ چونکہ ان علمی و تحقیقی معاملات میں کورے ہیں اس لیے ضروری محسوس ہوتا کہ کچھ وضاحت کر دوں تا کہ جو بات ہو رہی ہے وہ آپ کے کچھ پلے تو پڑے۔ دیکھو یہ جو دماغ یعنی بھیجا ہوتا ہے تو اس کا ہر حصہ اصل میں ہمارے سوچنے سمجھنے بلکہ کچھ بھی کرنے کو مکمل طور پر کنٹرول کرتا ہے۔ اور یہ کنٹرول تیزی سے محققین کو سمجھ آ رہے ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں جب ایک عام سی۔ ٹی سکین کے ذریعے تم جیسے نام نہاد (شاعروں) دوستوں کی اصلیت سامنے آ جائے گی۔ لیکن جب تک یہ نہیں ہو پاتا دماغ کا یہ مرکزی حصہ انسانوں کی نیک و بد میں رہنمائی کرتا رہے گا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور دماغ کے اِس حصے نے نہ صرف رہنمائی کی بلکہ اپنی شناخت بھی کرائی۔ آواز آئی۔

''اگر اس طرح کی کوئی چیز تم نے چھپوائی تو ساری عمر تم پر لعنتیں بھیجتا رہوں گا۔ کبھی معاف نہیں کروں گا'' اب میں پہچان گیا کہ یہ آواز کس کی ہو سکتی ہے۔ لیکن میں حیران ہوا کہ میں نے گزشتہ رات جو کچھ بھی کیا تھا وہ اُس کی آواز کے مطابق ہی کیا تھا۔ میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ پھر آواز آئی اور دماغ کے اُس حصے میں چبک سی بھی پڑی۔ اس چبک کے ساتھ ہی میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ / عمل ہوا۔ جس طرح رائٹر پر تخلیقی لمحہ آتا ہے تو اسی طرح تحقیقی لمحہ بھی آتا ہے یا آ سکتا ہے۔ لیکن اکثر اُس کے امکانات کو ضائع کر دیا جاتا ہے۔ میں نے تیزی سے کاغذ پنسل پکڑا اور اُس آواز کو سُننے کے ساتھ ساتھ کاغذ پر نوٹ کرنے لگا کہ میرے ساتھ جسمانی طور پر کیا ہو رہا ہے۔ تم جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا اعلیٰ علمی۔۔۔ تحقیق کی ابجد سے بھی واقف نہیں اس لیے مزید تمھارے ساتھ سر کھپانا عبث ہے۔ لیکن خیر دیکھتے جاؤ اب آگے ہوتا کیا ہے۔

میں نے چبک برداشت کرنے کے بعد اُس آواز کو جواب دیا' مگر میں نے تو تمھارے مشورے کے مطابق اور تمھاری آواز کے مطابق ہی سارے افسانے کی کٹائی کی تھی۔ آواز آئی' اتنا عرصہ تمہیں میرے ساتھ رہتے ہوئے ہو گیا ہے لیکن ابھی تک تمہیں میرے سونے جاگنے کے شیڈول کا بھی پتہ نہیں چلا۔ میں تمھارے ساتھ ہی رات زیادہ سے زیادہ پونے بارہ بجے سو جاتا ہوں اور پھر تمھارے ساتھ ہی اٹھ جاتا ہوں عموماً سات بجے، اس لیے جبر کے دور میں ادیبوں (ہمارے) کا کردار کیا ہوتا ہے اُس پر جو کچھ تم نے پہلے لکھا تھا وہی میری آواز کے مطابق تھا۔ آئندہ کے لیے نوٹ کر لو کہ تمھارے کیس میں میرے اور تمھارے سونے جاگنے کے اوقات کار ایک ہی ہیں۔ لیکن اکثریت میں جن میں تمھارا دوست روشن خیالی بھی شامل ہے یہ اوقات الٹ ہوتے ہیں۔ یعنی میرے بھائی بند جو اُن کے ساتھ مقیم ہوں وہ اُن کے دن میں بیداری کے لمحات میں تو گہری نیند سوتے رہتے ہیں لیکن اُن کے سوتے ہی پٹ پٹ آنکھیں کھولتے جاگ پڑتے ہیں پھر خوب اودھم مچاتے اور مستیاں کرتے ہیں۔ اُن کی یہ ساری کارروائی سونے والے کو گندے گندے ڈراونے خوابوں کی شکل میں نظر آتی ہے۔'

اس انکشاف پر میری نبض کی رفتار بڑھ گئی سانس تیز ہو گیا، ماتھے پر پسینہ آ گیا اور اب دماغ کے پچھلے حصے میں جوڑوں کا درد شروع ہو گیا۔ میں نے تیزی سے یہ سب تبدیلیاں

نوٹ کیں۔ تو روشن دین اب یہ لمبی بات ہے مختصر یہ کہ دماغ کے وسطی حصے سے اُٹھنے والی اُس آواز کے ساتھ وہ سیشن کوئی پونا گھنٹہ جاری رہا اور اُس کے تین نتیجے نکلے اور وہ تینوں میں تمھیں بتا دیتا ہوں۔

1۔ جبر کے دور میں ادیبوں (ہمارے) کے کردار پر جو کچھ بھی میں نے لکھا ہے اُس میں سے ایک حرف بھی نہیں کاٹا جائے گا۔ خواہ یہ چھپے یا نہ چھپے۔ اسے ایک خُفیہ دستاویز کے طور پر محفوظ کر لیا جائے گا اور آئندہ نسلیں آئندہ ادوار میں اِسے چھپوانے کی کوششیں کرتی رہیں گی۔

2۔ میں جلد ہی تخلیق کے ساتھ تحقیق کے میدان میں بھی کودنے والا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میرا پہلا تحقیقی مقالہ اس موضوع پر ہو گا۔ 'ضمیر کے جاگنے اور سونے کی جسمانی علامات۔ تشخیص اور علاج'

3۔ جبر کے دور کے متعلق افسانوی تحریر ہر حال میں مکمل کی جائے گی۔

چنانچہ خیالی پیارے اب میں نتیجہ نمبر 3 پر ہی عمل کروں گا۔ اور تحریر مکمل ہونے کے بعد تمھیں ایک بار دکھائی ضرور جائے گی چھپوائی پر میں لعنت بھیجتا ہوں۔ میں اب آگے اُس میں کیا کرنے والا ہوں وہ میں تمھیں کچھ بتا دیتا ہوں، میں نے مکمل یعنی کہانی کے انجام تک Workout کر لیا ہے۔

تمھیں یاد ہوگا کہ ادبی مجلس کے اجلاس کے بعد جب اُس عمارت پر بجلی (آسمانی) گرتی ہے اور ہر طرف افراتفری پھیل جاتی ہے تو یعقوب دلاور نامی ایک ٹیلی ویژن ڈرامہ پروڈیوسر نازش نبردازی سے اپنا تعارف کراتا ہے۔

یہ ملاقات رنگ لاتی ہے۔ اور یعقوب نازش کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ درحقیقت اس کا اصلی میدان ٹی وی ڈرامہ نویسی ہے اور وہ ادبی محفل میں اپنے ڈرامے یوں ضائع نہ کرے۔ وہ نازش کو بتاتا ہے کہ 'اُجلے اُجالے' کے نام سے پچیس منٹ کے Odd ڈراموں کی ایک سیریز آمدہ کوارٹر میں لانچ ہو رہی ہے۔ جس میں بہت سے ڈرامہ نگار لکھ رہے ہیں اور اس سیریز کے بارے میں فیصلہ ہوا ہے کہ اِسے اُس وقت تک چلایا جائے جب تک کہ یہ اپنے آپ بند نہ ہو جائے۔ لہٰذہ بہت لکھنے کی گنجائش ہے۔ پھر یعقوب اپنی خواہش کا اظہار کرتا

ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اُس کے حصے میں آنے والی تیرہ اقساط تمام نازش لکھے۔ دونوں میں آئندہ جمعرات ساڑھے تین بجے ٹی وی اسٹیشن پر لاؤڈ تھنکنگ، کے لیے ملاقات طے پاتی ہے جس کے دوران نازش کو پالیسی سے بھی مطلع کیا جائے گا۔

یہ میٹنگ بہت کامیاب رہتی ہے اور تھنکنگ اتنی لاؤڈ ہو جاتی ہے کہ باقی اہل کاروں کے کام میں مداخلت کرنے لگتی ہے اس پر یعقوب دلاور کی جواب طلبی ہو جاتی ہے۔ اور وہ اسی بہانے نازش نبردازی نامی ابھرتے ہوئے ڈرامہ نگار کا تعارف بھی اپنے حکام بالا سے کرا دیتا ہے اور جواب طلبی کی وضاحت یہ پیش کرتا ہے۔ "سر آپ تو جانتے ہیں تھنکنگ تو پہلے ہی پالیسی کی شکل میں طے ہو چکی ہے اس لئے سارا زور لاؤڈ پر دینا پڑتا ہے۔" باس اِس وضاحت پر بہت خوش ہوتا ہے۔ اور اسے ایک معقول وضاحت قرار دے کر حکم دیتا ہے کہ آئندہ لاؤڈ تھنکنگ صرف ساؤنڈ پروف کمرے میں کی جائے ایسے ساؤنڈ پروف کمرے کی تعمیر کے لیے ٹینڈر نوٹس جاری کر دیے جاتے ہیں۔

واپس اپنے کمرے میں آ کر یعقوب نازش کو پالیسی کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں بتاتا ہے۔

ایک تو یہ ہے کہ پالیسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ یہ تو آپ کے کام کو آسان بنا دیتی ہے۔ آپ کو علم ہوتا ہے کہ منزل کیا ہے اور اِدھر اُدھر فضول بھٹکنے سے باز رہتے ہیں۔ رہنما اصول مشعل راہ کا کام دیتے ہیں۔

نازش کے استفسار پر کہ یہ رہنما اصول کیا ہیں۔ یعقوب دلاور بتاتا ہے۔ سب سے پہلی اور بنیادی بات یہ ہے ہر ڈرامے کا اینڈ (End) پازیٹو (Positive) ہونا چاہیے۔ یعنی ہر صورت نتائج مثبت نکلنے چاہئیں، اگر کہانی کی مجبوری کی وجہ سے منفی نکلتے نظر آئیں تو سادہ ریاضی کا کلیہ یعنی نفی ضرب نفی جمع لگا کر منفی کو جمع میں تبدیل کر لیں۔ یہاں پر بہت احتیاط کی ضرورت ہے کیوں کہ ضرب کے ساتھ ہی پڑی تقسیم بھی بعض اوقات غلطی سے کام کر جاتی ہے۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے ڈرامہ نگاروں کو پہلے ہی مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ پانچویں جماعت تک کے حساب کے سوال پھر نکال لیں۔

اس کے علاوہ ممنوعہ الفاظ کی ایک لسٹ جس کی فوٹو کاپیاں پہلے ہی کروا لی گئی ہیں۔

اس لسٹ میں موجود الفاظ کسی صورت ڈراموں میں استعمال نہیں ہونے چاہیں اگر کسی ڈرامہ نگار کو انھیں استعمال کرنے کی بہت ہی حاجت ہو تو وہ غسل خانے میں جا کر انھیں چیخ چیخ کر اپنے آپ کو سُنا سکتا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی یعقوب میز کی دراز سے ایسے الفاظ کی ایک لسٹ نکال کر نازش کے حوالے کرتا ہے۔ نازش ایک اچٹتی سی نظر ڈالتا ہے تو اُسے ایسے الفاظ نظر آتے ہیں____
فوج ظفر موج۔ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا۔ حجلۂ عروسی۔ جبر۔ مجبور۔ عبدل جبار۔ آزادمنش۔

یعقوب کہتا ہے کہ نازش لسٹ گھر جا کر اطمینان سے دیکھے کیونکہ یہ اب اُس کی ملکیت ہے اور ہمیشہ اُس کے پاس رہے گی۔ وہ ذرا اُس کے زیادہ اہم سوال کا جواب دے اور وہ یہ ہے کہ نازش نبردازی تیرہ ڈراموں کی ون لائنیں کب تک فراہم کرے گا تا کہ انھیں اپرُو (Approve) کرا کے آگے ڈرامے لکھنے کا کام شروع کیا جائے کیونکہ ریکارڈنگ ڈیٹس آنے والی ہیں نازش کہتا ہے کہ وہ اکٹھی تیرہ ون لائنیں اپرُول کے لیے لانے کی بجائے ایک ایک کر کے لاتا جائے گا اور اپرُو کراتا جائے گا۔ یعقوب دلاور کہتا ہے کہ یہ بہت اعلیٰ ہے۔

نازش رادوکی واپس آ کر اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ ون لائنیں ڈویلپ ہونے لگتی ہیں۔ پہلی دانش مند لکڑہاڑا کے عنوان سے۔ ایک لکڑہاڑا جو اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا ہے۔ جنگل میں ایک سڑک کے کنارے لکڑیاں کاٹ رہا ہے۔ اچانک بینک سے مال و دولت لُوٹ کر لانے والے کچھ سماج دشمن عناصر اُسی درخت کے نیچے آ کر لوٹ کے مال کی تقسیم شروع کر دیتے ہیں جہاں اوپر وہ بیٹھا ہے۔ لکڑہاڑا ایک ذمے دار شہری کے طور پر اپنے فرض کی ادائیگی پر مجبور ہو جاتا ہے اور ایک بہت بڑا ٹہنہ کاٹ کر بدمعاشوں کے سروں پر پھینکتا ہے۔ اور انہیں شدید زخمی کر دیتا ہے۔ بعد میں لکڑہاڑا پولیس کو بلاتا ہے اور بینک کی تمام دولت مضروب ڈاکوؤں سمیت اُن کے حوالے کر دیتا ہے۔ لیکن ڈاکو مضروب ہونے کے باوجود پولیس سے مُک مکا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور لکڑہارے کو جنگل سے چوری لکڑیاں کاٹنے کے جرم میں جیل ہو جاتی ہے۔ اب یہ سارا واقعہ وہیں قریب ہی چُھپا بیٹھا ایک درویش بابا دیکھ رہا تھا۔ یہ بابا کسی زمانے میں پولیٹیکل سائنس کا پروفیسر تھا لیکن پھر اپنے اردگرد کے پولیٹیکل حالات دیکھ کر اُس نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جنگل کی راہ لی۔ اور آج کل جنگل میں اللہ توبہ اور بعض اوقات

محض توبہ۔ توبہ کرتا پھرتا ہے۔ بابا قریبی بستی سے اپنے ایک سابقہ طالب علم کو فون کرتا ہے جو آج کل آئی۔ جی پولیس ہے اور اس طرح اصل قانون حرکت میں آتا ہے۔ ڈاکوؤں کو گرفتار کیا جاتا ہے پولیس والے لائن حاضر ہوتے ہیں۔ لکڑ ہارے کو نہ صرف باعزت رہا کیا جاتا ہے بلکہ اُسے تمغہ شجاعت سے نوازا جاتا ہے۔ اور اُس کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے پہلے پرائمری تعلیم دی جاتی ہے۔

نازش نبردازی کی یہ ون لائن بے پناہ پسند کی جاتی ہے۔ البتہ اُس کا عنوان دانش مند لکڑ ہاڑا سے بدل کر 'ایفائے عہد' رکھا جاتا ہے۔ یعقوب دلاور ون لائن دیکھتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہے کہ اس ڈرامے کو محکمہ جنگلات کی سپانسر شپ تو لازماً حاصل ہو جائے گی۔

تو جناب روشن دین صاحب۔ یہ ہے۔ آگے پھر نازش ایک ایک کر کے تیرہ کی تیرہ ون لائنیں نہ صرف ڈویلپ کرتا ہے بلکہ اسی طرح اپرُو بھی کراتا ہے۔ یہ تو میں تمھیں مختصراً بتا رہا ہوں افسانے میں ساری ون لائنیں بنا کر دکھائی جائیں گی۔ بہر حال تو اب میں آتا ہوں اختتام یعنی The End کی طرف۔

جب نازش نبردازی اپنی تیرہ ون لائنیں اپرُو کرا لیتا ہے۔ تو ریکارڈنگ کی ڈیٹس سر پر آن پہنچتی ہیں۔ اور اُسے بس جلد از جلد پہلا ڈرامہ لکھ کر لانے کو کہا جاتا ہے۔ یعقوب دلاور بہت 'پسوڑی' کے عالم میں ہے اور نازش کو کہتا ہے بس تین دن تک سکرپٹ اس کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ نازش کہتا ہے۔ ایسا ہی ہوگا اور راددو کی واپس آ کر وہ پہلے سکرپٹ پر کام شروع کرتا ہے۔ لیکن۔۔۔ اُسی دن ایک عجیب واقعہ ہوتا ہے۔

مائی ڈیر روشن دین خیالی اب سوچو کیا ہوگا۔ وہ واقعہ کیا ہوگا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ کیا ہوا ہوگا۔ ہوتا یہ ہے کہ جونہی نازش اپنے سکرپٹ کی آخری سطر لکھنے لگتا ہے۔ تو باہر سے ایک عجیب شور شرابے کی آواز آتی ہے۔ پھر آتش بازی چلنے کی آوازیں آتی ہیں۔ پھر کھادی جھینجا چیختا چلاتا ناچتا آتا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ 'جبر کے دور کا خاتمہ ہو گیا ہے'۔ 'ستیاناس' یہ کیا ہو گیا۔ نازش کے ذہن میں پہلا خیال یہی آتا ہے۔

تو کیسا ہے؟ جیسا بھی ہے ایسا ہی لکھا جائے گا اور ہاں مشکل الفاظ کے معنی بھی ضرور بتائے جائیں گے اور نازش نبردازی کے آباء واجداد کی روایات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔ اور

آئندہ ہمیشہ یاد رکھنا چھپنا میرا مسئلہ نہیں ہے۔

اور سناؤ پھر کیا حال ہے۔ تمھارے ٹائیروں کا کیا حال ہے۔ اُسی طرح جذباتی ہوتے رہتے ہو یا کچھ فرق پڑا ہے۔ اچھا پھر ملاقات ہوگی۔

فقط تمھارا دوست راقم

P.S. تو اس تحریر/ افسانے کا آخری فقرہ ہوگا نازش نبردازی نے ڈرامہ نگاری کے میدان میں سر نکالنا ہی شروع کیا تھا کہ جبر کے دور کا خاتمہ ہو گیا۔

P.S. معاف کرنا، خط کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا۔ بُرا نہ منانا۔

خط بنام راقم از طرف روشن خیالی نائب مدیر مجلّہ دروغ بگردن راوی۔

مائی ڈیر راقم۔

نہیں یار نہیں۔ اِس سے زیادہ طویل خط تمھارے پڑھے ہوئے ہیں۔ بُرا منانے کی کیا بات ہے۔ بلکہ اس خط میں تو تمھارے ایک بہت اعلیٰ 'اچھا منانے' کی بات ہے۔ میرا اشارہ 'دانش مند لکڑ ہاڑا' یعنی 'ایفائے عہد' کی ون لائن کی طرف ہے۔ یار یہ تو تم نے کمال کر دیا۔ تمھارے طویل خط پڑھ پڑھ کر ہی ایک زمانے میں میں نے تمھیں افسانے لکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ کاش اُس وقت تمھیں ڈرامے لکھنے کا مشورہ دیا ہوتا۔ یار یہ تو کمال کی ون لائین ہے۔

اچھا اب سُنو۔ میری بات غور سے سنو۔ دیکھو تمہارے اس نخچو پینڈو افسانوی ہیرو ادیب کے جبر کے دور کا تو خاتمہ ہو گیا ہے لیکن ہمارا تو نہیں ہوا اور ہم نے ابھی روٹی بھی کھانی ہے۔ اور ٹی وی ڈرامے لکھنے کے اچھے پیسے مل جاتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی کسی خط میں ضمناً ذکر کیا تھا کہ ہمارے ایڈیٹر صاحب T.V ڈرامے لکھنے کی یعنی فی الحال یہی ون لائن لکھ کر اپرُو کرانے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں لیکن اُن کی دال نہیں گل رہی۔ پتہ نہیں موٹھ کی ہے یا ارہر کی، یا کیا ہے۔ لیکن اُن کے نائب کی حیثیت سے اُن کے رونے پیٹنے میں اُن کی مدد کرنے کے لیے مجھے اکثر ٹی وی اسٹیشن بھی جانا پڑتا ہے اور ادھر اُسی تمھارے فرضی ڈرامہ پروڈیوسر کے حلیے اور نام والے ایک شخص سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی ہے۔ اُس کا نام مرغوب شناور ہے اور وہ آج بالکل اُسی قسم کی ون لائنیں ڈھونڈ رہا ہے جس کا ذکر تم نے اپنی تحریر میں بلکہ تحریر تو ابھی آنی

ہے۔ بہرحال اپنے خط میں کیا ہے۔ اب میں پھر کہوں گا میری بات غور سے سنو۔ یہ بڑا زبردست موقع ہے تم وہ تیرہ ڈراموں (فرضی) کی ون لائنیں (حقیقی) نکال کر مجھے بھجوا دو۔ تاکہ۔۔۔لیکن نہیں مجھے یقین ہے تم ایسا نہیں کرو گے ڈھیٹ ہو۔ اچھا تو پھر ایسا کرو اپنے اسی آواں جاواں سٹائل میں بھی اپنی تحریر مکمل کرو اور اُس میں وہ تیرہ ون لائنیں جیسا تم نے کہا بھی ہے پوری طرح ڈویلپ کر کے لے آؤ۔ ہم تحریر کو چوم کر ایک طرف رکھ دیں گے۔ تم نے کہہ ہی دیا تمہیں چھپنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن عزیزم تمہیں T.V ڈرامے لکھنے میں تو کوئی اعتراض نہیں اُس میں یہ بھی تو کمال ہے کہ اسے چھپوانے کی کوئی قید نہیں۔ تو ہم ان تیرہ ون لائینوں کو الگ کاغذ پر اتار کر مرغوب شناور کے پاس چلے جائیں گے۔ اور مجھے اگلی سہ ماہی میں ٹی وی سکرین پر تمہارا نام چمکتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ یہ سب مشورہ (بلکہ کاش کان سے پکڑ کر یہ کام کروا سکتا) اس لیے دے رہا ہوں کہ آخر تمہارا جگری دوست ہوں۔ تم میرے خلوص پر کبھی شک نہ کرنا لیکن ایک تھوڑی خود غرضی بھی ہے جو میں ابھی تمہیں بتا دیتا ہوں تاکہ بعد میں تمہیں گلا نہ ہو۔ اب اس بات میں کوئی شک نہیں کم از کم مجھے نہیں کہ جب تم یہ تیرہ ڈرامہ لائنیں بنا لو گے تو تم ڈرامہ نگار بنو ہی بنو۔ تو جب یہ خوشی کا موقعہ آئے گا تو دوستوں کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔ نہیں نہیں۔ میں بھی ڈرامہ نویسی نہیں کرنا چاہتا مجھے اپنی ٹوٹی پھوٹی شاعری ہی کافی ہے۔ کہتے ہوئے تھوڑی جھجک آتی ہے۔ لیکن کہنا پڑے گا۔ دراصل مجھے بچپن سے ہی ایکٹنگ کا شوق ہے۔ سکول میں ایک دفعہ ڈرامہ ہونا تھا۔ مجھے ماشکی کا پارٹ دیا گیا لیکن بعد میں بدبختوں نے ماشکی کی جگہ پلمبر رکھ لیا۔ مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ میں نے ڈائریکٹر سکولز کو گم نام چٹھی لکھی کہ ہیڈ ماسٹر ڈرامے کی ٹکٹوں کے پیسے کھاتا ہے۔ ہیڈ ماسٹر کی ٹرانسفر ہو گئی اور ڈرامہ بند ہو گیا۔ اسی سے تم میرے شوق کا اندازہ لگا سکتے ہو۔

تو راقم میری جان جب تم یعنی تمہارا نام ٹی وی سکرین پر جگمگانے لگے تو ہم غریبوں کا ذرا خیال رکھنا۔ باقی میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، مجھے تو ٹی وی جا جا کر پتہ چل گیا ہے ناں کہ جس رائٹر کا ڈرامہ چل رہا ہوتا ہے اُس کے لیے کسی کو ایکٹنگ میں رکھوا دینا یا نکلوا دینا بالکل کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ابھی تو تم نے ون لائنیں ڈویلپ کرنی ہیں۔ کچھ رول میرے لیے پہلے سے ہی لائینوں میں ہی ڈال دو کہ جو میرے لیے موزوں ہوں تاکہ بعد میں کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو

کہ دوست نوازی کی گئی ہے۔ تیرہ کی تیرہ میں نہ سہی دس بارہ میں ہی سہی۔ کچھ اس طرح کے رول مجھے سوٹ کرتے ہیں۔ گم شدہ انڈسٹریلسٹ۔ ساری عمر اظہار عشق نہ کر سکنے والا نکاح خواں۔ عام ہیرو اور ولن میں بھی کوئی قباحت نہیں لیکن یہ ہم ڈسکس کریں گے۔ تفصیلاً

تو یار اب خدا کے لیے باقی سب کام چھوڑ دو اور یہ تحریر اپنی جسے تم افسانہ کہتے ہو جلد از جلد مکمل کر کے لے آؤ۔ اور وہ تحقیقی مضمون نگاری کیفضول خیال ذہن سے نکال دو۔ ہمیں حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے۔ اور ہاں وہ ڈیڑھ صفحہ جو تم نے نکالا تھا وہ بھی لے آنا۔ وقت کا کچھ پتہ نہیں ہوتا، ہو سکتا ہے اُس وقت تک پھر چھپنے کی خواہش تمہارے دل میں پیدا ہو جائے۔ لیکن نہیں کوئی فالتو خیال دل میں نہ لاؤ۔ صرف اور صرف یہ کام مکمل کرو۔ اور آؤ۔ میں شدت سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ مرغوب شناور کو میں نے ہلکا سا اشارہ کر دیا ہے۔ وہ تفصیل پوچھ رہا تھا اور بہت بے تاب ہو رہا تھا۔ کیونکہ دو ماہ بعد اُس نے پروڈکشن دینی ہے۔ لیکن میں نے ابھی اُسے سسپنس میں رکھا ہوا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے یہ لکڑ ہاڑے والے ڈرامے میں میرے لیے موزوں رول کونسا رہے گا۔ ٹھیک ہے پھر اجازت۔ ہر پل تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ بمعہ تحریر۔ اور سناؤ پھر شادی کب کروا رہے ہو۔

فقط تمہارا جگری دوست روشن خیالؔ

آخری خط از طرف راقم بنام روشن خیالؔ نائب مدیر مجلہ دروغ بگردنِ راوی۔

ہیلو روشن ہیلو خیالؔ

تم نے اپنے خط کے آخر میں دو سوالات پوچھے ہیں جو بنیادی نوعیت کے ہیں انہیں سوالات کے جوابات اور پھر اُن کی ہلکی پھلکی وضاحت پر یہ خط مشتمل ہو گا میں زیادہ وقت نہیں لوں گا بلکہ دوں گا کیونکہ میں بہت حد مصروف ہو گیا ہوں اور یہ خط تمہیں لکھے گئے میرے خطوط میں سے مختصر ترین ہو گا۔

تم نے پوچھا ہے کہ 'دانش مند لکڑ ہاڑا' نامی ڈرامے میں تمہارے لیے موزوں رول کونسا رہے گا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارے لیے سب سے موزوں رول درخت کے اُس

نبھنے کا رہے گا جسے لکڑ ہاڑا کاٹ کر ڈاکوؤں کے سروں پر پھینکتا ہے۔ لیکن گھبراؤ نہیں تمہارے یا ڈاکوؤں کے زخمی ہونے کا کوئی خطرہ نہیں اس لیے کہ ریکارڈنگ کی کبھی نوبت نہیں آئے اس لیے کہ یہ ڈرامہ کبھی نہیں لکھا جائے گا اس لیے کہ وہ تیرہ ون لائنیں کبھی نہیں لکھی جائیں گی اس لیے کہ وہ تحریر جسے میں افسانہ کہتا ہوں پہلے ہی لکھی جا چکی ہے۔ مکمل ہو چکی ہے۔ تمہیں حیرت ہو گی کہ کیسے؟ میں بتاتا ہوں مجھے بھی حیرت ہوئی تھی۔ جب میں نے تمہیں خط پوسٹ کرنے کے ایک دن بعد افسانہ مکمل کرنے کے لیے اُسے وہاں سے شروع کیا یعنی جہاں نازش نبردازی اور ڈرامہ پروڈیوسر یعقوب دلاور کی ملاقات ہوتی ہے تو مجھے احساس ہوا کہ آگے سب کچھ جو ہے اُسے تو آخری فقرے تک میں لکھ چکا ہوں ہاں البتہ افسانے کے ساتھ ہی منسلک کاغذ پر لکھنے کی بجائے تمہارے نام لکھے خط کے آخری حصے میں لکھ چکا ہوں اور یہ بھی ہے کہ نسبتاً مختلف پیرائے میں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لکھنا تو لکھنا ہے خواہ کہیں بھی لکھا جائے بس اتنا کرنا ہوگا کہ تمہارے نام میرے اُس خط کی فوٹو کاپی منگوا کر اُس میں سے متعلقہ حصہ قینچی سے کاٹ کر تحریر کے ساتھ آگے نتھی کر دیا جائے۔ ویسے اگر نہ بھی کیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے جن تحریروں کو چھپوانا مقصد نہیں ہوتا وہ کسی ایک جگہ اکٹھی لکھے جانے کی بجائے جگہ جگہ بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ صرف دماغ میں بھی۔ بہر حال ہم اس حد تک تو نہیں جاتے۔ تو میری جان اب تم نے میری طرف آنا تو ہے تو ساتھ میرا (یعنی تمہارا) وہ خط بھی لیتے آنا۔ کچھ اور چیزیں بھی تم نے لانی ہیں۔ تم یہ سوچ رہے ہو گے کہ یہ کیا میں الٹی سیدھی ہانک رہا ہوں۔ ابھی سب کچھ واضح ہو جاتا ہے۔ تو جب تمہارے نام خط میں چلا گیا (غلطی سے شاید؟) میرے افسانے کا بقیہ حصہ کاٹ کر اپنی اصل جگہ لگا دیا جائے گا تو یہ افسانہ نازش نبردازی نے افسانہ نگاری کے میدان میں سر نکالنا ہی شروع کیا تھا کہ جبر کے دور کا آغاز ہو گیا سے لے کر ــــــ "نازش نبردازی نے ڈرامہ نگاری کے میدان میں سر نکالنا ہی شروع کیا تھا کہ جبر کے دور کا خاتمہ ہو گیا" تک مکمل ہو جائے گا۔ اور مستقبل کے لیے محفوظ کر لیا جائے گا۔ اور اب روشن دین صاحب آؤ میرے مستقل کی طرف یعنی تمہارے دوسرے سوال کی طرف۔

تم نے پوچھا تھا کہ سناؤ پھر شادی کب کرا رہے ہو۔ تو اس کا جواب ہے اگلے ماہ کی بائیس تاریخ کو۔ ہاں جی۔ میری شادی خانہ آبادی اگلے ماہ اکتوبر کی بائیس تاریخ کو ہونا قرار پائی ہے۔ دیکھ لو میں نے آخر تمہارے دیرینہ مطالبے کو تسلیم کر ہی لیا ہے۔ اور اب تمہیں بھی میرا مشورہ ہے کہ تائیروں کو دیکھ دیکھ کر جذباتی ہوتے رہنے سے بہتر ہے کہ کہیں نہ کہیں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاؤ۔ لیکن میں تمہاری طرح تمہارے پیچھے لٹھ لے کر نہیں پڑوں گا۔ لیکن جب مناسب سمجھو کر گزرو۔ باقی جبر کے دور کا ابھی کچھ پتہ نہیں کب ختم ہوتا ہے۔ ہوتا بھی ہے یا نہیں (زیادہ امکان یہی ہے)۔ تم خود کہتے ہو انسان کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔

خیر یہ باتیں ہوتی رہیں گی اب سنو یار یہ شادی کے بڑے جھنجھٹ ہوتے ہیں سو کام ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کوئی دو تین دن پہلے ہی آ جاؤ۔ اب تم دوستوں یاروں نے ہی تو مل کر سب انتظامات سنبھالنے ہیں۔ کیوں کہ میں تو بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم انیس تاریخ تک پہنچ جاؤ یار۔ اور آتی دفعہ اصغری منڈی سے یہ سودے لیتے آنا۔ ادائیگی فوری طور پر کر دی جائے گی۔

1۔ چھوہارے۔ تین کلو۔ (2) مکھانے دو کلو۔ (3) کھوپا۔ ایک کلو۔ (4) رنگ زردہ۔ ایک چھٹانک۔ (5) مربہ امرتی ایک کلو۔ (6) ہار سہرا مالیتی دو ہزار (نوٹ میلے کچیلے نہ ہوں چیک کر لینا۔ ویسے اگر یہ تمہاری طرف سے بھی ہو تو مجھے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔ بصورت دیگر بھی ٹھیک ہے۔) اچھا یار اجازت دو ابھی باہر دستک ہوئی ہے اور مجھے بتایا گیا ہے کہ بینڈ باجوں والا ہے اور بیانہ لینے آیا ہے۔ مجھے شہنائی بجنے کی آواز آ رہی ہے۔ اچھا پھر انیس اکتوبر کو ملاقات ہوگی۔ اس وقت تک خدا حافظ۔

فقط تمہارا دوست
راقم
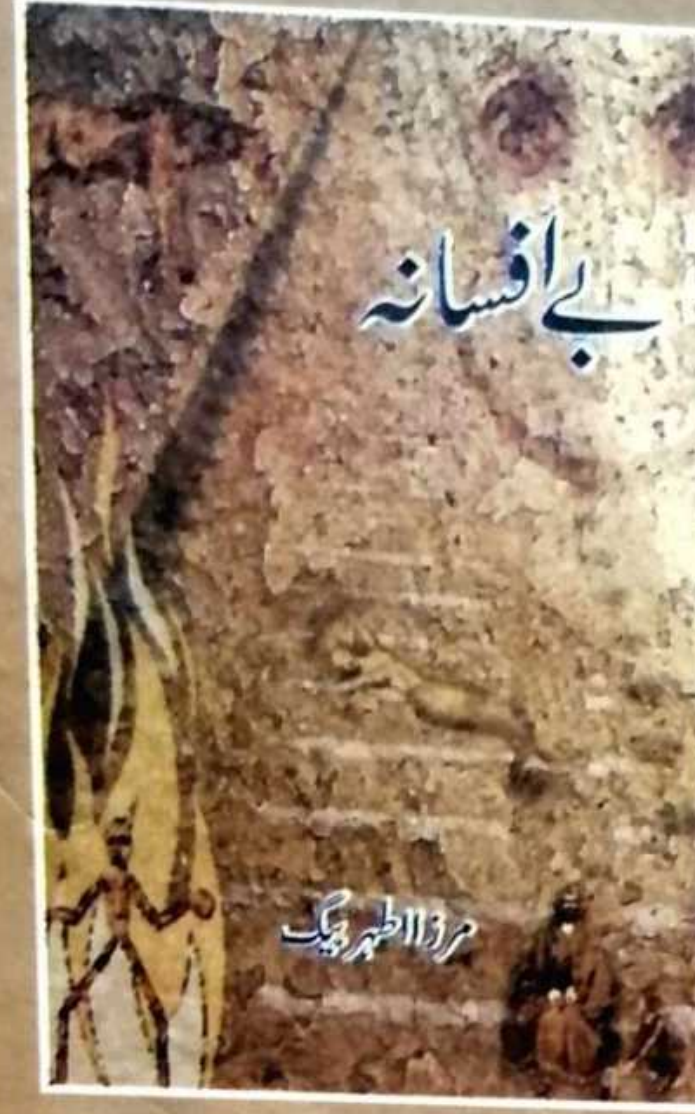
بے افسانہ
مرزا اطہر بیگ
سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS
دوجی منزل، مفتی بلڈنگ 17/31 ٹمپل روڈ، لہور
Ph: 042-7355323 Fax: 042-7323950
e-mail:sanjhpk@yahoo.com
9789698957445